قاضی عبدالودود

کی

علمی اور ادبی خدمات

از

ڈاکٹر محمد نور اسلام (علیگ)

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

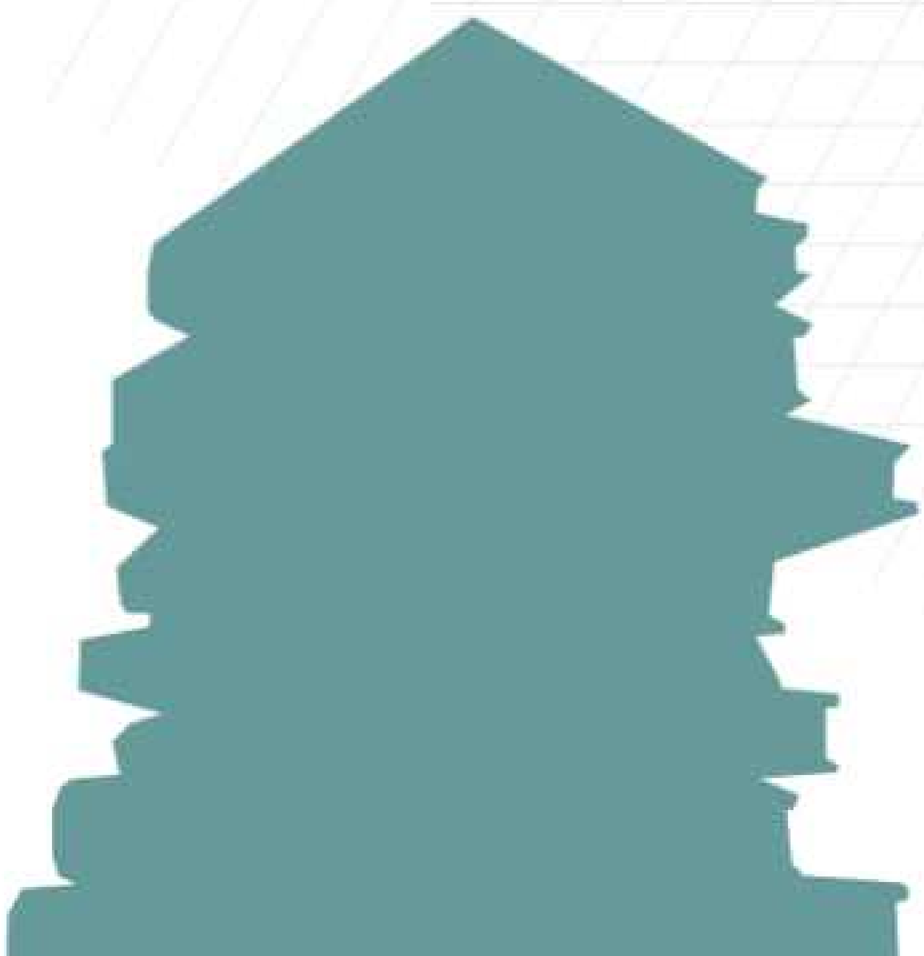

Marfat.com

قاضی عبد الودود کی علمی
اور
ادبی خدمات

از

ڈاکٹر محمد نور اسلام علیگ

محمد اقبال مجددی
ذخیرہ

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

Marfat.com

Marfat.com

فہرست مندرجات

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۔	اظہار تشکر	۷
۲۔	پیش لفظ	۹
۳۔	حصہ اول، حالاتِ زندگی	۱۷
۴۔	حصہ دوم، فکر و فن	
	اشاریہ تصانیف ومقالات قاضی عبدالودود	۱۱۷
۵۔	اردو میں تحقیق کی روایت	۱۱۹
۶۔	اصول تحقیق قاضی صاحب کی نظر میں	۱۳۷
۷۔	قاضی صاحب بحیثیت محقق	۱۴۱
۸۔	قاضی صاحب اور اردو شعرا کے تذکرے	۱۷۸
۹۔	قاضی صاحب اور مرزا غالبؔ	۱۹۳
۱۰۔	آوارہ گرد اشعار	۲۲۳
۱۱۔	کتابیات	۲۳۱

Marfat.com

© جملہ حقوق محفوظ !

130105

QAZI ABDUL WADOOD KI ILMI AUR ADABI KHIDMAT

By

Dr. Mohammad Noor Islam Alig

Year of Edition 2000

ISBN-81-87667-06-0

Price Rs.200/=

نام کتاب ———— قاضی عبدالودود کی علمی اور ادبی خدمات

مصنف ———— ڈاکٹر محمد نور اسلام علیگ

سن اشاعت ———— ۲۰۰۰ء

قیمت ———— ۲۰۰ روپے

مطبع ———— عفیف پرنٹرس، دہلی

Published by:

Educational Publishing House

3108, Gali Azizuddin Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan ,Delhi-6 (India)

Ph : 3216162, 3214465 Fax : 0113265278

Marfat.com

انتساب

اپنے والدِ محترم الحاج ولی محمد

اور

اپنی والدہ محترمہ حجن آمنہ خاتون

کے نام

Marfat.com

Marfat.com

اظہار تشکر

میری جہد مسلسل اور تمام تر کوششوں کے باوجود یہ کتاب منظر عام پر نہیں آپاتی ۔ اگر فخر الدین، میموریل کمیٹی لکھنؤ کا تعاون خاص حاصل نہیں ہوتا ۔ میں اپنے ان مخلص بھائیوں ، دوستوں، اور خیر خواہوں کا بھی شکر گذار ہوں ، جنہوں نے ذہنی اور فکری طور پر اس بڑے کام کو انجام دینے کے لئے مجھے بار بار جھنجھوڑا، سب سے پہلے میں جناب فیض احمد صاحب 5/D آدرش نگر درگ ، مدھیہ پردیش کا شکر گذار ہوں ، ان کے ساتھ ساتھ میں جناب بھائی عالمگیر جناب مسقط ، جناب یونس صاحب کانپور ، جناب یونس صاحب ، اور چت پور روڈ کلکتہ ، جناب ایم۔ ایس خاں صاحب ۔ سعودی عرب، جناب نسیم احمد صاحب جدہ، سعودی عرب ، جناب فضل نبی صاحب جدہ، سعودی عرب ، جناب کمال الدین ، اور جناب محمد اسلام آزاد ، حاجی مارکیٹ سمری ، دربھنگہ ، جناب عبد الغنی اور جناب محمد عیسیٰ ، نرہن اسٹیٹ ، ضلع سمستی پور،جناب عبدالجبار صاحب ، نبی کریم ،دہلی، جناب محمد افتخار اور جناب محمد ذاکر صاحب ، کٹیہار، جناب محمد فیروز خاں صاحب ،نبی کریم ، دہلی، جناب انصار الحق صاحب، نبی کریم ، دہلی، جناب محمد وہاب صاحب،نبی کریم ، دہلی ، جناب عبد الناصر صاحب، دہلی، جناب محمد اکرم صاحب، کوٹیلا اُستھان ، دربھنگہ، جناب ابوالکلام صاحب، جناب سلیم جاوید ارمان اور جناب اقبال صاحبان کا بھی دلی شکر گذار ہوں۔

متذکرہ تمام حضرات نے مجھے ہر اعتبار سے اس لائق بنایا کہ میں "قاضی عبد الودود کی علمی اور ادبی خدمات" نامی کتاب کو منظر عام پر لا سکا۔ مجھے قوی امید ہے کہ مستقبل میں بھی ان اہلِ خیر حضرات کا تعاون مجھے ملتا رہے گا اور میں اپنے ادبی ذہن و فکر کو مشغول رکھتے ہوئے اپنے ناتواں ہاتھوں سے کئی اور زیرِ طباعت کتابوں کو منظر عام پر لا سکوں گا۔

میں آخر میں جناب ڈاکٹر یونس حسین حکیم صاحب اور جناب پروفیسر شمیم صاحب سابق، صدر شعبہ اردو، بہار یونیورسٹی ، مظفر پور وسابق شیخ الجامعہ ، متھلا یونیورسٹی دربھنگہ کا خاص طور پر شکر گذار ہوں ۔ جو اپنے نیک مشوروں سے مجھے ہمیشہ نوازتے رہے ۔ میں جناب عالم گیر صاحب کا دوبارہ شکر گذار ہوں کہ بیرونِ ملک میں رہتے ہوئے بھی وہ مجھے بذریعہ ڈاک اپنے صالح مشورے ارسال کرتے رہے ۔ آخر میں میں جناب ڈاکٹر نسیم صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جنہوں نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں اس منزل پر پہونچا۔

اس وقت مجھے اپنے نیک والدین جناب الحاج ولی محمد صاحب مرحوم، اور والدہ محترمہ ، جن آمنہ خاتون مرحومہ کی حد درجہ کی محسوس ہورہی ہے۔ جنہوں نے اپنی ہمہ جہت نگہداشت سے مجھے اس قابل بنایا۔ آج انہی حضرات کی نیک دعاؤں کے صدقے اور برکت سے میرا وجود قائم ہے۔

ڈاکٹر محمد نوراسلام علیگ

Marfat.com

Marfat.com

پیش لفظ

قاضی عبدالودود نام ہے ایک عظیم محقق، دانشور، نابغۂ روزگار اور قاموسی شخصیت کے مالک انسان کا۔ کہا جاتا ہے کہ تحقیق نام ہے حق کی تلاش کا اور حق کے بارے میں عام خیال ہے کہ وہ تلخ ہوتا ہے قاضی صاحب کی تحریریں اس بات کا عملی ثبوت ہیں۔ آپ نے اپنی تحریروں سے تحقیق کے بہت سے بتوں کو توڑا ہے۔ اسی لئے آپ کو بت شکن، محقق کے لقب سے یاد کیا جانے لگا ہے۔ آپ نے تحقیق کی بہت سی روایات کو کالعدم قرار دیا اور چند نئی روایات کی تعمیر کی جو بنیاد کے لحاظ سے زیادہ وسیع اور زیادہ مستحکم ہے۔

ہندوستان میں اردو فارسی تحقیق کی روایت کچھ زیادہ قدیم نہیں ہے۔ یوں تو تحقیق اور تنقید کے غیر مربوط اور غیر منضبط عناصر ہمیں شعرا کے تذکروں میں مل جاتے ہیں۔ لیکن باضابطہ فن کی حیثیت سے اس کی عمر کچھ زیادہ دراز نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سرسیدؔ نے آثار الصنادید، تالیف کر کے اردو میں تحقیق کی بنیاد ڈالی تو بیجانہ ہوگا۔ اسی طرح تو زکِ جہاں گیری، تاریخ فیروز شاہی اور آئینِ اکبری کو ایڈٹ کر کے جدید اور سائنٹیفک اصول پر متن کو ترتیب دینے کا خوشگوار فریضہ انجام دیا۔ سرسیدؔ کے بعد مولانا محمد حسین آزاد، علامہ شبلی نعمانی، حافظ محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع (پرنسپل اورنیٹل کالج، لاہور) بابائے اردو مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود، جناب مالک رام، اور ڈاکٹر نذیر احمد جیسے نادر روزگار محققوں اور دانشوروں نے اردو اور فارسی میں تحقیقی کام کو آگے بڑھایا، اس کی روایت کو مستحکم بنایا اور اپنے مخصوص میدانوں میں لافانی نقوش چھوڑے۔ ان محققین میں قاضی عبدالودود کو کئی حیثیات سے درجۂ امتیاز حاصل ہے۔ آپ نے ان تمام حضرات سے زیادہ وسیع اور متنوع کام کیا۔ آپ نے اپنے پیشروں اور معاصر محققوں، ناقدوں اور سوانح نگاروں کی تحقیقات کو باطل قرار دیا۔ حافظ محمود شیرانی نے علامہ شبلی نعمانی کی شعر العجم، مولانا محمد حسین آزاد کی آبِ حیات اور ان کے مرتب کردہ دیوان ذوق، پر تحقیقی اور تنقیدی تبصرے لکھ کر اردو میں تبصرہ نگاری میں نئے باب کا آغاز کیا۔ آپ کے بعد اس طرز کے تبصرے قاضی صاحب نے تحریر کئے۔ آپ نے محمد حسین آزاد

Marfat.com

بحیثیت محقق کے عنوان سے 'آبِ حیات' پر زیادہ تفصیل سے گفتگو کی اور آزاد کے تسامحات کی نشاندہی کی۔ اس میں ہمیں حافظ محمود شیرانی کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔ اس کے علاوہ تذکرۂ عمدۂ منتخبہ مرتبہ خواجہ احمد فاروقی، میر۔ حیات اور شاعری مؤلفہ خواجہ احمد فاروقی، شاد کی کہانی شاد کی زبانی مؤلفہ محمد مسلم عظیم آبادی، دیوان فائز مرتبہ سیّد مسعود حسین رضوی اور مرقع شعرا، مرتبہ رام بابو سکسینہ پر بھی طویل تبصرے لکھے۔ ان کے ذریعہ قاضی صاحب نے اردو میں تبصرہ نگاری کو ایک نیا اسلوب دیا۔ ان کے وسیلہ سے آپ نے آنے والی نسلوں کو تحقیق و تنقید کے آداب سکھائے۔ اصول کا عرفان عطا کیا اور محتاط رویہ کی اہمیت وافادیت سے روشناس کرایا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس میدان میں ان کے نقش قدم پر چلنے والا کوئی پیدا نہ ہوا۔

قاضی صاحب نے اس بات کا عملی ثبوت پیش کیا ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہ انتہائی احتیاط سے کہا جائے، وہ پوری طرح درست ہو اور دلائل سے مکمل طور پر لیس ہو۔ یہ راہ مشکل ضرور ہے لیکن تحقیق میں اس سے مفر بھی نہیں۔ قاضی صاحب نے اپنے تحقیقی سفر کا آغاز مصحفی کے مطالعہ سے کیا۔ اور ان کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کی غرض سے آپ نے انشا کے حالات کا بھی تفصیل سے مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ اس عہد کی ادبی، سیاسی اور سماجی تاریخ کو بھی اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا۔ اور برسوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس وسیع مطالعہ کے نتیجہ میں آپ نے مصحفی کے متعلق بہت سی غلط بیانیوں کو درست کیا۔

قاضی صاحب نے اپنے ہم وطن اور اردو کے عظیم شاعر شاد عظیم آبادی پر بھی بہت کام کیا ہے۔ وہ انھیں عظیم شاعر تو مانتے ہیں، لیکن بحیثیت انسان انھیں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ان کا کہنا ہے کہ شاد نے محض اپنی شخصیت کو اُبھارنے اور معاصرین پر اپنی برتری قائم کرنے کی خاطر راست گفتاری کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا اور شاعرانہ تعلّی سے کام لیا۔ قاضی صاحب راست گفتار انسان تھے۔ تعلّی خود نمائی اور دروغ گوئی سے نفرت کرتے تھے۔ اسی لئے وہ ہر ایسے شخص کو ناپسند کرتے تھے، جو ان خصائص کا حامل ہو۔ یہی سبب ہے کہ وہ معاصرین میں سے بہت سی عظیم شخصیتوں، کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ وہ ہر شخص کو بعینہٖ ایسا ہی دیکھنا چاہتے تھے جیسا کہ فی الحقیقت وہ ہے، نہ کہ جیسا کہ وہ خود کو ظاہر کرتا ہے، یا

Marfat.com

دوسرے لوگ محض اپنی مطلب براری کی خاطر اُسے پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ کام اتنی شد و مد سے کرتے ہیں گویا یہ اہم کام انھیں تفویض کیا گیا ہو۔ وہ خود کو بھی اپنی اصل تصویر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اکثر وہ اپنی گفتگو میں فرمایا کرتے تھے کہ یا خدا مجھے اپنے آپ کو ویسا ہی دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت اور سکت دے جیسا کہ میں حقیقت میں ہوں۔ لیکن ایسا کرنے میں وہ کبھی پوری طرح کامیاب نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ وہ اپنی رائے کے مقابلے میں کسی دوسرے کی رائے کو اہمیت نہیں دیتے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے درست ہی کہا ہے کہ وہ تنہا سوچتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ سوچتے ہیں وہی درست ہے اور جو اس کے برخلاف سوچتا ہے وہ بالیقین غلطی پر ہے اور راہِ راست سے ہٹا ہوا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ تمام دنیا سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ لوگوں سے ملنا جلنا انھیں زیادہ پسند نہ تھا، تقریبات میں شرکت کرنے سے وہ حتی المقدور احتراز کرتے تھے، بزم آرائی کا انھیں شوق نہیں تھا اور مشاعروں میں جانا تضیعِ اوقات سمجھتے تھے۔ اس طرح انھوں نے اپنی دنیا کو بہت محدود کر لیا تھا۔ اس کا اثر ان کے اندازِ فکر پر بھی پڑا۔

قاضی صاحب نے محمد حسین آزادؔ، شادؔ عظیم آبادی اور مولوی عبدالحق کے بارے میں بہت زیادہ لکھا ہے۔ اگر ان تمام تحریروں کو یکجا کر دیا جائے تو ان میں سے ہر ایک شخصیت پر جداگانہ کتابیں بن جائیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ قاضی صاحب نے مرزا غالبؔ پر لکھا ہے۔ غالبؔ ان کے محبوب شاعر ہیں۔ زندگی بھر انھوں نے غالبؔ پر کام کیا۔ ان کے کلام کو اتنی بار پڑھا کہ اس کے حافظ بن گئے۔ اور اردو فارسی کی تحریروں کا غائر مطالعہ کیا اور بجائے خوبیاں تلاش کرنے کے، ان کی خامیوں پر نظر کی پھر زندگی بھر ان کے بارے میں لکھتے رہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایک سلسلۂ مضامین 'جہانِ غالبؔ' کے عنوان سے شروع کیا تھا جو مختلف اوقات میں متفرق رسائل میں شائع ہوا۔ اس کی نوعیت غالبؔ انسائیکلوپیڈیا (GHALIB ENCYCLOPEDIA) کی ہے۔ اس میں غالبؔ کی تحریروں میں جن اسماء اور اعلام کا حوالہ ملتا ہے، ان پر تفصیلی حواشی ہیں۔ افسوس کہ قاضی صاحب کے دوسرے کاموں کی طرح یہ بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ اگر یہ مکمل ہو جاتا تو کئی ضخیم جلدوں کو محیط ہوتا اور بے مثال یادگاری کام ہو جاتا۔

Marfat.com

غالبیات کے سلسلہ میں قاضی صاحب کا ایک اور اہم مضمون 'غالب کا ایک فرضی استاد' کے عنوان سے ہے۔ جو ابتداءً علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر (۱۹۴۸۔۴۹) میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں حک واصلاح اور ترمیم واضافے کے ساتھ یہ جناب مختار الدین احمد کی مرتب کردہ کتاب 'احوالِ غالب' میں 'ہرمزد ثم عبدالصمد' کے عنوان سے شاملِ اشاعت ہوا۔ اس میں قاضی صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ جس عبدالصمد کو غالب نے اپنا فارسی کا استاد بتایا ہے اس کا کوئی خارجی وجود نہیں۔ لہٰذا اس کی حیثیت ایک فرضی شخص کے سوا کچھ اور نہیں۔ مرزا غالب نے بتایا تھا کہ یہ ایک ایرانی الاصل شخص تھا۔ زردشتی مذہب کا پیرو تھا اور 'ہرمزد' نام تھا۔ ایران سے یہ ہندوستان آیا۔ آگرہ پہنچا اور کچھ عرصہ تک مرزا غالب کے ساتھ قیام پذیر رہا۔ جب غالب دہلی منتقل ہوگئے تو وہ بھی دہلی آگیا۔ اس دوران اس نے اسلام قبول کیا اور 'عبدالصمد' نام اختیار کیا۔ غالب نے اس سے فارسی سیکھی اور ایرانی مذہب نیز ایرانی ادبیات کے سلسلہ میں وسیع معلومات حاصل کیں۔

قاضی صاحب اس پوری داستان کو افسانہ طرازی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ اس سلسلہ میں آپ نے جو ٹھوس دلائل پیش کیے ہیں وہ ناقابلِ تردید ہیں۔

غالب کے ہی سلسلہ میں قاضی صاحب کا سب سے زیادہ اہم اور طویل مضمون 'غالب بحیثیت محقق' ہے۔ اس کو مضمون کہنا اس کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اس کو تو ایک مکمل کتاب کا درجہ دیا جانا چاہیے۔ ضخامت کے لحاظ سے کسی طرح بھی یہ کتاب سے کم نہیں۔ پہلے یہ علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں قاضی صاحب نے اس پر نظر ثانی کی اور بے پناہ اضافے کیے۔ اور پورے مضمون کی شکل بدل دی۔ پھر یہ 'نقدِ غالب' مرتبہ مختار الدین احمد میں شامل ہوا۔ اس ترمیم شدہ مضمون کی ضخامت ۲۲۸ صفحات ہوگئی ہے۔ اس میں قاضی صاحب نے مرزا غالب کی فرہنگ نویسی کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ برہانِ قاطع اور قاطعِ برہان کے قضیہ کی ایک اہم کڑی کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس میں قاضی صاحب نے فارسی زبان و ادب اور فن فرہنگ نویسی سے متعلق اپنی وسیع معلومات اور ہمہ گیر مطالعہ کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس سے ان کی قاموسی شخصیت کا پتہ چلتا ہے۔ مرزا غالب نے محمد حسین

Marfat.com

تبریزی المتخلص بہ برہان کے فرہنگ 'برہان قاطع' پر شدید اعتراضات کیے تھے اور ان کے بتائے ہوئے بہت سے الفاظ کے معنی و مفاہیم اور محل استعمال کو غلط بتایا تھا۔ اس پر معرکہ آرائی شروع ہوگئی تھی اور غالب کی مخالفت اور موافقت میں متعدد رسالے لکھے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ اس قضیہ نے بدنما شکل اختیار کرلی تھی۔ قاضی صاحب نے مرزا کے اعتراضات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ آپ نے غالب نمبر کے بیشتر اعتراضات کو غلط ثابت کیا ہے اور اپنے دلائل کی تائید میں اہلِ زبان کی اسناد پیش کیں ہیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ غالب کی زردشتی و دساتیری ادب و پہلوی نیز فرسِ قدیم سے واقفیت کماحقہٗ نہیں تھی، بلکہ سرسری تھی اس لئے برہان قاطع پر اعتراضات کرنے اور اپنے موقف کی وضاحت کرنے میں اپنی ناقص معلومات کا ثبوت پیش کیا ہے۔ مضمون کے آخر میں قاضی صاحب نے فارسی فرہنگ نویسی کی مختصر تاریخ بھی بیان کی ہے۔ اس طرح انھوں نے فارسی لغات سے غالب کی ناواقفیت کو اس طرز سے ثابت کیا ہے کہ اس میدان میں ان کی مہارت اور وسعتِ معلومات کا سکہ جم جاتا ہے۔

قاضی صاحب کو اردو شعرا کے تذکروں سے بھی خصوصی تعلق خاطر رہا ہے۔ دراصل آپ نے جس نوعیت کی تحقیق اور اپنے مطالعے کا جو میدان منتخب کیا تھا اس میں ان تذکروں کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ آپ نے تمام تذکروں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور ان کی خوبیوں اور خامیوں کو گہری نظر سے دیکھا۔ آپ نے اپنے تحقیقی کاموں میں نہ صرف ان سے بھرپور استفادہ کیا، بلکہ ان پر تعارفی مضامین بھی لکھے اور ان کے بارے میں مفید معلومات فراہم کیں۔ آپ نے جن تذکروں پر مضامین لکھے اُن میں خلاصۃ الافکار، گلستاں سخن، سفینۂ ہندی، مسرت افزا، تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی اور گلشن بیخار خاص طور پر لائقِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ امین اللہ طوفان کے تذکرۂ شعرا کو آپ نے ایڈٹ کر کے شائع کیا۔

تذکروں سے اس غیر معمولی شغف کے طفیل آپ کی ایسے اشعار کی جانب بھی توجہ ہوئی جن کا انتساب غلط شعرا سے کیا جاتا رہا ہے۔ فارسی اور اردو کے ایسے بے شمار شعر ہیں جو مشہور تو ہوگئے ہیں لیکن یا تو ان کے شاعر کا نام یکسر معلوم ہی نہیں یا غلط شعرا سے منسوب ہوگئے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں یہ حقیقت سے دور جا پڑے ہیں۔ خود تذکرہ نگاروں نے بھی اکثر اشعار

Marfat.com

کو منسوب کرنے میں غلطی کی ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ تذکرے تالیف کیے گئے اس زمانے میں مطبوعہ مواد آسانی سے دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے عام طور پر حافظہ سے کام لیا جاتا تھا اس میں بھول چوک کے امکانات نہایت قوی رہتے تھے۔ لہذا تذکروں کے یہ مؤلفین کبھی کبھی ایک شاعر کے شعر کو دوسرے شاعر کے نامۂ اعمال میں ڈال دیتے تھے۔ قاضی صاحب نے ایسے اشعار کی تخریج کا اہم کام اپنے ذمہ لیا۔ اس مرحلہ پر شعرا کے تذکروں کے عمیق مطالعے اور اعلیٰ ذوق شعری نے آپ کی رہنمائی کی۔ اس کی مدد سے آپ نے ایسے بے شمار اشعار کے اصل شاعروں کا پتہ لگایا جو یا تو غلط شعرا سے منسوب ہو گئے تھے یا جس کے خالق کا لوگوں کو علم ہی نہیں۔ اسی کے ساتھ آپ نے بہت سے مشہور و معروف اشعار کے متن کی صحت بھی کی۔ ایسے تمام مباحث کو آپ نے 'آوارہ گرد اشعار' کے عنوان سے کئی قسطوں میں رسالہ 'معاصر' پٹنہ میں شائع کرایا۔

اس طرح قاضی صاحب نے بڑے متنوع کام انجام دیئے اور جس میدان میں بھی قدم رکھا اپنی انفرادیت اور تبحرِ علمی کا سکہ جمادیا۔ آپ نے اپنی کاوشوں سے ادبی تحقیق کو وزن و وقار عطا کیا اور اسے ایک مستقل فن کا درجہ بخشا۔ اس کے لئے ایک مخصوص زبان کا تعین کیا جو ہر قسم کے حشو و زوائد سے منزہ اور تعارفی و توصیفی کلمات سے معریٰ ہے۔ آپ نے ادبی تحقیق کو ایک اسلوب دیا جسے ہم 'ریاضیاتی اسلوب' کا نام دے سکتے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ لوگوں نے اس کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا، اس لئے اسے قبولِ عام بھی نصیب نہیں ہوا۔ وہی اس مخصوص منفرد انداز کے موجد ہیں اور وہی خاتم بھی، آپ نے راست گفتاری اور حق گوئی پر زور دیا، تعلّی، خود نمائی اور خود ستائی سے احتراز اور مبالغہ آرائی سے پرہیز کا درس دیا۔ قاضی صاحب کا ایک بہت بڑا وصف یہ ہے کہ وہ دوسروں کو جس بات کی تلقین کرتے ہیں اس پر پہلے خود عمل پیرا ہوتے ہیں۔ وہ زبانی نصیحت کے مقابلے میں عملی تلقین کے زیادہ قائل ہیں۔ قاضی صاحب کی انھی صفات نے انھیں موجودہ عہد کی انتہائی اہم، محترم اور بزرگ شخصیت بنادیا ہے۔

قاضی صاحب کے علمی و ادبی کارنامے اس امر کے متقاضی تھے کہ ان پر بھرپور کام کیا جائے اور ان کی شخصیت و فن پر ضخیم کتاب لکھی جائے۔ حسنِ اتفاق کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

Marfat.com

کے شعبۂ اردو نے آپ کو ریسرچ کا موضوع بنانے کا فیصلہ کیا۔ اور یہ میری خوش نصیبی تھی کہ یہ اہم کام اور دلچسپ موضوع مجھے تفویض کیا گیا۔ میں نے زیرِ نظر مقالے میں قاضی صاحب کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں کا تفصیلی جائزہ لینے کی کوشش ہے۔ مقالہ کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں قاضی صاحب کے حالاتِ زندگی بیان کئے ہیں اور دوسرے حصہ میں مختلف ابواب قائم کر کے ان کے علمی، ادبی اور تحقیقی کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ ہر چند کہ یہ کام تنقیدی نوعیت کا تھا، تاہم تصنیفی کاموں میں حالات، ماحول اور بعض واقعات کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ پس منظر کا کام بھی کرتے ہیں۔ لہذا علمی کاوشوں کا صحیح اور غیر جانبدارانہ جائزہ لینے کے لئے انھیں مصنف کے حالات اور اہم واقعات سے مربوط کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ قاضی صاحب نے جو طرزِ تحقیق اور اسلوبِ تحریر اختیار کیا اس میں ان کے مزاج اور افتادِ طبع کو بڑا دخل تھا۔ ان ہی امور کے پیشِ نظر اس مقالے میں قاضی صاحب کے سوانح پیش کئے گئے ہیں جن کی حیثیت پس منظر کی ہے۔ ان میں اُن واقعات کو خصوصی اہمیت کے ساتھ نسبتاً زیادہ تفصیل سے پیش کیا گیا ہے جنھوں نے قاضی صاحب کی شخصیت کی تعمیر میں اہم رول ادا کیا اور جن سے ان کی ادبی زندگی متاثر ہوئی۔

مقالے کے دوسرے حصہ میں قاضی صاحب کے علمی کارناموں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور الگ الگ ابواب قائم کر کے آپ کے تحقیقی کاموں، اردو شعرا کے تذکروں پر آپ کی تعارفی اور تنقیدی تحریروں، مرزا غالب سے متعلق آپ کے تنقیدی مضامین کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کے پہلے پس منظر کے طور پر اردو میں تحقیق کی روایت پر تاریخی نظر ڈالی گئی ہے اور تحقیق کے لئے قاضی صاحب نے جو اصول وضع کئے تھے ان کی تشریح پیش کی گئی ہے۔ آخری باب میں ایسے اشعار سے بحث کی گئی ہے جن کا ایک طویل عرصہ تک انتساب غلط شاعروں سے چلا آرہا تھا۔ قاضی صاحب نے ایسے اشعار پر مدتوں کام کیا اور تحقیق کر کے ان کے اصل خالق کا پتہ لگایا اور آوارہ گرد اشعار کے عنوان سے بالاقساط شائع کرایا۔

یہ میری خوش نصیبی تھی کہ پروفیسر نورالحسن نقوی کی زیرِ نگرانی مجھے کام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے کام کی نگرانی ہی نہیں فرمائی بلکہ میری سرپرستی

Marfat.com

بھی فرمائی۔ ہر ہر قدم پر میری رہنمائی ہی نہیں فرمائی، بلکہ دست گیری بھی کی۔ قاضی صاحب جیسی قاموسی شخصیت کے بارے میں کچھ لکھنا میری صلاحیت اور لیاقت سے بالاتربات تھی۔ یہ صرف پروفیسر صاحب کا ہی فیضان ہے کہ میں اس مشکل کام کو سرانجام دے سکا۔ میرے پاس تو وہ الفاظ بھی نہیں ہیں جن سے میں پروفیسر صاحب کی مہربانیوں، نوازشوں، عنایتوں اور شفقتوں کا کماحقہٗ شکریہ ادا کرسکوں۔ البتہ اظہارِ حقیقت کے طور پر اتنا عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ڈاکٹر صاحب کی معاونت اور رہنمائی حاصل نہ ہوتی تو میں یقیناً اس مقالہ کو مکمل نہیں کرسکتا تھا۔ میں بارگاہِ رب العزت میں پروفیسر صاحب کے لئے خوش حالی، خوش طالعی اور سلامتی صحت کے ساتھ درازی عمر کی دعا کرتا ہوں۔

میں نے اپنے کام کے سلسلہ میں مختلف کتب خانوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان میں مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور خدابخش لائبریری پٹنہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میں ان دونوں عظیم کتب خانوں کے ارباب کا ان کے تعاون کے لئے تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔

مجھے اپنے کام کے دوران متعدد ساتھیوں، مخلصوں اور دوستوں کا بھر پور تعاون ملا، اور بزرگوں نے ہمت افزائی فرمائی۔ ان تمام حضرات کا شکریہ ادا نہ کرنا احسان ناشناسی ہوگی۔

میں اپنے تمام اساتذۂ کرام کا بھی احسان مند ہوں جنھوں نے علم جیسی لازوال دولت سے مجھے مالامال کرنے کی حتی المقدور کوشش کی۔

Marfat.com

حصّۂ اوّل

حالاتِ زندگی

Marfat.com

Marfat.com

خاندان قاضی عبدالودود ایک معزز اور سخت قسم کے مذہبی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔آپ کا داد ھیالی سلسلہ حضرت مخدوم شرف الدین احمد کے واسطے سے مشہور صوفی بزرگ امام تاج فقیہہ سے ملتا ہے۔ مولانا محمد جو امام تاج فقیہہ کے لقب سے مشہور تھے، ۱۱۸۰ء میں فلسطین سے ہندوستان آئے اور منیر (بہار) میں قیام فرمایا۔آپ کے تین فرزند تھے۔ان میں سب سے بڑے حضرت اسرائیل تھے، دوسرے مخدوم عبدالعزیز اور تیسرے جناب اسمٰعیل۔ کچھ عرصہ قیام فرما کر امام تاج فقیہہ تو وطن واپس چلے گئے لیکن اپنے تینوں فرزندانِ گرامی کو اشاعتِ دین کی خاطر بہار ہی میں چھوڑ گئے۔ان میں جناب اسرائیل اور مخدوم عبدالعزیز نے مغربی بہار میں شمعِ ہدایت روشن کی اور جناب اسمٰعیل نے شمالی بہار کو رشد و ہدایت کا مرکز بنایا۔آپ کو بجا بساڑھ کے صوفیاء کے مورثِ اعلیٰ کی حیثیت حاصل ہے۔بڑے صاحبزادے جناب اسرائیل کے فرزند مخدوم یحیٰ منیری تھے۔آپ صوفیوں کے سلسلہ کے سہروردیہ و فردوسیہ کی ایک اہم کڑی ہیں۔ حضرت پیر شہاب الدین جگجوت (موضع جٹھلی ضلع پٹنہ) کی بڑی صاحبزادی آپ سے منسوب ہوئیں۔اور بقول پروفیسر اختر اورینوی "اس مجمع البحرین سے وہ گرانقدر موتی پیدا ہوا جو عالمِ روحانیت میں آفتاب وار چمکا یعنی حضرت شیخ شرف الدین احمد منیری ثم بہاری[1]"آپ کی ولادت ۲۹ر شعبان المعظم ۶۶۱ھ (۱۳۸۰) کو منیر (ضلع پٹنہ) میں ہوئی۔ 'شرف آگیں' سے سالِ ولادت برآمد ہوتا ہے۔آپ نے علوم متداولہ کی تکمیل شرف الدین ابو توامہ (سنار گاؤں) سے کی۔اس کے بعد آپ دہلی تشریف لے گئے اور خواجہ نجیب الدین فردوسی سے سلسلۂ سہروردیہ فردوسیہ میں شرف بیعت حاصل کیا۔ خواجہ نجیب سلسلۂ فردوسیہ کے مشائخ میں تھے۔آپ نے تمام زندگی مخلوق کی رُشد و ہدایت میں گزاری۔آپ کے خلفاء میں حضرت منیریؒ کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔آپ برِصغیر ہندوپاک کے مشاہیر مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔آپ کی بدولت بہار میں صوفیہ کے سلسلۂ فردوسیہ کو فروغ حاصل ہوا۔

ہندوستان میں فردوسیہ سلسلہ شیخ بدر الدین سمرقندی کے وسیلہ سے آیا۔آپ سمرقند سے ہندوستان تشریف لائے اور دہلی میں رُشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔اور یہیں واصل حق ہوئے۔آپ کے خلیفہ شیخ رکن الدین تھے ان کے خلیفہ شیخ نجیب الدین فردوسی ہوئے اور ان

(۱) بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء (پٹنہ۔ ۱۹۵۷ء) ص ۱۰۵

Marfat.com

کے خلیفہ شیخ شرف الدین یحیٰ منیری تھے۔آپ کو اسلامی ہند کی تصوف کی تاریخ میں خصوصی اہمیت اور عظمت حاصل ہے۔آپ نے متصوفانہ اور عارفانہ خیالات اور تعلیمات کو اپنے مکاتیب کے ذریعہ نہایت عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے۔آپ کی مساعی سے فردوسیہ سلسلہ کو بہت فروغ حاصل ہوا۔اس سلسلہ کے کچھ مشائخ بنگال اور دیگر مقامات پر بھی گئے، لیکن اصل مرکز بہار ہی رہا۔ہندوستان میں اس سلسلہ کے مشائخ کا شجرہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

شیخ نجم الدین کبری

م ۶۱۸ھ (۱۲۲۱ء)

شیخ سعد الدین حمویہ | شیخ مجد الدین بغدادی | شیخ سیف الدین سعید باخرزی (بخارا)

شیخ سیف الدین سعید باخرزی (بخارا)
شیخ بدر الدین فردوسی سمرقندی
شیخ رکن الدین فردوسی
شیخ نجیب الدین محمد
شیخ شرف الدین یحیٰ منیری
(م ۷۸۲ھ / ۱۳۸۰ء)

"معدن المعانی" شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔اس کے جامع شیخ زین بدر عربی ہیں۔اس کی جلد اول کے باب بست و دوم میں شیخ منیری کے شیوخ کا سلسلہ تفصیل سے دیا گیا ہے۔اس میں ۱۹ واسطوں سے اس کو خلیفۂ چہارم اور سرچشمۂ علومِ معرفت حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک منتہی کیا ہے۔یہ سلسلۂ شیوخ اس طرح ہے:

شیخ شرف الدین احمد بن یحیٰ منیری، خواجہ نجیب الدین فردوسی، خواجہ رکن الدین فردوسی، خواجہ بدر الدین سمرقندی، خواجہ سیف الدین باخرزی، خواجہ نجم الدین کبریٰ، خواجہ ضیاء الدین ابو نجیب، خواجہ وجیہ الدین ابو حفص، خواجہ محمد بن عبداللہ معروف بہ عمویہ، خواجہ

Marfat.com

احمد سیاہ دینوری، خواجہ شمشاد علو دینوری، خواجہ ابوالقاسم جنید بغدادی، خواجہ سری سقطی، خواجہ معروف کرخی، سیدناامام علی رضا، سیدنا موسیٰ کاظم، سیدناامام جعفر صادق، سیدناامام محمد باقر، سیدناامام زین العابدین، سیدناامام حسینؓ، سیدنا حضرت علیؓ۔

جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا قاضی عبدالودود کے اجداد سخت قسم کے مذہبی بزرگ تھے۔ یہ دراصل حضرت تاج فقیہہ کا جو فاتح منیر کے لقب سے بھی مشہور تھے اور آپ کے اخلاف میں مخدوم شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری کا ہی فیضان تھا کہ اس خاندان میں کئی نسلوں تک مذہبی روایات جاری وساری رہیں۔ قاضی صاحب کے دادا قاضی عبدالحمید بڑے متشدد قسم کے بزرگ تھے۔ وہ بریلوی خیالات کے حامل تھے اور اپنے مسلک پر سختی سے کاربند تھے۔ اسی کے ساتھ یہ ایک دلچسپ حقیقت بھی ہے کہ آپ کے صاحبزادے یعنی قاضی صاحب کے والد قاضی عبدالوحید اپنے والد سے بھی زیادہ کٹر اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ وہ بھی مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے پیرو تھے اور فرقۂ اہل سنت والجماعت کے علاوہ کسی بھی فرقہ کو لائق نجات نہیں مانتے تھے۔ وہ انگریزی تعلیم کے شدید مخالف تھے اور سرسید کی تعلیمی تحریک کو اسلام دشمن تحریک بتاتے تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی تھی۔ یہیں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انگریزی تعلیم کے لئے اسکول میں داخل کرادیئے گئے۔ یہاں سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے آپ کو انگلستان بھیجنے کی تجویز ہوئی۔ لیکن آپ نے انگلستان جانے سے انکار کر دیا۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ آپ مطلقاً انگریزی تعلیم کے خلاف ہوگئے۔ اور سلسلۂ تعلیم منقطع کر دیا۔ انھوں نے انجمن محمدیہ کے نام سے ایک انجمن قائم کی جس کا مقصد بریلوی خیالات کی تبلیغ واشاعت تھا۔ اسی کے زیر اہتمام آپ نے ایک ماہنامہ 'تحفۂ حنفیہ' بھی جاری کیا جو کافی عرصہ تک نکلتا رہا۔ آپ نے ایک عربی مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ یہ مدرسہ حنفیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے فارغ التحصیل سخت قسم کے بریلوی خیالات کے حامل ہوتے تھے۔ قاضی صاحب نے اس کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

قاضی عبدالوحید متولد ۱۲۸۹ھ عربی کی تکمیل اور انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوئے۔ ایف۔ اے کرنے کے بعد میرے دادا انھیں قاضی رضا حسین کے

Marfat.com

مشورے پر انگلستان تعلیم کے لئے بھیجنا چاہتے تھے لیکن وہ کسی طرح اس پر راضی نہیں ہوئے۔ یہی نہیں۔ انھوں نے یہاں رہ کر بھی مزید انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ کہ ان کے خیالات میں انقلاب آگیا تھا اور وہ مغربی تعلیم کو مذہب کے لئے سم قاتل سمجھنے لگے تھے۔ نیچریوں (پیروان سر سید احمد خاں) کے متعلق جو ان کی رائے ہوگی، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ ندوۃ العلماء تک کے سخت مخالف تھے۔ ان کے نزدیک ۷۲ یا اس سے بھی زیادہ فرقے جو مسلمان ہونے کے مدعی ہیں، ان میں سے صرف ایک ناجی ہے اور یہ وہ فرقہ ہے جو بریلی کے مشہور عالم احمد رضا خاں کا ہم عقیدہ ہے۔...... انھوں نے احمد رضا خانی عقائد کی تبلیغ کے لئے ایک ماہنامہ "تحفۂ حنفیہ" نکالا جو ان کی وفات کے بعد بھی برس، دو برس جاری رہا۔ انھوں نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جس پر ان کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ صرف ہوا کرتا تھا" (۱)

قاضی عبدالوحید کی اہلیہ یعنی قاضی عبدالودود کی والدہ مولانا احمد رضا خاں صاحب سے باقاعدہ بیعت تھیں۔ یہ بہت متقی اور پرہیزگار خاتون تھیں۔ ان کا اپنے خاندان پر بہت اثر تھا۔ اس کے نتیجہ میں پورے ماحول اور گردوپیش سے مولانا احمد رضا خاں کے خیالات کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ قاضی صاحب کے اجداد میں ایک بزرگ قاضی غلام یحییٰ تھے۔ یہ بھی حکومت کی جانب سے عہدۂ قضا پر فائز تھے۔ یہ زبردست عالم اور فقیہہ تھے۔ صاحب تصانیف کثیرہ بھی تھے۔ آپ کو فلسفہ اور تصوف سے خصوصی لگاؤ تھا اور ان موضوعات پر آپ کے متعدد رسالے ملتے ہیں۔ آپ نے شرحِ آداب المریدین پر حاشیہ تحریر فرمایا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ ایک زمانہ میں اس کی مقبولیت اصل تصنیف سے زیادہ تھی۔ ان کا کوئی تعلق رضا خانی خیالات سے نہیں تھا۔ اس کے برخلاف آپ کے بزرگوں کا گہرا تعلق تحریکِ حضرت سید احمد شہید سے تھا۔ قاضی اکرام الحق، جو قاضی عبدالودود کے پرداداتھے وہ سید صاحب کے زبردست معتقدین میں تھے۔ اور ان کے ہی ایماء پر اپنے بیٹے یعنی قاضی عبدالودود کے دادا کا نام محمد اسمٰعیل رکھا تھا۔ آپ اردو اور فارسی کے زبردست عالم تھے۔ دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور نثر بھی اعلیٰ پایہ کی لکھتے تھے۔ قدیمی تخلص تھا۔ ان کا بیشتر کلام ضائع ہو گیا۔ آپ کا تاریخی نام

۱۔ میں کون ہوں، کیا ہوں (معاصر۔ قاضی عبدالودود نمبر۔ ۱۹۷۶ء) ص ۱۔۲

130105

Marfat.com

منظور النبی تھا جس سے ۱۲۸۹ برآمد ہوتے ہیں۔ پروفیسر مختار الدین احمد ان کے بارے میں حسبِ ذیل معلومات فراہم کی ہیں :

قاضی اکرام الحق (قاضی عبدالودود کے پردادا) سید احمد بریلوی شہید کے مرید یا کم از کم معتقد تھے۔ ان کے گھر میں جب ایک بیٹا پیدا ہوا تو خاندانی روایت کے بموجب سیدؒ صاحب کے ایماء پر جو اتفاق سے اس زمانے میں پٹنہ ہی میں قیام پذیر تھے تو مولود کا نام شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی مصنف تقویۃ الایمان کے نام پر محمد اسمٰعیل رکھا گیا۔ یہ بات ان کے عقائد پر مطلقاً اثرانداز نہیں ہوئی کہ وہ حنفی مذہب ہوئے۔ یقین ہے کہ وہ بہت سے امور کے مرتکب ہوئے ہوں جو شاہ صاحب کے نزدیک بدعاتِ سیۂ میں محسوب ہوتے تھے" (۱)

قاضی محمد اسمٰعیل کے بیٹے قاضی عبدالحمید تھے۔ ابتدا میں ان کی سکونت پٹنہ کے محلہ نخشی میں تھی۔ بعد میں لودی کٹرا چلے آئے اور پھر یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کے ایک صاجزادے قاضی عبدالوحید تھے۔ آپ کا روحانی تعلق حضرت شاہ امین سے تھا اور ان ہی سے سلسلۂ فردوسیہ میں بیعت تھے۔ اس کے علاوہ سلسلۂ قادریہ میں آپ کو مولانا احمد رضا خاں صاحب سے بھی اجازت حاصل تھی۔ آپ نے فارسی اور عربی کی درسی کتابیں مولانا سید عبدالعزیز چشتی صابری سہارنپوری سے پڑھی تھیں جن کا شمار مولانا عبدالحق خیرآبادی کے ارشد تلامذہ میں ہوتا تھا۔ قاضی عبدالوحید بڑے راست باز اور معاملات میں بڑے، اصول کے پابند تھے۔ دروغ گوئی، بدمعاملگی اور بے اصولی سے نفرت کرتے تھے۔ یہی صفات قاضی عبدالودود کو ان سے ورثے میں ملی تھیں ان کی اصول پسندی کا ایک واقعہ قاضی صاحب نے لکھا ہے۔ فرماتے ہیں :

"وہ بہت متشرع تھے۔ میرے دادا (قاضی عبدالحمید) نے کئی آدمیوں کو سودی قرض دے رکھا تھا۔ ان کی موت کے بعد انھوں نے سود کے ہزاروں روپے معاف کر دیے۔ وہ سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے بہت روپے دوسروں پر صرف ہوا کرتے تھے۔ وہ بہت راست گفتار تھے۔ اور معاملات کے کھرے۔ کوئی شخص اگر ان کے ساتھ بدمعاملگی کرتا تو وہ اس سے

۱۔ غالب نامہ (قاضی عبدالودود نمبر۔ ۱۹۸۷) ص ۲۳۔ ۲۴

Marfat.com

خواہ قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو بہت خفا ہوتے تھے اور اس کا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے" (۱)

قاضی عبد الوحید کی عمر نے کچھ زیادہ وفا نہ کی اور صرف ۷ ۳ سال کے سن میں ربیع الاول ۱۳۲۶ھ (اپریل ۱۹۰۸) میں وفات پائی۔ مغفور سے سال وفات (۱۳۲۶) برآمد ہوتا ہے۔ "ہاں کہ قاضی عبد الودود، مرتبہ صفدر امام قادری میں آپ کا سال وفات ۱۹۱۰ء بتایا گیا ہے۔ (۲)

جو تمام شواہد کی روشنی میں غلط ہے۔ آپ کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی۔ خود بھی شاعری کرتے تھے۔ وحید تخلص تھا۔ وحید عظیم آبادی کے نام سے معاصر رسالوں اور گلدستوں میں ان کا کلام شائع ہوتا تھا۔ بطور نمونہ ان کی مختلف غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

ہچکیاں بے سبب آتی نہیں پیہم مجھ کو — ہو نہ ہو آج کوئی شوخ مری یاد میں ہے
کیا کرے گا وہ ہمارے رگِ سودا کا علاج — اتنی تیزی ہی نہیں نشترِ فصاد میں ہے
سیکڑوں غیرتِ گل آتے ہیں ہنگامِ سحر — کون سی ایسی ادا نکہتِ برباد میں ہے
اک نظر میں ہوئے دل اور جگر صاف وحید — ایسی تیزی بھی کسی خنجر جلاد میں ہے؟

دم اُخیر بھی آئے نہ وہ خبر کے لئے — ترستے ہم چلے دنیا سے اک نظر کے لئے
کسی کی زلف کا سودا ہے جب تلک اے دل — نہ سازگار دوا ہو گی دردِ سر کے لئے
کوئی گھڑی میں وہ آتے ہیں صبر کر اے دل — وہ پہنچی تیری دعا عرش پر اثر کے لئے

یوں کیوں نہیں کہتے ہو کہ آئیں گے نہیں ہم — یہ کون سا حیلہ ہے کہ فرصت نہیں ملتی
وہ فضل سے اپنے جسے چاہے اُسے دیدے — علم و ہنر و عقل سے دولت نہیں ملتی
دل پاس ہے اُن کے تو تقاضے کی ہے صورت — پروا نہیں مجھ کو جو امانت نہیں ملتی
آئینہ ذرا دیکھو تو وہ کون ہے بیٹھا — کیا تم نے کہا؟ میری سی صورت نہیں ملتی

جناب احمد اللہ ندوی نے آپ کے متعلق حسبِ ذیل معلومات فراہم کی ہیں :

۱۔ غالب نامہ (قاضی عبد الودود نمبر۔ ۱۹۸۷ء) ص ۲۳۔ ۲۴

۲۔ آج کل (ماہنامہ) اکتوبر ۱۹۸۵ء۔ ص ۳۷

Marfat.com

"مولانا وحید نہایت ذی علم، فیاض اور عظیم آباد کے رئیس تھے۔ حنفی مسلک، صوفی مشرب اور شریعت کے نہایت پابند تھے۔ اپنے نام کے آخر میں حنفی غلام صدیق لکھا کرتے تھے۔ دوسرے بکثرت طلباء کو دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ماہانہ وظائف دیتے تھے۔ شہروں کے علماء و فضلاء آپ کے کاشانۂ مبارک پر فروکش ہوتے اور وہ حضرت وحید کی مخلصانہ مہماں نوازی سے بہت متاثر اور خوش ہو کے جاتے تھے۔ انھیں مغربی تہذیب اور جدید وضع قطع سے بہت نفرت تھی۔ راقم نے آپ کے خاندان کے بعض افراد سے سنا کہ ایک دفعہ آپ کے بڑے فرزند قاضی عبدالودود صاحب قمیص پہن کر اپنے والد ماجد کے سامنے آگئے۔ آپ نے انھیں دیکھ کے فرمایا۔ یہ اسلامی لباس نہیں ہے، مغرب کی تقلید نہ کی جائے۔ اور فوراً قینچی منگوا کر قاضی عبد الودود صاحب کی قمیص کو کتر دیا۔ حضرت وحید مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے ہم خیال اور موئیدین میں سے تھے۔ ۱۳۱۸ھ میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کا سالانہ اجلاس عظیم آباد پٹنہ میں منعقد ہوا۔ مولانا بریلوی صاحب ممدوح ندوۃ العلماء تحریک کے سخت مخالف تھے۔ حضرت وحید کا عظیم آباد میں ایک مطبع بھی تھا جس میں مولانا بریلوی صاحب کے اشتہارات ندوۃ العلماء کے خلاف طبع ہو کر تقسیم ہوئے۔ بعد ازاں مولانا بریلوی صاحب نے حضرت وحید سے اس مطبع کے عطا کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت وحید نے بطیب خاطر اس مطبع کی مشین، کاپی جمانے کے پتھر اور تمام ضروری سامان کو مولانا احمد رضا خاں صاحب کی خدمت میں بریلی بھجوا دیا" (۱)

قاضی صاحب خاندان کے لحاظ سے نجیب الطرفین سیّد تھے۔ وہ والد کی طرف سے حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے واسطے سے ہاشمی اور والدہ ماجدہ کی جانب سے رضوی تھے۔ آپ کا پدری سلسلہ اس طرح ہے:

قاضی عبدالودود بن قاضی عبدالوحید بن قاضی عبدالحمید بن قاضی محمد اسمٰعیل بن قاضی اکرام الحق بن قاضی امن الحق بن قاضی کمال الحق بن قاضی غلام یحییٰ بن قاضی غلام شرف الدین۔

اور حضرت مخدوم الملک کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔:

۱۔ تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔ حصہ پنجم (کراچی۔ ۱۹۶۹) ص ۱۳۸۔۱۳۹

Marfat.com

شرف الدین احمد بن شیخ، محمد یحییٰ بن محمد اسرائیل بن مولانا محمد تاج فقیہہ بن ابی بکر بن ابی الفتح بن ابی القاسم، بن ابی الصائم بن ابی دہر بن ابی لیث بن ابی سہمہ، بن ابی الدین، بن ابی سعید، بن ابی ذر بن زبیر المکنّٰی بابی الصعب، بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف۔

قاضی صاحب کا ننھیالی خاندان حضرت موسیٰ رضا کے وسیلہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی ہوتا ہے اس لئے سادات رضویہ کہلاتا ہے۔ قاضی صاحب کی والدہ سید شاہ لطف الرحمن ابن شاہ محمد مبین کی صاحبزادی تھیں۔ اس طرح ننھیالی بزرگوں کی طرف سے قاضی عبدالودود کو علم و معرفت کی دولت وراثتاً ملی تھی۔ ان کی والدہ کا شجرۂ نسب حسب ذیل ہے:

والدہ ماجدہ قاضی عبدالودود بنت سید شاہ لطف الرحمن بن سید شاہ مبین بن سید شاہ امداد حسین بن سید شاہ تیم اللہ بن سید شاہ اہل اللہ بن سید شاہ حبیب اللہ، بن سید شاہ عبدالرحمن، بن سید شاہ عبدالحئی بن سید شاہ فیروز۔

قاضی عبدالوحید کی چار اولادیں ہوئیں۔ تین لڑکے، ایک لڑکی۔ سب سے بڑے بیٹے قاضی عبدالودود تھے۔ ان کے بعد ایک صاحبزادی عائشہ خاتون ہوئیں۔ ان کے بعد قاضی محمد سعید ہوئے اور سب سے چھوٹے قاضی محمد فرید۔ ان میں قاضی محمد سعید کی ولادت مارچ ۱۹۰۶ء میں ہوئی اور قاضی محمد فرید ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ عائشہ خاتون کے سال ولادت کا صحیح علم نہ ہو سکا۔ گمان غالب یہ ہے کہ ۱۹۰۰ کے آس پاس پیدا ہوئی ہوں گی۔

قاضی محمد سعید بہار کی معروف شخصیت تھے۔ نیشلسٹ خیالات کے حامل تھے۔ ابتدائی تعلیم پٹنہ میں حاصل کی۔ بعد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ چلے گئے۔ یہیں سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ یہیں ان کے مراسم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سے ہو گئے۔ وہ ذاکر صاحب کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوئے۔ ذاکر صاحب بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ جس زمانہ میں ذاکر صاحب صوبۂ بہار کے گورنر تھے اس دوران دونوں کے تعلقات میں مزید گرم جوشی پیدا ہو گئی تھی۔ قاضی محمد سعید نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری برلن یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ آپ کی تحقیق کا موضوع فشے کا نظریۂ تعلیم تھا۔ جرمنی کے دوران قیام آپ نے یہاں کے سیاسی حالات کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا تھا اور وہ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ انھوں نے نازیوں کی

Marfat.com

تحریک اور اس کے مضر اثرات کا براہِ راست مشاہدہ کیا تھا۔ انھوں نے ہٹلر کے عروج کا زمانہ بھی دیکھا۔ نازیوں سے ان کے قریبی مراسم رہے، لیکن ان کی تحریک کے وہ کبھی حامی نہیں ہوئے۔ وطن واپس آکر انھوں نے خود کو رفاہِ عام کے کاموں میں مشغول کر لیا۔ لیکن آپ کی سرگرمیاں زیادہ تر صوبہ بہار تک ہی محدود رہیں۔ آپ آخر دم تک بہار کی سیاسی، سماجی، تعلیمی، اور ثقافتی سرگرمیوں میں جوش وخروش سے حصہ لیتے رہے۔ ۱۰ نومبر ۱۹۶۸ء کو آپ کی وفات ہوئی۔ پروفیسر مختار الدین احمد نے آپ کا سال وفات 1985 لکھا ہے جو یقیناً غلط ہے۔ ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی ہو۔(۱)

جن حضرات کو ان سے ملنے اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے ان کا کہنا ہے کہ وہ انتہائی خلیق، ہنس مکھ اور ملنسار انسان تھے۔ مسکراتے رہنا ان کی عادت تھی۔ غایت درجہ حلیم اور منکسر المزاج تھے۔ حسنِ باطنی کے ساتھ اللہ نے انھیں حسنِ ظاہری سے بھی نوازا تھا۔ بے حد وجیہ اور حسین انسان تھے۔ صحت ہمیشہ اچھی رہی۔ اور اس لحاظ سے وہ سیّد کم اور اعلیٰ خاندان کے پٹھان زیادہ معلوم ہوتے تھے۔ یوں تو وہ اکثر انگریزی وضع کا لباس پہنتے تھے۔ لیکن شیروانی ان پر زیادہ کھبتی تھی۔ ان تمام اوصاف کے ساتھ مہمان نوازی کی صفت بھی مالکِ حقیقی کی جانب سے وافر مقدار میں عطا ہوئی تھی۔ قاضی عبد الودود کو ان سے بے حد محبت تھی۔ ان کے انتقال کا قاضی صاحب کو بہت صدمہ ہوا۔ قاضی صاحب کو لوگوں نے زندگی میں صرف ایک بار پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھا ہے اور وہ حادثہ تھا قاضی محمد سعید کی وفات۔

قاضی صاحب کے سب سے چھوٹے بھائی تھے قاضی محمد فرید۔ ان کی ولادت ۱۹۰۸ء میں ہوئی تھی۔ جس کے کچھ ہی دنوں بعد ان کے والد قاضی عبد الوحید انتقال کر گئے۔ انھوں نے معاشیات کو اپنے مطالعے کا خاص موضوع بنایا۔ تقسیمِ ملک کے بعد یہ پاکستان چلے گئے۔ اور کراچی یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر ہو گئے تھے۔ وہیں ۱۹۶۶ء میں وفات پائی۔ انھوں نے بھی اعلیٰ تعلیم انگلستان میں حاصل کی تھی۔ کیمبرج یونیورسٹی سے ۱۹۳۶ء میں TRIPOS کیا۔ اس میں معاشیات، سیاسیات اور تاریخ ان کے خاص مضامین تھے۔ معاشیات

(۱) قاضی عبدالودود (خاندانی حالات) غالب نامہ۔ قاضی عبدالودود نمبر) ص ۲۷

Marfat.com

میں انھوں نے اختصاص حاصل کیا تھا۔ وہ مشرقی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ وہ ایک اچھے اور مشفق استاد تھے۔ طلباء میں بہت مقبول رہے۔ ان کے رفقاء اور احباب ان سے محبت بھی کرتے تھے اور احترام بھی۔ ان کی اولاد میں دو صاحبزادے اور صاحبزادیاں ہوئیں۔ بڑے بیٹے کا نام ہمایوں فرید اور چھوٹے بیٹے کا نام شوکت فرید ہے۔ ان کے بارے میں پروفیسر مختار الدین احمد نے حسب ذیل معلومات فراہم کی ہیں :

"قاضی محمد فرید ۱۹۰۸ء کے اوائل میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ یونیورسٹی میں تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۳۰ء میں انگلستان گئے۔ اور کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ان کے مضامین معاشیات، سیاسیات اور تاریخ تھے۔ وہ بہت مستعد طالب علموں میں تھے اور تعلیم میں اپنے ہندوستانی رفقاء میں ممتاز۔ ان کے کیمبرج کے دوستوں میں سید شاہ جعفر حسین ایڈوکیٹ (خلف سید شاہ واجد حسین رئیس خسرو پور (پٹنہ)، میجر آفتاب حسن (سابق پرنسپل اردو کالج کراچی) کے نام یاد آتے ہیں۔ میجر آفتاب حسن صاحب دو سال پہلے تک اردو مقتدرہ کراچی کے ڈائریکٹر اور "اخبار اردو" کے ایڈیٹر تھے۔ ان لوگوں نے کار پر پورے ہندوستان کی سیاحت کی تھی۔ اس سیاحت کی دلچسپ داستان رسالۂ ندیم (گیا) میں عرصہ تک قسط وار چھپتی رہی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں وہ کیمبرج سے ٹرائی پوس لے کر واپس آئے۔ بہار میں کوئی مناسب جگہ نہ ملنے پر وہ اسلامیہ کالج امرتسر میں لکچرر ہو گئے۔ وہ ۱۹۴۳ء کے وسط تک ضرور اس سے منسلک رہے۔ اس لیئے کہ اسی زمانے میں ، میں نے انھیں کالج میں داخلہ کے متعلق ایک خط لکھا تھا۔ انھوں نے فوراً جواب دیا...... قاضی محمد فرید کی وہیں پنجاب کے ایک خوش حال تعلیم یافتہ اور متمدن خاندان میں شادی ہو گئی...... بیگم فرید کو میں نے صرف ایک بار پٹنہ میں دیکھا جب وہ قاضی فرید کے سات قدم کنواں والی کوٹھی میں قیام پذیر تھیں۔ انھیں میں نے بہت ذہین، مستعد اور خوش اخلاق پایا۔

بعد کو قاضی فرید کراچی یونیورسٹی میں سوشل سائنسز کی فیکلٹی میں پروفیسر ہو گئے تھے۔ اور اپنے شعبہ کے صدر۔ ان کا وہیں اواخر مارچ ۱۹۶۶ء میں انتقال ہوا۔(۱)

---

(۱) قاضی عبدالودود (خاندانی حالات) غالب نامہ۔ قاضی عبدالودود نمبر) ص ۲۷۔۲۸

Marfat.com

ولادت : قاضی عبدالودود کی ولادت ۱۸۹۶ء میں ہوئی۔ آں کہ قاضی عبدالودود، مرتبہ صفدر امام قادری (آج کل۔ نئی دہلی۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء) میں ۱۹۰۶ء درج ہے۔ (ص ۳۷) جو صریحاً غلط ہے۔ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ قاضی صاحب جیسا بلند پایہ محقق اور چھان بین کرنے والا انسان ایک طویل عرصہ تک خود اپنی صحیح تاریخِ ولادت کا پتہ نہ لگا سکا۔ حتیٰ کہ ۱۹۷۶ء میں جب ماہنامہ معاصر (پٹنہ) نے ان پر خصوصی شمارہ شائع کیا اور اس کے لئے ان سے خودنوشت حالات قلم بند کرائے تو اس میں بھی نہ صرف یہ کہ تاریخ اور ماہ کے بارے میں کچھ نہ بتا سکے، بلکہ سالِ ولادت کے بارے میں بھی کوئی یقینی بات نہ کہہ سکے اور صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ :

"میری عمر کے اکاسی سال گزر چکے ہیں اور سالِ ہشتاد و دوم گزر رہا ہے یہ تخمین پر مبنی ہے۔ اگر میں نے کبھی اس کے خلاف لکھا ہے تو وہ بھی تخمین پر مبنی تھا۔ مجھے یقین ہے کہ صحیح وہ ہے جو اس جگہ میں نے لکھا ہے" (ص ۵)

اسی طرح ۸/ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو ڈاکٹر محمد حسن کے نام ایک خط میں اپنے سن کے متعلق وہ لکھتے ہیں :

"میری عمر کے ۷۸ سال گزر چکے ہیں۔ یہ ہفتاد و نہم ہے۔ نقوش کے آپ بیتی نمبر میں جو سال ہے، اس کے مطابق ہے تو صحیح ہے، ورنہ غلط ہے۔ اس وقت کے حساب سے جو عمر درج ہے، صحیح معلوم ہوئی۔ بعد کو حساب سے جو عمر صحیح نکلی اور جس کی صحت میں شبہ کی گنجائش بہت کم ہے، اوپر درج ہے" (۱)

پروفیسر مختار الدین نے قاضی صاحب سے متعلق ایک تفصیلی مضمون تقریباً ۳۵ سال قبل لکھا تھا جو نقوش لاہور کے سالنامہ ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا اور بعد میں معاصر کے قاضی عبدالودود نمبر (۱۹۷۶) میں خفیف ترمیم و اضافہ کے ساتھ شاملِ اشاعت ہوا۔ اس میں بھی آپ کا سالِ ولادت نہیں دیا گیا۔ صرف اتنا لکھنے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ :

"قاضی صاحب کی ولادت عظیم آباد (پٹنہ) میں آج سے کوئی اٹھاون (۵۸) سال پہلے ایک سخت مذہبی خاندان میں ہوئی"۔

---

(۱) معاصر (پٹنہ) قاضی عبدالودود نمبر۔ ص ۳۴۳

Marfat.com

اس پر معاصر میں بحیثیت مدیر و مرتب پروفیسر کلیم الدین احمد نے حسبِ ذیل حاشیہ کا اضافہ کیا:

"اس وقت قاضی صاحب کی عمر تقریباً ۸۱ سال ہے"۔

اس طرح پروفیسر مختار الدین صاحب کی بتائی ہوئی عمر غلط ثابت ہو جاتی ہے۔ آپ کے تخمینہ کے مطابق قاضی صاحب کا سال ولادت ۱۸۹۹ء قرار پاتا ہے اور کلیم الدین احمد صاحب کے بیان کے لحاظ سے یہ ۱۸۹۵ تا ۱۸۹۶ آتا ہے۔ قاضی صاحب نے بھی ۱۹۷۶ء میں اپنی عمر ۸۱ برس بتائی ہے۔ لیکن انھوں نے بھی کوئی بات قطعیت سے نہیں کہی ہے۔ جناب احمد اللہ ندوی نے اپنے تذکرۂ مسلم شعرائے بہار میں جو ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ قاضی صاحب کے متعلق بہت کچھ لکھنے کے باوجود ان کی جائے ولادت اور تاریخِ ولادت کے سلسلہ میں خاموشی اختیار کی ہے۔ آپ کے والد جناب وحید عظیم آبادی کے احوال میں وہ لکھتے ہیں:

"حضرت وحید کے نرینہ اولاد میں تین فرزند ہوئے اور ایک دختر تھیں۔ ان کے نام یہ ہیں: سب سے بڑے قاضی عبد الودود صاحب جو محقق بہار کے لقب سے مشہور ہیں۔ حافظِ قرآن، عربی داں اور بیرسٹری پاس ہیں۔ آپ کے ایک ہی فرزند ہیں جن کا نام قاضی مسعود ہے۔ منجھلے قاضی سعید صاحب جن کا انتقال ۱۸ر شعبان ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۰ر نومبر ۱۹۶۸ء کو بمقام پٹنہ ہوا۔ موصوف نے جامعہ ملیہ دہلی سے بی۔ اے کیا پھر جرمنی میں آٹھ سال رہ کر وہاں سے ڈگری لے کے آئے۔ عمر بھر شادی نہیں کی، مجرد رہے اور چھوٹے قاضی فرید صاحب مرحوم کراچی یونیورسٹی میں معاشیات کے نیک نام اور قابل پروفیسر تھے جن کا انتقال بتاریخ ۲۹ر مارچ ۱۹۶۶ء مطابق ۶ر ذی الحجہ ۱۳۸۵ھ کراچی میں ہوا اور قاضی عبد الوحید صاحب کی دختر بی بی عائشہ تھیں جو قاضی عبد الودود صاحب سے چھوٹی اور باقی دو بھائیوں سے بڑی تھیں۔ یہ خان بہادر محبوب عالم صاحب رئیسِ اعظم موضع پنجورہ ضلع گیا کی دوسری بیوی تھیں جن کے بطن سے ایک ہی دختر انجمن آرا عرف بی بی احمدی صاحبہ ہیں جو اپنے چچازاد بھائی سید محمد حیدر صاحب سے کتخدا ہوئی ہیں اور ترکِ وطن کر کے کراچی آگئی ہیں"۔(۱)

یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ قاضی عبد الودود کے دونوں برادران قاضی

---

(۱) مسلم شعرائے بہار۔ ص ۱۴۹

Marfat.com

سعید اور قاضی فرید کے سلسلہ میں تاریخوں کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے اور انگریزی مہینوں اور عیسوی سال کے ساتھ عربی تاریخوں اور ہجری سال کو بھی دیا گیا ہے، لیکن قاضی عبدالودود کی تاریخ ولادت کے سلسلہ میں مکمل خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ اس طرف سب سے پہلے جناب عطا کاکوی نے توجہ کی اور قاضی صاحب کے مقام پیدائش اور ماہ و سال ولادت کا تعین فرمایا۔ ان کی تحقیق کے مطابق اپنے ننھیال کاکو میں ذیقعدہ ۱۳۱۳ھ / ۱۸۹۶ء میں تولد ہوئے۔ فرماتے ہیں:

"یہ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ قاضی صاحب کب اور کہاں پیدا ہوئے۔ اپنی پیدائش کا سال قاضی صاحب کو خود ایک عرصۂ دراز تک معلوم نہ تھا۔ وہ اندازہ لگا کر تخمیناً اپنی پیدائش کا سال بتاتے تھے۔ میں نے خاندانی روایات اور دیگر شواہد سے ۱۳۱۴ھ متعین کیا تھا جس کی مطابقت ۱۸۹۶ء سے ہوتی ہے۔ یہ بات گوش زد تھی کہ جس سال کاکو میں بھیانک آتش زدگی ہوئی اور جس سے ساری بستی کی بستی جل گئی، اسی سال قاضی صاحب کی ولادت ہوئی تھی۔ وہ اپنے ننھیال کاکو میں پیدا ہوئے تھے۔ چند سال پیشتر پرانے کاغذات میں ان کی ولادت کا سال ۱۳۱۳ھ برآمد ہوا۔ عیسوی سال وہی ۱۸۹۶ء برقرار رہا۔ مہینہ ذیقعدہ کا تھا جو اپریل / مئی سے مطابقت رکھتا ہے"۔(۱)

ابتدائی تعلیم: قاضی صاحب کی ابتدائی تعلیم زمانہ کے دستور کے مطابق گھر پر ہوئی۔ رواج کے مطابق اردو، فارسی، اور ابتدائی عربی پڑھی۔ اسی کے ساتھ قرآن کریم حفظ کرنا شروع کیا۔ چودہ سال کی عمر میں مکمل قرآن حفظ کر لیا اور رمضان المبارک کی تراویح میں مکمل کلام پاک سنانے کی سعادت بھی حاصل کی۔ جناب سید شاہ غفور الرحمٰن حمد کاکوی نے اس تقریب سعید پر ایک قطعۂ تاریخ کہا اور اس سے حسبِ ذیل تاریخ نکالی۔

شکر ہے اللہ کا عبدالودود — حفظ قرآں کر کے فارغ ہو گئے
حمدؔ کو تاریخ کی تھی جستجو — بولا ہاتف حافظ و قاری ہوئے

حافظ و قاری ہوئے، سے ۱۳۲۷ھ برآمد ہوتے ہیں۔ یہی ان کی تکمیل حفظ کا سال ہے۔ ایسے سخت مذہبی ماحول میں خالص مذہبی تعلیم حاصل کرنے کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان

(۱) غالب نامہ (قاضی عبدالودود نمبر) ص ۵۴

Marfat.com

مذہب کے معاملے میں سخت گیر اور متشدد ہو جاتا ہے۔ لیکن قاضی صاحب اس اصول سے مستثنیٰ رہے۔ اور بقول پروفیسر عطا کاکوی "ان کو کسی مسجد کا امام ہونے کے بدلے امام المتقین ہونا مقسوم ہو چکا تھا۔" والدِ ماجد کے انتقال کے بعد علمائے بریلی کی جانب سے اصرار ہوا کہ مزید تعلیم کے لئے انھیں بریلی بھیجا جائے لیکن قاضی صاحب نے اس طرف رخ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ اس معاملہ میں ان کی والدہ نے کوئی مداخلت نہیں کی اور قاضی صاحب کو مکمل طور سے ان کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ والدہ محترمہ کے اس رویہ سے قاضی صاحب کو مزید تقویت ملی۔ چنانچہ حتمی طور پر انھوں نے مذہبی تعلیم جاری رکھنے کے تمام امکانات کو یکسر ختم کر دیا۔ اپنی ابتدائی تربیت اور مذہبی تعلیم کے بارے میں تفصیلات بتاتے ہوئے قاضی صاحب خود لکھتے ہیں :

"میری پرورش زنانخانہ میں نہیں ہوئی۔ میری قدیم ترین یادیں اپنے دادا سے وابستہ ہیں۔ ان کے بعد والدین آتے ہیں۔ ایک بات جو مجھے یاد ہے، اس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میرے والد مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ مگر یہ واضح رہے کہ وہ دو ایک بار کے سوا، کبھی انھوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ متوسطاً فارسی پڑھنے کے بعد میں نے عربی پڑھنا اور قرآن حفظ کرنا شروع کیا۔ میرے قدیم ترین معلموں میں سے ایک سیّد سلیمان اشرف تھے جو بعد کو علی گڑھ کالج میں استاد دینیات ہوئے۔ والد کی وفات کے بعد بریلوی صاحب کی طرف سے تحریک ہوئی کہ مَیں تعلیم کے لئے بریلی جاؤں مگر میں نے انکار کر دیا۔ پیلی بھیت کے ایک عالم وصی احمد جو محدث سورتی کہے جاتے تھے اور والد کے قائم کردہ مدرسہ میں مدرس اول رہ چکے تھے، اسی غرض سے مجھے لینے کے لئے پٹنہ آئے۔ مگر میں پیلی بھیت جانے پر راضی نہ ہوا۔ عربی صرف و نحو میں نے پٹنہ ہی میں مکمل کر لی۔ نحو کی آخری کتاب جو میں نے پڑھی شرحِ کافیہ ہے جو جامی نے لکھی ہے۔ منطق میں شرحِ تہذیب کے اتمام کے بعد میں نے قطبی پڑھنی شروع کی تھی مگر وہ ناتمام رہ گئی۔ یہی حال شرح وقایہ اور مختصر المعانی کا ہوا۔ قرآن میں نے پورا حفظ کر لیا۔ یہ ٹھیک یاد نہیں کہ اس وقت میری عمر کیا تھی۔ میری والدہ

Marfat.com

نے تعلیم کے معاملے میں مجھ پر بالکل جبر نہیں کیا۔ مجھے اپنی راہ پر چھوڑ دیا۔" (۱)

اس طرح مذہبی تعلیم کو خیرباد کہہ کر قاضی صاحب مغربی تعلیم کی جانب متوجہ ہوئے۔ ابتداءً گھر پر ہی انگریزی پڑھی۔ پھر محمڈن اسکول پٹنہ میں درجہ پنجم میں داخل ہوئے۔ ایک سال بعد علی گڑھ چلے آئے۔ اور سرسیّد کے قائم کردہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں درجہ سوم میں داخل ہوگئے یہ وہی اسکول ہے جس کے ان کے والد شدید مخالف تھے اور اس کے بانی کا نام لینا بھی گوارانہ کرتے تھے اور ہمیشہ لفظ 'نیچری' سے یاد کرتے تھے۔ علی گڑھ آنے کے بعد پہلے تو کچھ عرصہ سیّد سلیمان اشرف کے در دولت پر مقیم رہے۔ مولانا اس زمانہ میں یہاں ناظم دینیات تھے۔ آپ کا تعلق بھی بہار سے تھا اور قاضی صاحب کو ان سے شرف تلمذ بھی حاصل تھا۔ جلد ہی قاضی صاحب کو کالج کے ہوسٹل ماریسن کورٹ میں جگہ مل گئی۔ اس طرح وہ باقاعدہ کالج کے بورڈر بن گئے۔ کچھ ہی دنوں بعد ماریسن کورٹ سے میکڈانلڈ ہوسٹل میں منتقل ہو گئے۔ آج کل یہ دونوں ہوسٹل آفتاب ہال کا حصہ ہیں۔ دراصل آفتاب ہال چار ہوسٹلوں پر مشتمل ہے ان کے نام ہیں: ماریسن کورٹ، ممتاز ہاؤس، آفتاب ہوسٹل اور میکڈونلڈ ہوسٹل۔ مرحوم صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین بھی زمانۂ طالب علمی میں ماریسن کورٹ ہی میں رہے تھے۔ اور یہیں ان کے دونوں بڑے بھائی بھی قیام پذیر رہے۔ اس لحاظ سے اسے بڑی تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

اسی زمانہ میں قاضی صاحب نے طے کیا کہ اعلیٰ تعلیم وہ انگلستان جاکر حاصل کریں گے۔ چنانچہ یہیں انھوں نے اس کی تیاری شروع کردی۔ اس وقت یہاں بلگرامی ٹیوٹوریل کالج اس سلسلہ میں بہت اچھا کام کررہا تھا۔ یہ ایک پرائیویٹ انسٹی ٹیوٹ تھا جسے میجر سیّد حسن بلگرامی نے قائم کیا تھا۔ میجر صاحب مشہور بلگرامی فیملی سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نواب عماد الملک سیّد حسین بلگرامی کے علاتی بھائی اور سیّد علی بلگرامی کے حقیقی بھائی تھے۔ انڈین میڈیکل سروس سے متعلق تھے اور زیادہ تر فوج کے ساتھ رہے۔ کسی سبب سے مستعفی ہوکر لندن چلے گئے تھے اور کافی عرصہ تک وہیں رہے۔ ۱۹۱۲ء میں ہندوستان واپس آگئے۔ اور علی گڑھ آکر ٹیوٹر کالج قائم کرلیا۔ ۱۹۱۵ء میں اچانک انتقال ہوگیا۔ آپ کئی مشرقی اور مغربی زبانیں جانتے تھے۔ ان میں

---

(۱) میں کون ہوں، کیا ہوں (معاصر۔ پٹنہ۔ قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۵۔۶

Marfat.com

انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور اسپینی شامل ہیں۔ اسی لئے ان کے کالج میں یہ سب زبانیں پڑھائی جاتی تھیں۔ یہاں ان نوجوانوں کے لئے تعلیمی سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں جو بغرض تعلیم یورپ جانا چاہتے تھے۔ میجر بلگرامی کی وفات کے بعد یہ کالج بند ہو گیا۔ قاضی صاحب نے کالج میں داخلہ لیا اور انگلستان جانے کی تیاری کرنے لگے۔ لیکن کالج بند ہو جانے پر آپ کو بھی سلسلۂ تعلیم منقطع کرنا پڑا۔ آپ مجبوراً پٹنہ واپس چلے گئے۔ یہاں وہ سینئیر کیمبرج کی تیاری کر رہے تھے۔ یہیں آپ نے انگریزی اور لاطینی زبانیں سیکھیں۔ اسی زمانے میں یورپ میں جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ اس کے سبب انگلستان جانے کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں۔ لہذا قاضی صاحب کو بھی وقتی طور پر انگلینڈ جانے کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اب پٹنہ میں رہ کر ہی تعلیم کا سلسلہ جاری کیا۔ اور پرائیویٹ طور پر ۱۹۱۶ء میں ہائی اسکول کا امتحان دیا۔ اللہ نے شاندار کامیابی عطا فرمائی اور فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد پٹنہ کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۱۸ء میں انٹر میڈیٹ پاس کیا۔ اس میں بھی ان کی فرسٹ ڈویژن آئی۔ دو سال بعد ۱۹۲۰ء میں بی۔اے کیا۔ اور امتیاز حاصل کیا۔ اس میں آپ کے مضامین تھے۔ انگریزی، اردو، فارسی ادبیات اور تاریخ۔ قاضی صاحب بڑے ذہین اور محنتی طالب علم تھے اسی لئے امتحانات میں ہمیشہ شاندار طریقہ پر کامیاب ہوئے۔

بی۔اے پاس کرنے کے بعد تعلیم کا سلسلہ پھر ایک بار وقتی طور پر منقطع ہو گیا۔ اسی زمانے میں ہندوستان میں سیاسی سرگرمیاں بہت تیزی سے چل رہی تھیں۔ انگریزوں کے خلاف تحریکیں زوروں پر تھیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی سیاسی تحریک جنم لیتی اور عوام انتہائی جوش و خروش سے اس میں حصہ لیتے۔ ان ہی تحریکات میں ایک تھی تحریکِ عدم تعاون۔ گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے عظیم رہنماؤں کی تحریک پر انگریز حکومت سے کسی بھی قسم کے تعاون کے خلاف یہ تحریک تھی۔ اس میں دیگر مقاطعات کے ساتھ حکومت کے تعلمی اداروں اور حکومت کی امداد سے چلنے والی درسگاہوں سے طالب علموں کا مقاطعہ بھی شامل تھا۔ اس کے نتیجہ میں ہزاروں طالب علموں نے خود کو تعلیم گاہوں سے علیحدہ کر لیا۔ قاضی صاحب نے اس تحریک میں عملی طور پر حصہ لیا۔

Marfat.com

اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان میں: ۱۹۲۳ء میں قاضی صاحب کا بچپن کا خواب پورا ہوا۔اس سال ماہ مارچ میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن چلے گئے۔ وہاں کیمبرج یونیورسٹی سے ۱۹۲۷ء میں انھوں نے معاشیات سے ٹرائی پوس(TRIPOS) کیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۹ء میں مڈل ٹیمپل اِن(MIDDLE TEMPLE INN) سے انھوں نے بیرسٹری کاامتحان پاس کیا۔

علالت: ۱۹۲۷ء میں جب قاضی صاحب ٹرائی پوس کر رہے تھے تو وہ سخت علیل ہو گئے۔اور یہ بیماری اس نوعیت کی ہوگئی کہ کئی ماہ آپ کو سینی ٹوریم میں رہنا پڑا۔اس کے بعد پانچ ماہ سوئزر لینڈ میں جاکر بھی علاج کرانا پڑا۔ یہیں ان کی ملاقات پنڈت جواہر لال نہرو سے ہوئی۔ اور جلد ہی یہ ملاقات پورے نہرو خاندان سے گہرے مراسم میں تبدیل ہوگئی۔ جناب محمد ذکی الحق نے اس واقعہ کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی ہے:

> "پنڈت جی سے قاضی صاحب کی ملاقات شریمتی کملا نہرو کے واسطے سے ہوئی تھی۔اس کی صورت یہ تھی کہ قاضی صاحب کیمبرج میں تھے۔اکنامکس میں ٹرائی پوس کر رہے تھے۔ تعلیم کا سلسلہ چل رہا تھا۔امتحان کے مرحلے طے ہو رہے تھے لیکن اچانک بیمار ہو گئے۔ چھ ماہ لندن سینٹوریم میں مقیم رہے پھر سوئزر لینڈ میں موتھانہ کے سیتابلیسان اسٹفانو(CATABLISS MOUNT STEFANO) میں پانچ چھ ماہ قیام کرنا پڑا یہاں شریمتی کملا نہرو بھی بغرضِ علاج داخل ہوئیں۔اس سینٹوریم کے ایک ہی گوشے میں دونوں کے الگ الگ کمرے تھے۔ لیکن ڈائننگ روم اور بالکونی مشترک تھے۔ طریقۂ علاج میں یہ لازمی تھا کہ صبح، دوپہر اور شام یعنی تین وقت دو، دو گھنٹے بالکونی میں بستر پا لازماً لیٹے رہیں اس طرح چھ گھنٹے یومیہ ایک ہی بالکونی میں شریمتی کملا نہرو اور قاضی صاحب لیٹے رہتے۔ پنڈت جواہر لال نہرو برابر اپنی اہلیہ کی دیکھ بھال اور ملاقات کے لئے آتے رہتے تھے قاضی صاحب سے روابط اور مراسم قائم ہوئے۔اندرا گاندھی کا سال ولادت ۱۹۱۷عیسوی ہے۔اس لحاظ سے ان دنوں ان کی عمر لگ بھگ آٹھ سال تھی۔ان دنوں وہ سوئزر لینڈ میں کسی اسکول میں پڑھتی تھیں۔

Marfat.com

تعطیل اور فرصت کے موقع پر برابر سینٹوریم تشریف لاتیں۔ قاضی صاحب صحت یاب ہو کر کیمبرج واپس ہوئے اور وہاں ان کی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ قیامِ کیمبرج کے دوران قاضی صاحب نے شریمتی کملا نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی کو دن کے کھانے پر مدعو کیا۔ سب لوگ شریکِ دعوت ہوئے۔ پنڈت موتی لال نہرو کو بھی، جو ان دنوں وہاں تھے۔ مدعو کیا گیا تھا۔ لیکن وہ کسی سبب سے شرکت نہیں کر سکے تھے"۔(۱)

قاضی صاحب کو پلورسی ہو گیا تھا اگرچہ سوئزرلینڈ میں علاج سے وہ صحت یاب ہو گئے تھے لیکن مکمل طور پر اس کا اثر زائل نہیں ہوا۔ اور تمام عمر وہ اس سے متاثر رہے۔ ان کی عام صحت ہمیشہ کے لئے خراب ہو گئی۔ اس علالت کا اثر ان کے امتحان کے نتیجہ پر بھی پڑا۔ جو طالب علم ہمیشہ امتیاز کے ساتھ امتحانات میں کامیاب ہوتا رہا ہو، اسے TRIPOS کے امتحان میں صرف سکنڈ ڈویژن ملا۔ اس خرابی صحت کا اثر ان کے مستقبل پر بھی پڑا۔ اس کی وجہ سے وہ وکالت کا پیشہ اختیار نہ کر سکے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے یہ بیماری عود کرتی رہی اور وہ سینٹوریم میں داخل ہوتے رہے۔ اس کی تفصیل خود قاضی صاحب کے الفاظ میں :

"مارچ ۱۹۲۳ء میں تکمیل تعلیم کے لئے انگلستان گیا اور بیرسٹری کے مڈل ٹمپل میں داخل ہوا۔ اس وقت کیمبرج میں داخلے کا سوال ہی نہ تھا۔ مگر میں رہا وہیں اور چند دوستوں کے ساتھ لمبی تعطیل میں جرمنی گیا۔ وہاں کئی مہینے رہا اور میں نے جرمن سیکھی۔ اکتوبر میں کیمبرج آیا۔ اور وہاں میرا داخلہ فٹزولیم ہاؤس میں ہو گیا۔ میں نے اکنامکس ٹرائی پوس لیا تھا۔ تعطیلات میں فرانس جایا کرتا تھا۔ اور وہاں میں نے فرانسیسی سیکھی۔ کیمبرج میں ٹرائی پوس کا دوسرا حصہ لینے نہ پایا تھا کہ سخت بیمار ہو گیا۔ چند ماہ کیمبرج کے قریب ہی ایک سینٹوریم میں رہا۔ بعد ازاں جاڑوں کے اوائل میں مونتانا (سوئزرلینڈ) گیا اور وہاں رہا۔ واپسی کے بعد میں امتحان میں شریک ہوا اور مجھے سکنڈ ڈویژن ملا۔ دوسرے حصہ میں، میں نے علم السیاست بھی لیا تھا۔ اور بطور خود کچھ فلسفے اور نفسیات کی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ اس کے بعد میرا قیام زیادہ تر لندن میں رہا۔ میں

(۱) معاصر، پٹنہ۔ قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۲۶۲

Marfat.com

نے بیرسٹری کے امتحانات پاس کیے۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں، میں پٹنہ آیا۔ میری صحت مضبوط نہ رہی۔ میں پریکٹس نہ کر سکا اور مجھے بار بار سینٹوریم جانا پڑا'' (۱)

شادی: قاضی صاحب کے دو نکاح ہوئے۔ پہلا نکاح ۱۹۱۰ء میں ہوا۔ لیکن رخصتی عمل میں نہیں آئی۔ اس کے کوئی ڈیڑھ سال بعد ۱۹۱۲ء میں ان خاتون کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح ازدواجی زندگی میں منسلک ہونے کے باوجود متاہلانہ زندگی نہ گزار سکے۔ اس کے بعد ایک طویل عرصہ گزر گیا۔ ۱۹۲۲ء میں ان کا دوسرا نکاح شاہ رشید اللہ صاحب فرحتؔ کی صاحبزادی سے ہوا۔ رخصتی بھی عمل میں آئی اور یہی ان کی شریکِ حیات بنیں۔ فرحتؔ صاحب اپنے زمانے کے مشہور اور مقبول وکیل تھے۔ کافی عرصہ تک سرکاری وکیل بھی رہے۔ ہر جگہ نیک نامی اور شہرت نے ان کے قدم چومے ۱۹۶۲ء میں وفات پائی۔

اولاد: قاضی صاحب کے صرف ایک ہی اولاد ہوئی۔ یعنی قاضی محمد مسعود۔ قاضی صاحب کی خصوصی توجہ کے طفیل میں یہ بھی زیورِ علم سے آراستہ ہیں۔ ایم۔اے۔ ایل۔ بی ہیں۔ ایم۔اے سماجیات میں کیا ہے۔ ماشاءاللہ خوش حالی اور خوشباشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سیاحت: قاضی صاحب ''بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے'' کے قائل تھے۔ انھوں نے ملک اور بیرونِ ملک بہت سے سفر کیے اور ان کے ذریعہ ذہنی افق کو کشادہ، نظر کو وسیع اور معلومات کو ہمہ گیر بنایا، نیز تجربے میں پختگی پیدا کی۔ آپ نے سب سے پہلا بیرونی سفر مارچ ۱۹۲۳ء میں برطانیہ کا کیا۔ وہاں تقریباً ۷ سال آپ کا قیام رہا۔ اس دوران وہ سخت علیل ہو گئے اور علاج کی خاطر انھیں سوئزرلینڈ جانا پڑا۔ تقریباً چھ ماہ بعد واپسی ہوئی۔ اس کے علاوہ تعطیلات میں آپ جرمنی بھی تشریف لے جایا کرتے تھے جہاں آپ کو جرمن زبان سیکھنے کا موقع ملا۔ علاوہ ازیں آپ نے فرانس، ہالینڈ اور اٹلی کا بھی سفر کیا۔ ان ممالک کی سیاحت کا مقصد وہاں کے مشہور کتب خانوں کی سیر کرنا تھا۔ اس کے طفیل ان ممالک کے مشرقی علوم کے ذخائر پر ان کی نظر بہت گہری ہو گئی تھی۔ جس کا اظہار ان کی مختلف تحریروں سے بھی ہوتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستان کے مختلف شہروں کا بھی سفر کیا۔ ان میں کراچی، حیدرآباد (سندھ) اور لاہور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپ نے ڈھاکہ کا بھی سفر کیا۔ ان تمام اسفار کا

---

(۱) معاصر۔ قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۷

Marfat.com

مقصد بھی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینا تھا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں کا بھی آپ نے سفر کیا ہے۔ جناب صفدر امام قادری نے "آں کہ قاضی عبدالودود" میں آپ کے اسفار اور مختلف مقامات پر مدتِ قیام کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے۔ :

برطانیہ : (مارچ ۱۹۲۳ء) واپسی : (مارچ ۱۹۲۹ء)

جرمنی : (اپریل تا اکتوبر ۱۹۲۳)

سندھ : آٹھ ہفتہ کا قیام (دسمبر ۱۹۴۷ء سے جنوری ۱۹۴۸ء)

بمبئی : دو ماہ کا قیام (۱۹۵۳ء)

حیدرآباد : (۱۹۵۹ء)

دہلی : دوارکا داس شعلہ کی صاجزادی کی شادی کی تقریب میں شرکت۔ (۲۰ ستمبر ۱۹۶۰)

دہلی میں دو ماہ کا قیام ۱۹۶۷ء۔ مزید دو ماہ قیام (مارچ، اپریل ۱۹۷۴)" (۱)

خود قاضی صاحب نے اپنے اسفار کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے :

"میں نے دورانِ قیام یورپ میں فرانس، سوئزرلینڈ، جرمنی، ہالینڈ اور اٹلی کے کچھ حصے دیکھے۔ ان ممالک میں سب سے زیادہ میں فرانس سے واقف ہوں۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد میں نے یہاں کے بہت سے شہر دیکھے۔ جہاں عموماً میں ریسرچ کے سلسلہ میں گیا۔ تقسیم ہند کے بعد میں کراچی، حیدرآباد، سندھ، لاہور اور ڈھاکہ گیا ہوں" (۲)

پروفیسر کلیم الدین احمد نے بطورِ تنقید قاضی صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ وہ مستقلاً تنہا رہتے ہیں اور ملتے جلتے نہیں ہیں۔ اسی لئے ان کے ذہن میں وسعت اور مطالعہ میں تنوع پیدا نہیں ہو پایا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کی شخصیت بھی ایک محدود دائرے میں محصور ہو گئی ہے۔ لکھتے ہیں :

"برسوں پڑے رہنے نے قاضی صاحب کو زبردست محقق بنا دیا لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے انسانوں کی دنیا سے وہ گویا الگ ہو گئے۔ اگر وہ بیرسٹری کا پیشہ کرتے تو بھانت بھانت کے

---

(۱) آج کل (اکتوبر 1985) ص ۳۷

(۲) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر) ص ۲۲

Marfat.com

لوگوں سے انھیں ملنا جلنا پڑتا، دوسروں کی سنتے، اپنی کہتے۔ ملنے جلنے سے ان کی شخصیت پر غیر شعوری طور پر اثر پڑتا۔ اسی طرح دوسروں کی سننے سے، ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے سے، اپنی باتوں کے خلاف دلائل و براہین دیکھنے سے، ان کے سوچنے اور بولنے کے ڈھنگ میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہوتی۔ اسی طرح سے اگر وہ پروفیسر ہوتے تو دوسرے اساتذہ سے ملتے، طالب علموں سے ملتے۔ ایک سے تبادلۂ خیالات کرتے اور دوسروں کو اپنی باتیں سمجھاتے، کمیٹیوں میں کام کرنا پڑتا تو جہاں اپنی باتیں کہتے وہاں دوسروں کی باتیں بھی سنی پڑتیں۔ اگر یہ سب کچھ ہوتا تو قاضی صاحب کی شخصیت پر اثر ضرور پڑتا۔ تنہا رہنے کی وجہ سے انسانوں کی دنیا سے قطعِ تعلق ہو جانے سے ان کی شخصیت ایک خاص رنگ میں رنگ گئی ہے۔ اگر وہ بستر نشیں نہ ہو جاتے اور دوسرے لوگوں کی طرح انھیں بھی تنہا نہیں، مل جل کر روزانہ کام کرنا ہوتا تو شاید ان میں اتنی قطعیت نہ ہوتی۔ وہ تنہا سوچتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو وہ سوچتے ہیں وہی صحیح ہے اور جو اس طرح نہیں سوچتا وہ غلطی پر ہے" (۱)

سیاست: قاضی صاحب بنیادی طور پر نیشلسٹ خیالات کے انسان تھے۔ زمانۂ طالب علمی سے ہی وہ تحریک آزادی میں شامل ہو گئے تھے۔ سیاست سے ان کی دلچسپی مولانا حسرت موہانی کے اردوئے معلّٰی کے مطالعے سے پیدا ہوئی۔ اور اسی کے طفیل وہ کانگریس کے ہم نوا بنے۔ اس کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال" نے بھی قاضی صاحب کو بے حد متاثر کیا۔ "وہ الہلال" کے ہر نئے شمارے کا بے چینی سے انتظار کرتے۔ عملی طور پر وہ سیاست میں ۱۹۲۱ء میں آئے جب انھوں نے تحریکِ ترکِ موالات میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ اسی سال باقاعدہ طور پر کانگریس میں شامل ہو گئے۔ جلد ہی وہ صوبۂ بہار کی کانگریس کمیٹی کی مجلسِ عاملہ کے رکن بن گئے۔ اس زمانہ میں انھوں نے بڑی لگن اور محنت سے پارٹی کا کام کیا۔ انھوں نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بڑے نازک مرحلوں میں کانگریس کی حمایت کی اور اپنے حسن تدبّر اور معاملہ فہمی سے پارٹی کو اندرونی انتشار اور خلفشار سے بچایا۔

سیاست میں اپنی دلچسپی کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے قاضی صاحب فرماتے ہیں۔

میرے والد کے زمانے میں ہفتہ وار آگرہ اخبار آیا کرتا تھا لیکن مجھ یاد نہیں کہ کوئی اخبار

(۱) حرف آخر (معاصر ـ پٹنہ ـ قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۴۲۳

Marfat.com

اردو یا انگریزی کا آتا تھا یا نہیں۔ ان کا جہاں تک میں اندازہ کرسکا ہوں سیاست سے دلچسپی نہ تھی اور میں نے اپنے یہاں کبھی سیاسی گفتگو نہیں سنی۔ ان کی وفات کے چند سال بعد میں نے حسرت موہانی کے ماہنامے اردوئے معلٰی کی پرانی جلدیں منگوائیں۔ غرض تو یہ تھی کہ اس کے ادبی مضامین پڑھے جائیں۔ لیکن ان کے ساتھ ان میں جو سیاسی مضامین تھے وہ بھی نظر سے گزرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں پکا کانگریسی بن گیا۔ اور ان مسلمانوں کو جو کانگریس کی مخالفت کرتے تھے، برا سمجھنے لگا۔ اس زمانے میں میں حسرت کے علاوہ مظہر الحق، محمد علی اور ابو الکلام آزاد کے مداحوں میں تھا۔ الہلال کے نئے شمارے کا جس بے چینی سے انتظار کرتا تھا وہ اب تک یاد ہے"۔(۱)

قاضی صاحب سب سے پہلے کانگریس کے ۳۴ ویں اجلاس میں شریک ہوئے جو ۱۹۱۸ء میں دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ اس کی صدارت کے فرائض پنڈت مدن موہن مالویہ نے انجام دیئے تھے۔ یہ اجلاس کانگریس کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب پہلی عالمگیر جنگ جاری تھی اور اپنے فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہونے والی تھی۔ ہندوستان کے تئیں حکومتِ برطانیہ کے رویہ میں واضح تبدیلی نظر آرہی تھی۔ اگرچہ اس نے قانون کا سہارا لے کر اہلِ ہند پر اپنے ظلم و تشدد کا شکنجہ سخت کر دیا تھا لیکن بایں ہمہ یہ بات عیاں ہوتی جارہی تھی کہ وہ ہندوستانی باشندوں کی متحدہ قوت سے خائف ہے۔ اور یہ کہ اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ ادھر ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان معاہدہ ہو چکا تھا جو 'میثاقِ لکھنؤ' کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے ثابت کر دیا تھا کہ اختلافات کے باوجود بنیادی مسائل کے حل کرنے میں پوری ہندوستانی قوم ایک ہے اور ہندوستان کی آزادی کے معاملے میں کسی قسم کی بھی سودے بازی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی سے گھبرا کر جون ۱۹۱۸ء میں مسٹر مانٹیگو، جو اس وقت حکومتِ برطانیہ میں وزیر ہند تھے اور لارڈ چیمسفورڈ جو اس وقت وائسرائے ہند کے منصب پر متمکن تھے، دونوں نے مشترکہ طور سے ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے متعلق رپورٹ پیش کی جس میں موجودہ انتظامیہ اور سرکاری قوانین میں نرمی برتنے کے سلسلہ میں چند در چند تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ اس میں ہندوستان کو ایک خود مختار ریاست بنانے کی بات بھی کہی گئی تھی۔ بظاہر یہ اصلاحات بڑی خوش آئند تھیں، لیکن ان کا جب عمیق مطالعہ کیا گیا تو محسوس

(۱) (معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۸

Marfat.com

ہوا کہ ان کے پسِ پردہ ہندوستانی عوام کو محض بے وقوف بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ کانگریس کے رہنماؤں نے ان اصلاحات کو ناکافی بتا کر مسترد کر دیا۔ البتہ چند بزرگ رہنماؤں نے، جن کی قیادت سر سریندر ناتھ بنرجی کر رہے تھے، انھیں وقتی طور پر تسلیم کر لینے کا مشورہ دیا۔ ان اصلاحات پر غور وخوض کرنے کے لئے بمبئی میں کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس مسٹر حسن امام کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں کافی بحث و تمحیص ہوئی اور بالآخر متفقہ طور پر ان اصلاحات کو کانگریس نے یکسر نامنظور کر دیا۔ جو حضرات ابتدا ہی سے اصلاحات کو تسلیم کر لینے کے حق میں تھے انھوں نے اس اجلاس میں شرکت نہیں کی۔ ان بزرگ رہنماؤں نے کانگریس سے ناراض ہو کر لبرل پارٹی (LIBERAL PARTY) کے نام سے علیٰحدہ تنظیم بنالی۔

برصغیر کی تاریخ کے اس نازک موڑ پر کانگریس کے اجلاس کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ حسنِ اتفاق سے انہی دنوں دہلی میں مسلم لیگ کا بھی اجلاس ہو رہا تھا۔ اس کی صدارت مسٹر اے۔ کے۔ فضلِ حق کر رہے تھے۔ اور استقبالیہ کے صدر ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔

انھوں نے اس موقع پر تاریخ ساز خطبۂ استقبالیہ پڑھا تھا۔ وہ آج بھی ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے۔ اس میں آپ نے حکومت کی حکمت عملی پر سخت الفاظ میں نکتہ چینی کی تھی اور چیمسفورڈ اصلاحات کو ہندوستانی قوم کے ساتھ دھوکا قرار دیا تھا۔ حکومت وقت اس خطبہ کے تیر ونشتر کو برداشت نہ کر سکی۔ اس نے خصوصی احکام جاری کر کے اسے ضبط کر لیا تھا۔

قاضی صاحب نے کانگریس کے مذکورہ بالا اجلاس میں شرکت کی تھی۔ یہاں انھیں ملک کے سرکردہ رہنماؤں کی تقریریں سننے اور ان کے افکارِ عالیہ سے واقفیت حاصل کرنے اور ان سے براہ راست مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ کانگریس کے اس اجلاس کے استقبالیہ کے صدر حکیم اجمل خاں صاحب تھے۔ آپ کا خطبۂ استقبالیہ جہاں سیاست پر آپ کی غیر معمولی گرفت اور حالات حاضرہ کی تفہیم کی بہترین مثال تھا وہیں اردو انشا پردازی اور نثری ادب کا بہترین نمونہ بھی تھا۔ اس کی تفصیل خود قاضی صاحب نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

میں کالج میں تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس دہلی میں جس کے صدر پنڈت مدن موہن مالوی تھے، ایک تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا۔ استقبالی کمیٹی کے صدر حکیم اجمل خاں

Marfat.com

نے۱۴۸۵۹۳۶۱ اپنے خطبہ میں مونٹیگو چیمسفورڈ اسکیم پر فارسی کے یہ اشعار چسپاں کئے تھے :

ایں استرِ لگدزن بابا از آنِ من — ویں گربۂ مصاحب بابا از آن تو

از صحنِ خانہ تا لبِ بام از آنِ من — وز سقفِ خانہ تا بثریا از آنِ تو(۱)

اس کے بعد قاضی صاحب کانگریس کے باقاعدہ ممبر بن گئے اور سیاسی تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے۔۱۹۲۱ء میں جب کانگریس نے حکومتِ وقت سے عدم تعاون کی تحریک شروع کی تو قاضی صاحب نے اس میں بھی عملی طور پر حصہ لیا اور خود کانگریس میں جو چند سرکردہ لیڈر اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ان کو اپنے حسنِ تدبیر سے زیر کیا۔اس طرح ہر لحاظ سے اس تحریک کو کامیاب کرنے کی کوشش کی۔اس سلسلہ میں خود قاضی صاحب فرماتے ہیں :

"میرے گریجویٹ ہو جانے کے بعد انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے ایک خاص اجلاس میں جو کلکتہ میں ہوا تھا اور جس کے صدر لالہ لاجپت رائے تھے، ترکِ موالات کے متعلق تجویز منظور کی۔اس کے بعد پراونشیل کانگریس کمیٹی کے عہدہ داروں اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبروں کا انتخاب درپیش تھا۔اس وقت جو لوگ اس کمیٹی پر قابض تھے، ترکِ موالات کے مخالف تھے۔اس زمانے میں اس کے صدر ڈاکٹر سچد انند سنہا اور سکریٹری چندر بنسی سہائے بیرسٹر تھے۔چند مسلم نوجوان جو کانگریس میں نئے نئے شریک ہوئے تھے، یہ چاہتے تھے کہ کمیٹی مخالفین ترکِ موالات کے قبضہ میں نہ رہے اور آل انڈیا کانگریس میں بہار کی طرف سے وہ لوگ جائیں جو اس تحریک کے موافق ہیں۔اس وقت کوئی شخص جو ایک خاص عمر سے کم کا نہ ہو، دس روپے ادا کر کے پراونشیل کانگریس کمیٹی کا رکن ہو سکتا تھا۔بہت سے مسلمان اس کے ممبر ہو گئے۔اور جب انتخاب ہوا تو ایک شخص بھی، جو تحریک کا مخالف تھا، نہ عہدہ دار رہا نہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ممبر ہوا۔میں خود پراونشیل کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ اور آل انڈیا

---

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۸

حکیم اجمل خاں صاحب نے جو اشعار نقل کئے ہیں وہ میلی خراسانی کے ہیں۔ان میں شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ اپنے باپ کے ترکے میں سے ایک بھائی زیادہ سے زیادہ حصہ لے لینا چاہتا ہے اور دوسرے بھائی کے حصہ میں بہت کم چھوڑتا ہے لیکن اس کا ذکر اس انداز سے کرتا ہے گویا اس کے حصہ میں کچھ نہیں آیا اور سب کچھ دوسرے بھائی کو دیدیا۔

کانگریس کمیٹی کا رکن منتخب ہوا۔ اس زمانے میں ابو الکلام آزاد رانچی میں رہتے تھے۔ وہ اس زمانے میں آل انڈیا کانگریس کے رکن نہ تھے۔ وہ پہلی بار ہم لوگوں کی وجہ سے اس کے رکن ہوئے...

اصل یہ ہے کہ مخالفین تحریک کو جو پراونشیل کانگریس کمیٹی پر قابض تھے یہ وہم بھی نہ تھا کہ ہم لوگ انھیں اس طرح نکال پھینکیں گے۔ ورنہ ان کا مقابلہ ہم لوگوں کے لئے اتنا آسان نہ ہوتا" (۱)

ان تمام باتوں کے باوجود کانگریس میں قاضی صاحب کے تجربے کچھ زیادہ اچھے نہیں رہے۔ ان کو اکثریت کے بعض افراد کے رویے سے مایوسی ہوئی۔ انھیں احساس ہوا کہ یہ لوگ اقلیت کے فرقے کے ساتھ کسی بھی مرحلہ پر انصاف نہیں کر سکتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلم فرقے کے افراد اصلاً غیر ملکی ہیں اور باہر سے آکر ہندوستان میں حکمراں بن گئے اور صدیوں تک ہندوؤں کو دبائے رکھا۔ لہٰذا ان کے دلوں میں انتقام کا جذبہ موجیں مار رہا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی اکثریت کے بل پر فرقہ وارانہ ذہنیت کے ساتھ کانگریس پارٹی کو چلانا چاہتے ہیں۔ یہ خیال ان کے ذہن میں پختگی سے بیٹھ گیا چنانچہ ذہنی طور پر وہ کانگریس سے دور ہوتے چلے گئے۔ یہ دوری روز بروز بڑھتی گئی اور ایک دن وہ بھی آیا جب انھوں نے کانگریس سے استعفیٰ دے کر اس سے ہمیشہ کے لئے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ اور کانگریسی رہنماؤں بالخصوص گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابو الکلام آزاد کے سخت ترین مخالف بن گئے۔ کانگریس سے اپنی علیٰحدگی کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے قاضی صاحب فرماتے ہیں :

"میں کانگریس سے علیٰحدہ اس لئے ہوا کہ بتدریج مجھ پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ہندوؤں میں ایک بڑی جماعت ایسی ہے جو یہ فراموش نہ کر سکی ہے کہ مسلمانوں نے ان پر صدیوں حکومت کی ہے اور ان پر مظالم ہوئے ہیں۔ میں یورپ سے ہندوستان واپس آیا تو جو کچھ ہوتا گیا اس سے یہ بات واضح تر ہوتی گئی" (۲)

انگلستان سے تعلیم حاصل کر کے جب آپ وطن واپس تشریف لائے تو اعلیٰ سیاسی شعور

---

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۸-۹

(۲) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۹-۱۰

Marfat.com

رکھنے کے باوجود کافی عرصہ تک عملی سیاست سے کنارہ کش رہے۔ لیکن احباب اور مخلصین کے اصرار پر ایک بار پھر آپ کو سیاست کے میدان میں قدم رکھنا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس کی کچھ غلطیوں اور ناعاقبت اندیشیوں کے باعث مسلم لیگ نے از سر نو طاقت پکڑ لی تھی۔ قاضی صاحب کانگریس سے بد ظن ہو کر پہلے ہی اس سے کنارہ کشی اختیار کر چکے تھے۔ اب انھیں مسلم لیگ میں سنہری کرن نظر آئی۔ للہٰذا وہ لوگوں کے اصرار پر مسلم لیگ سے وابستہ ہو گئے اور صوبائی مسلم لیگ کے رکن بن گئے۔ جناب سید انیس الرحمٰن نے اپنے ایک مضمون "قاضی عبدالودود اور سیاست" میں قاضی صاحب کی سیاسی سرگرمیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مسلم لیگ میں آپ کی شمولیت اور اس کے پس منظر کی تفصیلات بتاتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

"کانگریسی حکومتوں کی کارگزاریوں، اردو ہندی کے قضیے اور فرقہ وارانہ جھگڑوں نے قاضی عبدالودود میں پھر تحریک پیدا کی۔ وہ مسلم لیگ کے بے حد قریب ہو گئے۔ پھر چند لیگی رہنماؤں نے جب قاضی عبدالودود کو مسلم لیگ میں شرکت کی دعوت دی تو وہ اسے رد نہ کر سکے۔ انھوں نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن صوبہ بہار کی مسلم لیگ میں ان دنوں دو اہم گروپ تھے۔ قاضی عبدالودود منحرف گروپ میں شریک ہوئے جس کی سربراہی مسٹر عبدالعزیز کر رہے تھے۔ اس گروپ میں ان کے دوسرے رفقاء میں مسٹر محمد نعمان، محمد ضمیر الدین، قاضی محمد سعید، شاہ جعفر حسین اور مسٹر نظیر حیدر پیش پیش تھے۔ دوسرا برسرِ اقتدار گروپ خان بہادر نواب محمد اسمٰعیل کا تھا جو بہار صوبائی مسلم لیگ کے صدر رہے تھے۔ ان کے ساتھیوں میں سید جعفر امام، سردار لطیف الرحمٰن، سید بدرالدین احمد، مسٹر حسین امام اور مسٹر مظہر امام بہت نمایاں تھے۔

قاضی عبدالودود اس زمانہ میں کافی سرگرم عمل ہو گئے۔ اہم مشوروں میں برابر شریک رہتے تھے۔ اور نقشہ کار کو ترتیب دیتے تھے۔ انھوں نے فرضی ناموں کے تحت کئی مضامین بھی لکھے جو معاصر "صدائے عام" پٹنہ میں شائع ہوتے رہے۔ اس روزنامہ کے کئی اداریے بھی انھوں نے لکھے۔ یہ سارے مقالے اور اداریے بڑے وقیع، اہم اور موثر تھے۔ اور یہ سبھی عصری سیاسی مسائل پر ہوتے تھے" (۱)

---

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۴۱۳۔۴۱۴

Marfat.com

خود قاضی صاحب نے مسلم لیگ میں اپنی شرکت کی جو وجہ بتائی ہے وہ کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں ہے۔آپ نے صرف اتنا بتایا ہے کہ مسلم لیگ پر خان بہادر اور خان صاحب نما حضرات قابض تھے جو اس کے جمہوری کردار کو مجروح کر رہے تھے۔ قاضی صاحب ان کے اثر کو توڑنے کی غرض سے مسلم لیگ کے اس گروپ میں شامل ہوئے جو مذکورہ حضرات کے خلاف تھا۔لیکن یہ تو صرف مسلم لیگ کے ایک مخصوص گروپ میں شامل ہونے کی بات تھی، خود مسلم لیگ کی تنظیم سے من حیث الجماعت وابستہ ہونے کے کیا محرکات تھے۔ قاضی صاحب کے مذکورہ بیان سے اس پر روشنی نہیں پڑتی، نہ یہ بتایا گیا کہ وہ کیا کیا توقعات لے کر اس میں شامل ہوئے تھے اور وہ اسے کس نہج پر لے جانا چاہتے تھے۔اس سلسلہ میں قاضی صاحب کا مختصر سا بیان ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں :

"میں یورپ سے ہندوستان واپس آیا تو جو کچھ ہوتا گیا اس سے یہ بات واضح تر ہوتی گئی۔ میں سیاست سے الگ رہا۔ لیکن جب مسلم لیگ زور آور ہوئی تو کچھ لوگ میرے پاس آئے اور شاکی ہوئے کہ صوبے کی مسلم لیگ پر وہ لوگ قابض ہیں جن کی ذہنیت ان لوگوں کی تھی جو خان بہادر یا خان صاحب ہوا کرتے تھے۔ میں ان لوگوں کے ساتھ ہوا۔ کامیابی جزوی ہوئی حالاں کہ مسلم لیگیوں کی اکثریت ان لوگوں کے ساتھ تھی۔ وجہ یہ کہ مرکز والے نہ جانے کس غلط فہمی کی بناء پر ان کی ہر خلاف قاعدہ بات کو صحیح قرار دیتے تھے۔ میں جلد ان لوگوں سے الگ ہو گیا" (۱)

اس طرح مسلم لیگ میں بھی انھیں مایوسی کے سوا کچھ اور نہ ملا۔ اس سے وہ اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ ہمیشہ کے لئے سیاست سے علیحٰدگی اختیار کر لی۔ حتیٰ کہ کسی الیکشن میں انھوں نے اپنے حق رائے دہی کا بھی استعمال نہیں کیا۔ البتہ صرف ایک بار محض ایک کانگریسی امیدوار کے خلاف انھوں نے الیکشن میں ایک کیمونسٹ امیدوار کی حمایت کی تھی۔ حالانکہ نظریاتی طور پر وہ مکمل کیمونزم کے بھی حامی نہیں ہیں۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :

"میں جلد ان لوگوں (مسلم لیگیوں) سے الگ ہو گیا۔ اس وقت سے اب تک میں سیاست سے الگ ہوں۔ اس حد تک کہ آج تک میں نے کسی الیکشن میں ووٹ نہیں دیا۔ مگر ایک الیکشن میں میں نے ایک کیمونسٹ کی کانگریسی امیدوار کے مقابلے

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۱۰

Marfat.com

میں مدد کی تھی۔ اس کی وجہ خاص یہ تھی کہ مجھے اس پر حیرت تھی کہ کانگریسی امیدوار یکایک کانگریسی کس طرح بن گیا'' (۱)

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی جماعتیں ایک مخصوص انداز سے کام کرتی ہیں۔ وہاں اصول کے مقابلے میں ہنگامی تقاضوں اور وقتی مصالح کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اس میں کسی ایک جماعت کی تخصیص نہیں۔ اور ہم بہ نظر عمیق دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ اس طریق کار سے مفر بھی نہیں۔ یہ سیاست کا خارزار ہے ہی ایسا جہاں دامن بچا کر چلنا مشکل ہوتا ہے۔ قاضی صاحب جن اقدار کی زندگی بھر پاسداری کرتے رہے اور جن اصولوں پر سختی سے کاربند رہے ان کے باعث ان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ کسی بھی سیاسی پارٹی سے زیادہ عرصہ تک وابستہ رہتے۔ لہٰذا وہ زیادہ دنوں تک نہ کانگریس کے ساتھ رہ سکے اور نہ مسلم لیگ کے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر وہ ملکی سیاست میں حصہ لیتے رہتے تو یقیناً ہندوستان کے سرکردہ رہنماؤں میں شامل ہوتے اور وزارت و سفارت ان کے قدم چومتی۔ لیکن انھوں نے بے اصولی برداشت نہیں کی۔ انھوں نے وزارت و سفارت کے مقابلے میں بادشاہت کو ترجیح دی۔ وہ تمام عمر اقلیم ادب کی بادشاہت کرتے رہے۔

اردو تحریک: قاضی صاحب اردو زبان و ادب کی ترقی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ اور اس سلسلہ میں جتنی بھی تحریکیں چلائی گئیں، ان میں قاضی صاحب نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ اسی ضمن میں وہ انجمن ترقی اردو سے بھی وابستہ رہے۔ ابتدائی زمانہ میں وہ بڑے فعال تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی سرگرمیوں میں کمی آتی گئی اور ایک وقت وہ بھی آگیا جب وہ اپنی تمام سرگرمیوں کو بالائے طاق رکھ کر گوشۂ عافیت میں جاگزیں ہو گئے۔ اب اس تحریک سے ان کی وابستگی عملی سے زیادہ نظری رہ گئی۔ بہار میں اپنے طالب علمی کے زمانے میں چند اصحاب کے تعاون سے اردو کی ترقی کے لئے ایک انجمن بنائی تھی۔ اس کا نام انھوں نے 'انجمن ترقی اردو بہار' تجویز کیا تھا۔ وہ خود ہی اس کے اعزازی سکریٹری تھے اور بہار کی مشہور ادبی اور سماجی شخصیت لیڈی انیس امام، اس کی صدر تھیں۔ جب قاضی صاحب تعلیم کی غرض سے یورپ چلے گئے تو یہ انجمن کسی قدر بے جان ہو گئی۔ وہاں سے واپسی کے بعد آپ نے اسے از سر نو متحرک بنایا اور اس پلیٹ فارم سے اردو کی بقا اور تحفظ کے لئے جدوجہد کی۔ ۱۹۳۷ء میں ہندوستانی زبان کے

---

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۱۰

Marfat.com

سلسلہ میں ڈاکٹر راجندر پرشاد اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کے درمیان معاہدہ ہوا تھا۔ اس موقع پر قاضی صاحب نے کلیدی رول ادا کیا تھا۔ افسوس کہ اس معاہدہ پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ اس میں دونوں جانب سے کچھ ایسے افراد نے جو اس بنیادی مسئلہ کو کسی طرح بھی حل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے، تعمیر کی آڑ میں تخریبی کارروائی کی اور اس بیل کو منڈھے چڑھنے نہ دیا۔ قاضی صاحب کو اس کا کافی صدمہ ہوا۔ اس پورے واقعہ کی تفصیل قاضی صاحب نے بڑے دکھ بھرے انداز میں بیان کی ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ سے ان کے دل کا کرب ٹپک رہا ہے۔ فرماتے ہیں :

عنفوانِ شباب میں میں اور چند اصحاب (سید محمود شیر، زبیر صدیقی، فضل علی خاں، وغیرہ) نے ایک انجمن بنام انجمن ترقی اردو قائم کی تھی۔ انگلستان سے واپسی کے بعد میری تحریک پر یہ پراونشل انجمن بن گئی۔ میں اس کا سکریٹری ہوا اور لیڈی انیس امام صدر۔ یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے ایک تجویز منظور کی کہ مدارس میں علوم کی تعلیم ہندوستانی زبان میں ہو۔ اس سے اردو بولنے والوں کو اندیشہ ہوا کہ ہندوستانی کے نام سے ہندی رائج کی جائے گی۔ حامیانِ اردو نے ایک جلسہ کیا۔ اور اس معاملے کو انجمن ترقی اردو کے سپرد کیا۔ میں نے اس سلسلہ میں انجمن کے سکریٹری ڈاکٹر عبدالحق سے مراسلت کی۔ یہ طے پایا کہ مرکزی انجمن ایک کمیٹی قائم کرے اور اس کا جلسہ پٹنہ میں ہو اور وہ اس پر غور کرے۔ اس سلسلہ میں جو مراسلت ہوئی تھی، اس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ڈاکٹر عبدالحق ہندوستانی کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہ علمی زبان ہو سکے۔ میں نے صوبۂ بہار میں جو اردو ہندی کا جھگڑا ہوا تھا۔ اس کے متعلق معلومات فراہم کر کے انھیں بھیجی تھیں۔ جو کچھ میں نے، اور کچھ دوسروں نے اکٹھا کیے تھے، ڈاکٹر عبدالحق نے اپنے نام سے ایک کتابچہ چھپوایا جس میں اپنی طرف سے وہ معلومات پیش کیں اور کتابچہ کمیٹی کے ارکان کو بھیجا۔ میں نے ڈاکٹر راجندر پرشاد سے اس سلسلہ میں ملاقات کی تھی۔ اور یہ استدعا کی تھی کہ کمیٹی کے ممبروں سے ملیں۔ انھوں نے کہا کہ ضرور ملتا لیکن گاندھی جی کے یہاں جارہا ہوں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں ایسی زبان لکھ سکتا ہوں جو اردو والوں اور ہندی والوں، دونوں کے لے قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ بعد کو انھوں نے مجھے بلا بھیجا اور کہا کہ

Marfat.com

گاندھی جی کو یہاں کے معاملات کی اطلاع ہو گئی ہے اور انھوں نے مجھے تار دیا ہے کہ میں کمیٹی کے ممبروں سے ملوں۔ اس کے لئے ایک وقت مقرر ہو گیا۔ کمیٹی کا جلسہ ہوا تو ڈاکٹر عبدالحق نے اس کی صدارت کے لئے سید سلیمان ندوی کا نام پیش کیا اور مجھ سے کہا کہ اغراضِ جلسہ سے ارکان کمیٹی کو مطلع کروں۔ میری تقریر کے بعد پروفیسر مجیب نے جو ایک رکن تھے، کہا کہ یہ تو کوئی بات ہی نہیں۔ میں نے جواباً کہا کہ ڈاکٹر عبدالحق کے کتابچے سے آپ کو یہ سب معلوم ہو چکا تھا۔ ان امور کی کچھ اہمیت ہی نہیں تو پٹنہ آنے کی زحمت ہی کیوں گوارا کی۔ جلسہ صبح کے وقت ہوا تھا اور ڈاکٹر راجندر پرشاد سے ملنے کا وقت دوسرے دن مقرر تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق نے کہا کہ ہم لوگوں کو اس کے لئے تیار رہنا چاہیے اور کچھ تجویزیں منظور کر لینی چاہئیں جو ان کے سامنے پیش کی جا سکیں۔ بغیر اس کے کہ کافی غور و فکر سے کام لیا جائے۔ چند تجویزیں منظور ہو گئیں۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد آئے تو ان کے ساتھ بلدیو سہائے (جنھوں نے سنڈیکیٹ سے متعلق تجویز پیش کی تھی اور جو بعد کو ایڈوکیٹ جنرل ہوئے) اور ایک صاحب جو اس زمانے میں پراونشیل کانگریس کمیٹی کے صدر تھے، ان کے ساتھ تھے۔ کمیٹی کی منظور کردہ تجویزیں میرے پاس تھیں۔ میں نے انھیں ڈاکٹر عبدالحق کے حوالے کیا کہ وہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو دکھائیں۔ انھوں نے آہستہ سے کہا کہ ان سے 'وکیلانہ' گفتگو کرنی چاہئے۔ اس کے بعد ہی ایک مسودہ غلام السیدین نے جو کمیٹی کے ایک رکن تھے، نکالا۔ ڈاکٹر عبدالحق کو دکھایا۔ انھوں نے مجھے دیکھنے کو دیا۔ اس کے بعد یہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو دیا گیا۔ انھوں نے سرسری طور سے اسے دیکھا اور اس کے بعد اس پر ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر عبدالحق کے دستخط ہو گئے۔ یہی راجندر پرشاد عبدالحق پیکٹ ہے" (۱)

اس معاہدے کے بموجب:

"ہندوستان کی زبان ہندوستانی قرار پائی جو ہندی اور اردو دونوں رسم الخطوں میں لکھی جائے گی۔ ہندی میں اگر کوئی علمی اصطلاح آئی تو اس کے ساتھ ہی قوسین میں اس کا اردو بدل ہو گا اور اردو کی تحریر میں ہندی بدل۔ میں نے کہا کہ اس معاہدے کا تعلق سارے ہندوستان سے ہے۔ بہار میں جو معاملہ درپیش ہے اس کا کیا ہو گا۔

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۱۳۔۱۴

Marfat.com

بلدیو سہائے نے کہا کہ اردو والوں کے مفاد کے تحفظ کے لئے انجمن کی پراونشیل شاخ جو باتیں پیش کرے گی منظور کرلی جائیں گی۔ یہ معاہدہ انجمن ترقی اردو کی مقرر کردہ کمیٹی کے سامنے آنے سے قبل ہی وجود میں آگیا اور کمیٹی کی منظور کردہ تجویزیں ڈاکٹر راجندر پرشاد کو دکھائی بھی نہیں گئیں۔ غلام السیدین اور پروفیسر مجیب ڈاکٹر محمود کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے جو اس زمانے میں صوبۂ بہار کے وزیر تعلیم تھے۔ مجھے یقین ہے کہ معاہدے کا مسودہ ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر عبدالحق اور بعض دیگر اصحاب نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ اس کی خبر اگر نہ تھی تو مجھے اور بعض دوسرے ارکان کمیٹی کو۔ اس کے بعد سنڈیکیٹ یا وزیر تعلیم نے ایک ہندوستانی کمیٹی بنائی جس کے صدر سچد انند سنہا، اور ڈاکٹر عبدالحق اس کے ایک رکن مقرر ہوئے۔ صوبہ کی انجمن ترقی اردو کا کوئی رکن اس میں نہیں لیا گیا۔ سنہا کمیٹی نے باالتفاق ڈاکٹر عبدالحق جو فیصلے کئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جامع اللغات اور فرہنگِ آصفیہ میں جو ہندی الفاظ ہیں اور ناگری پرچارنی سبھا کی شبد ساگر میں جو عربی فارسی الفاظ ہیں، ہندوستانی سمجھے جائیں" (۱)

لیکن یہ سب کچھ فریب سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ وعدہ خلافی ہوئی اور معاہدے کی دھجیاں بکھیر دی گئیں۔ اور بقول قاضی صاحب ایسے ایسے الفاظ ہندوستانی قرار دیے جانے لگے جن کا تعلق اردو سے کسی طرح کا بھی نہ تھا اور نہ کسی قیمت پر بھی اردو داں طبقہ انھیں اپنانے کے لئے تیار ہو سکتا تھا۔ اور بلدیو سہائے جی نے انجمن ترقی اردو صوبۂ بہار سے جو وعدے کئے تھے۔ وہ صرف سبز باغ دکھانے کے مترادف نکلے۔ اس کے بعد اردو کے حامیوں میں برہمی پھیلنی ایک فطری بات تھی۔ چنانچہ صوبائی انجمن ترقی اردو کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا جس میں اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے غور و خوض کیا گیا۔ اس میں متفقہ طور پر صورت حال کو مایوس کن اور اردو کے لئے جاں گسل قرار دیا گیا۔ اور ایک قرارداد کی رو' سے صوبے کی انجمن کی جانب سے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس کا کام ایسے الفاظ کے متعلق حتمی طور پر فیصلہ کرنا تھا جن کو ہندوستانی قرار دیدیا گیا تھا۔ قاضی عبدالودود بھی اس کمیٹی کے ایک رکن تھے۔ بلکہ اگر آپ کو رکنِ رکین کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ آپ نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ناگری پرچارنی سبھا کی تیار

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۱۴۔ ۱۵

Marfat.com

کردہ شبد ساگر سے ایسے بے شمار الفاظ منتخب کیے جن کا دور کا واسطہ بھی اردو سے نہیں تھا اور جو کسی طرح بھی اردو والوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتے تھے۔ اس سلسلہ میں جب فریقِ ثانی سے رجوع کیا گیا تو بات بننے کے بجائے بگڑ گئی۔ اس کے نتیجہ میں راجندر پرشاد عبدالحق پیکٹ سرد خانے کی زینت بن گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کی روداد خود قاضی صاحب کے الفاظ میں :

"صوبے کی انجمن کی طرف سے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جو ان الفاظ کے متعلق جو فیصلۂ مذکور کی رو سے ہندوستانی قرار پاتے ہیں، اپنی رپورٹ دے۔ میں نے دونوں کتابوں سے بہت سے ایسے الفاظ نکالے جو اردو والوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ تماشا یہ کہ سنہا کمیٹی کے متعدد منظور کردہ الفاظ پر مرکزی انجمن کے اخبار میں بھی اعتراض ہو رہے تھے۔ یہ رپورٹ چھپی اور اسی زمانے میں یا اس کے بعد الٰہ آباد کے ایک ماہنامے میں بھی شائع ہوئی۔ پٹنہ میں بھی کچھ لوگ تھے جنھوں نے اس موقع سے خالی فائدہ اٹھانا چاہا۔ ڈاکٹر عبدالحق کو اطلاع دی کہ کانفرنس کی اصل غرض آپ کے خلاف ملامت کی تجویز منظور کرانی ہے۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ ان لوگوں نے اسے ناکام بنانے کے لئے ان سے ہزاروں روپے وصول کیے۔ قاضی محمد سعید مجلس استقبالیہ اور صوبے کی انجمن کے سکریٹری تھے۔ ان لوگوں نے ان کا اعتماد حاصل کیا اور مجلس استقبالیہ کے رکن بنانے شروع کیے۔ مجلس استقبالیہ کا صدر چننے کے لئے ارکان مجلس کا جلسہ تھا۔ میں اس میں شرکت کے لئے گیا۔ مجھے دیکھتے ہی مسعود عالم ندوی نے کہا کہ آپ کو صدر ہونا چاہئے۔ میں نے انکار کیا۔ یہ بظاہر موافق تھے۔ لیکن دراصل مخالف۔ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی کی ایک کتاب پر مختار الدین احمد صاحب نے تبصرہ لکھا تھا اور ان کی بہت سی غلطیوں کی نشاندہی کی تھی۔ اس سلسلہ میں ان سے بھی کچھ غلطیاں ہوئی تھیں۔ اور ان کا لہجہ قابلِ اعتراض تھا۔ میرے ان کے تعلقات تھے اور مسعود عالم ندوی وغیرہ خلاف واقعہ یہ سمجھے کہ تبصرہ میرا لکھایا لکھوایا ہوا ہے۔ یہ لوگ اس بناء پر مجھ سے عداوت رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ صدارت کے لئے میرا نام پیش ہو اور مجھے شکست دی جائے" (۱)

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۱۵۔۱۶

Marfat.com

اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی داستان اس سے بھی زیادہ دردناک اور عبرت خیز ہے۔ اس زمانہ میں انجمن ترقی اردو صوبۂ بہار کے صدر قاضی عبدالودود تھے۔ انھیں زیر کرنے کے لئے طرح طرح کی چالیں چلی گئیں۔ انجمن نے خصوصی اختیارات کا استعمال کر کے طلباء کو بڑی تعداد میں شرکت کی مراعات دیں۔ جن کے طفیل بہت سے طالب علم استقبالیہ کمیٹی کے ممبر بن گئے اور مضامین کمیٹی کے ارکان کا جب انتخاب ہوا تو باوجود انتہائی جدو جہد کے قاضی صاحب کے مخالف گروپ کو شکستِ فاش ہوئی اور اس مخالف جماعت کا ایک فرد بھی اس کمیٹی کا رکن منتخب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کے صدارت کے فرائض مولانا ظفر علی خاں نے انجام دیے جو خاص طور سے اسی مقصد سے لاہور سے تشریف لائے تھے۔ استقبالیہ خطبہ میں قاضی صاحب کی مرضی کے خلاف اردو اور راجندر پرشاد عبدالحق پیکٹ کے لئے مولوی عبد الحق کی خدمات کو سراہا گیا تھا۔ قاضی صاحب کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی۔ اس پر مستزاد یہ کہ مضامین کمیٹی کے لئے مولانا ظفر علی نے ایک تجویز تیار کی جس میں بابائے اردو کی خدمات کو سراہا گیا تھا۔ مولانا ظفر علی چاہتے تھے کہ مکمل اجلاس میں یہ تجویز قاضی عبدالودود پیش کریں۔ لیکن قاضی صاحب نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس میں سنہا کمیٹی کے فیصلوں پر سخت الفاظ میں تنقید کی گئی تھی۔ اس کے بعد ناگپور میں مرکزی انجمن ترقی اردو ہند کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اور باتوں کے علاوہ سنہا کمیٹی کے فیصلوں پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا تھا۔ جب ڈاکٹر سنہا کو ناگپور کے اجلاس کے فیصلوں کی اطلاع ہوئی تو انھیں سخت تعجب ہوا کہ جو امور خود بابائے اردو کی ایماء پر ان کی مرضی سے طے پائے تھے، ان کی منعقدہ کانفرنس نے نہ صرف انھیں ناپسند کیا بلکہ یک سر نامنظور بھی کر دیا۔ اس طرح قاضی عبدالودود کی رہنمائی میں صوبۂ بہار کی انجمن ترقی اردو کی معرفت چلائی گئی اردو تحریک ملکی سیاست اور اندرونی خلفشار کا شکار ہو گئی۔

شاعری: قاضی صاحب شاعری کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ وہ محقق کے ساتھ اعلیٰ پایہ کے ناقد بھی تھے۔ وہ شاعری کے بہت اچھے پارکھ بھی تھے۔ ان کی پسند کا معیار بہت اعلیٰ تھا۔ وہ دوسرے درجہ کی کسی چیز کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ وہ مشاعروں میں بہت کم جاتے تھے۔ اس کے دو اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ بہت کم آمیز تھے۔ وہ اپنے مطالعے میں اتنے

Marfat.com

منہمک رہتے تھے کہ اس قسم کے موقعوں یا تقریبات کے لئے وقت نہیں نکال پاتے تھے۔ دوم یہ کہ وہ اپنے عہد کے شعراء کے کلام کو بہ نظر تحسین نہیں دیکھتے تھے۔ ان کا کلام ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ اس لئے مشاعروں میں شرکت کو وہ تضیع اوقات تصور کرتے تھے۔ پروفیسر مختار الدین احمد کا بیان ہے کہ قاضی صاحب نے اپنی زندگی میں مشکل سے دو تین مشاعروں میں شرکت کی ہوگی۔ وہ نجی محفلوں میں بھی شعراء سے کلام سنانے کی فرمائش نہیں کرتے تھے۔ اور اگر اتفاق سے کسی ایسی محفل میں پھنس جائیں جہاں انھیں شعراء کا کلام سننے پر مجبور ہونا پڑے تو وہ موجود ہوتے ہوئے بھی غیر موجود رہتے۔ ذہنی طور پر وہ کہیں اور چلے جاتے اور حاضرینِ محفل سے بے نیاز اپنی دنیا میں کھو جاتے۔ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں :

"ادبی ذوق رکھنے کے باوجود وہ مشاعروں میں جانا پسند نہیں کرتے اور نہ شاعروں کی اتنی عزت افزائی کرتے ہیں کہ انھیں شعر سننے پر مجبور ہونا پڑے۔ ہاں وہ خود ادبی جلسہ منعقد کر رہے ہوں یا ان کے خاص احباب کسی مشاعرے میں شریک ہو رہے ہوں تو دوسری بات ہے۔ میں نے انھیں صرف دو بار مشاعروں میں شرکت کرتے دیکھا ہے۔ ایک بار ان کے دوست ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے۔ یہ کوئی ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ وہ مشاعرے میں آئے، خاموش بیٹھے رہے اور سگریٹ پیتے رہے۔ دوسری مرتبہ صوبائی انجمن ترقی اردو کی طرف سے انھوں نے اردو کانفرنس منعقد کی تھی۔ آخری دن مشاعرے کا بھی پروگرام تھا۔ مولانا ظفر علی خاں صدارت کے لئے لاہور سے آئے تھے۔ وہ گئے اور خطبۂ صدارت اور کچھ شعراء کو سن کر چلے آئے۔ ایک موقع پر عندلیبؔ شادانی صاحب پٹنہ کالج کے ایک مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے آئے، اور حسبِ معمول قاضی صاحب کے یہاں ٹھہرے۔ میں نے ان سے پوچھا آپ نے شادانی صاحب کو کبھی سنا بھی؟ بولے اس کا موقع نہیں ملا۔ نہ انھوں نے سنانے کی فرمائش کی، نہ میں نے ان سے کچھ کہا۔ یہ اس کے باوجود ہے کہ وہ ان کی شاعری کے مداح ہیں۔ انھوں نے کئی نظمیں اپنے رسالے معاصر میں شائع کی ہیں۔ اسی طرح

Marfat.com

ایک بار ڈاکٹر سچیدا نند سنہا کے یہاں ساغر نظامی آئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ احباب کو چائے پر مدعو کیا اور ساغر صاحب سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی۔ قاضی صاحب موجود تھے۔ دو گھنٹے تک ساغر صاحب شعر سناتے رہے۔ لوگ داد سے چھت اُڑاتے رہے اور قاضی صاحب سگریٹ کا دھواں"(۱)

اسی قسم کا ایک واقعہ جناب سید حسن نے بھی لکھا ہے۔ فرماتے ہیں :

قاضی صاحب شعر و سخن کی مجلسوں میں شاذ و نادر ہی شرکت کرتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھی دائرۂ ادب کے جلسوں میں شعر خوانی کا دور بھی چل جاتا ہے۔ ایسے موقع پر قاضی صاحب اور کلیم صاحب دونوں ہی خاموش رہتے ہیں۔ کسی کا کلام پسند آئے تب بھی داد نہیں دیتے۔ بہت ہوا تو سر کو ہلکی سی جنبش دے دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ دہلی سے غلام ربانی تاباں صاحب مکتبۂ جامعہ ملیہ کے کام سے پٹنہ آئے تھے۔ کلیم صاحب کی ملاقات کو گئے تو انھوں نے شام کو انھیں چائے پر مدعو کیا اور چند اور لوگوں کو بھی شریک کیا۔ قاضی صاحب بھی موجود تھے۔ دس بارہ آدمیوں کی نشست تھی۔ جناب بہاء الدین کلیم (مولف گلستانِ ہزار رنگ) بھی اس صحبت میں موجود تھے۔ ان کے ایک پہلو میں کلیم الدین احمد صاحب اور دوسرے پہلو میں قاضی عبدالودود تشریف رکھتے تھے۔ جب شعر خوانی شروع ہوئی تو بہاء الدین صاحب سے بھی شعر پڑھنے کی فرمائش کی گئی۔ انھوں نے ایک غزل شروع کی۔ ایک شعر کے بعد بولے "شعر سنانے کے لئے دل کیا خاک بڑھے۔ میرے ایک پہلو میں کلیم صاحب ہیں دوسرے میں قاضی صاحب۔ انھوں نے داد دینے کے لئے زبان بھی نہیں ہلائی" (۲)

قاضی صاحب نے زمانہ طالب علمی میں شاعری بھی کی تھی۔ لیکن ان کا مسلسل کلام دستیاب نہیں ہے۔ آپ کے چند متفرق اشعار پروفیسر مختار الدین احمد نے قاضی صاحب سے متعلق اپنے مضمون مشمولہ نقوش (سالنامہ ۱۹۵۷) میں نقل کئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کی طالب علمانہ کوشش ہے۔ ان کا معیار بلند نہیں ہے۔ غالباً اسی لئے بعد میں انھوں نے شاعری کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ فنی اور فکری دونوں اعتبار سے پست

---

(۱) قاضی عبدالودود (نقوش۔ لاہور سالنامہ ۱۹۵۷ء) ص ۳۲۷

(۲) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۲۸۲

Marfat.com

ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

چشمِ شب زندہ دار کو حسرت ۔۔۔ دلِ امیدوار کو حرماں

تھی اسی واسطے یہاں لائی ۔۔۔ زندگی! تجھ سے تھا یہی پیماں؟

کیوں نہ خود کاتبِ تقدیر ہو خنداں مجھ پر ۔۔۔ شوقِ پرواز ہے لیکن پرِ پرواز نہیں

میں شب و روز اگر نہ کراہوں تو کیا کروں ۔۔۔ اک نوبہار ناز کو چاہوں تو کیا کروں

بلبل ہو کہ پروانہ، گل و شمع کے آگے ۔۔۔ یہ سوختنی ہے تو وہ گردن زدنی ہے

مجھے رونے سے منع کرتے ہیں ۔۔۔ یہ بھی اک امر اختیاری ہے؟

سنے جو اسے نیند اس کو نہ آئے ۔۔۔ مرا حال ہے یہ کہانی نہیں ہے

کیا کہہ گیا ایک محرمِ راز؟ ۔۔۔ بلبل نہیں گل ہے نغمہ پرداز

تیرے لئے مجھ سے ہیں ہزاروں ۔۔۔ میرا تو جہاں میں ایک تو ہے

قاضی صاحب کا فرمانا ہے کہ ان میں سے چند اشعار ترجمہ ہیں۔ لیکن انھوں نے ان اشعار کی نشاندہی نہیں کی۔ اور نہ ہی یہ بتایا کہ ان کی اصل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"پروفیسر مختار الدین احمد نے میرے متعلق نقوش میں جو مضمون لکھا تھا اس میں جو میرے اشعار منقول ہیں، ان میں سے کچھ ترجمہ ہیں۔ نہ جانے کیوں انھوں نے یہ بات نہ لکھی۔ شعر اب بھی موزوں کر لیتا ہوں مگر میں شاعر نہیں"(۱)

اسی طرح ۲ر جولائی ۱۹۶۰ء کو جناب دوار کا داس شعلہ کے نام ایک مکتوب میں قاضی صاحب لکھتے ہیں:

"مختار الدین احمد صاحب نے نقوش میں جو شعر میری طرف منسوب کیئے ہیں، وہ نہ جانے انھیں کس طرح ملے۔ مجھے تو بالکل یاد نہیں کہ میں نے انھیں دیے ہوں۔ بہر حال ان

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۱۸

Marfat.com

میں سے کچھ فارسی اشعار کا ترجمہ ہیں اور یہ بات بتانے کے قابل تھی جو انھوں نے نہ لکھی۔ اگر انھوں نے میری زبان سے وہ اشعار سنے تھے تو یقین ہے کہ ساتھ ساتھ میں نے یہ بھی کہہ دیا ہو کہ ترجمہ ہیں۔ میں نے زیادہ شعر نہیں کہے۔ پہلا شعر جو میں نے کہا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے جس وقت یہ شعر موزوں ہوا تھا، میری عمر بارہ، تیرہ برس کی ہو گی۔ فضول سا ہے ؎

ژولیدہ بال کیوں ہو، چہرہ ہے کیوں پریشاں
مرگِ رقیب کی کیا تم نے خبر سنی ہے؟

ادبی زندگی کا آغاز: قاضی صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۱۲ء میں ایک کہانی لکھ کر کیا۔ یہ کہانی 'جذبات حسرت کا مصور' کے فرضی نام سے آگرہ اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ کہانی کے عنوان کا علم نہ ہو سکا۔ خود قاضی صاحب کو بھی اس کا عنوان یاد نہیں رہا۔ چنانچہ اپنے خودنوشت حالات میں وہ اس پر روشنی نہ ڈال سکے۔ فرماتے ہیں:

"عنفوانِ شباب میں میں نے خود رومانی انداز کی ایک کہانی لکھی۔ اس کا عنوان مجھے یاد نہیں۔ یہ آگرہ اخبار میں ایک فرضی نام (جذبات حسرت کا مصور) سے چھپی تھی" (۲)

جناب سید صدرالدین فضا کا فرمانا ہے کہ قاضی صاحب کا پہلا مضمون، آگرہ احوال، کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اپنے مضمون، قاضی صاحب جیسا میں انھیں دیکھ سکا، میں وہ لکھتے ہیں:

"قاضی صاحب کا پہلا مضمون شاید آگرہ احوال، آگرہ اخبار میں شائع ہوا۔ یہ اخبار ان کے والد ماجد علیہ الرحمۃ کے یہاں آیا کرتا تھا۔ مضمون نویسی کا شوق برابر بڑھتا گیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ شوق تحقیق کی طرف لے گیا" (۳)

اس کے برخلاف ڈاکٹر خلیق انجم کی تحقیق کے مطابق قاضی صاحب کا پہلا مضمون ماہنامہ المصباح (پٹنہ) میں اشاعت پذیر ہوا۔ اپنے مضمون "قاضی عبدالودود سے قبل اردو تحقیق اور متنی تنقید" میں آپ فرماتے ہیں:

اب تک کی دستیاب معلومات کے مطابق قاضی عبدالودود کا پہلا مقالہ پٹنے کے ایک

---

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۳۶۴
(۲) ایضا " ص ۲۸
(۳) ایضا " ص ۲۸۸

Marfat.com

رسالے 'المصباح' کے اپریل ۱۹۲۳ء کے شمارے میں شائع ہوا۔
مقالے کا عنوان تھا "ذکر خواجہ امین الدین امینؔ۔ ذکر حضور و سلیم"

"یہ کوئی باقاعدہ مقالہ نہیں تھا۔ علی ابراہیم خاں خلیلؔ نے امینؔ حضورؔ اور سلیمؔ کے بارے میں اپنے تذکرے گلزار ابراہیم میں جو کچھ لکھا تھا، قاضی صاحب نے اسے نقل کر کے مقالے کی شکل دی تھی"(۱)

جناب صفدر امام قادری نے اپنے مرتبہ 'آں کہ قاضی عبدالودود' میں ۱۳۔۱۹۱۲ء کو ہی قاضی صاحب کی ادبی زندگی کا نقطۂ آغاز مانا ہے۔ یہ کوئی ان کی نئی تحقیق نہیں ہے بلکہ قاضی صاحب کے خود نوشت حالات میں 'کون ہوں، کیا ہوں'، کو بنیاد بنا کر ہی ترتیب دیا گیا ہے۔ 'ادبی زندگی' کے عنوان کے تحت آپ لکھتے ہیں:

"۱۳۔۱۹۱۲ء پہلی تخلیق آگرہ میں 'جذباتِ حسرت کے مصورؔ' کے فرضی نام سے پہلا افسانہ شائع ہوا"(۲)

قاضی صاحب کی ادبی زندگی کے آغاز کے سلسلہ میں اوپر جو بیانات نقل کیے گئے، ان سے کوئی بات واضح طور پر یا قطعیت کے ساتھ سامنے نہیں آتی۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مایوسی خود قاضی صاحب کے بیان سے ہوتی ہے۔ ان جیسا بلند پایہ محقق جس نے اپنے مطالعے کی وسعت، نظر کی گہرائی اور سائنٹفک طریقۂ کار اور طرز استدلال سے کتنے ہی پرانے معتقدات کو باطل قرار دیا، کتنے ہی متنازعہ فیہ ادبی مسائل کو اپنی تحقیق سے حل کیا اور کتنے ہی ادیبوں اور شاعروں کی صحیح جائے پیدائش اور سالِ ولادت کا تعین کیا اور قدیم روایتوں کو غلط ثابت کیا، وہ تحقیق کا معلّم ثانی، خود اپنے بارے میں صحیح معلومات فراہم کرنے سے قاصر رہا۔ وہ نہ اپنا سالِ ولادت بتا سکے، نہ ادبی زندگی کے آغاز کا سال اور نہ یہ بتا سکے کہ ان کی سب سے پہلی تحریر کب اور کس عنوان سے شائع ہوئی۔ اس سلسلہ میں سب سے مستند اور جامع معلومات جناب صدر الدین فضاؔ نے فراہم کی ہیں۔ انھوں نے مضمون کا عنوان بھی دیا ہے اور رسالہ کا نام بھی بتایا ہے۔ اور ان کی تحریر سے قاضی صاحب کی ادبی زندگی کے آغاز کا زمانہ ۱۳۔۱۹۱۲ء ہی

(۱) غالب نامہ (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۸۷ء) ص ۱۳۲
(۲) آج کل نئی دہلی ۱۹۸۵ء ص ۳۷

Marfat.com

قرار پاتا ہے۔ اس کی رو سے ڈاکٹر خلیق انجم کا یہ دعویٰ کہ قاضی صاحب کا پہلا مقالہ پٹنے کے رسالہ المصباح کے اپریل ۱۹۲۳ء کے شمارے میں شائع ہوا، غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

قاضی صاحب نے اردو کی قدیم داستانوں کا وسیع مطالعہ کیا تھا۔ اور زمانۂ طالب علمی میں یورپ کے افسانوی ادب کا بھی کثرت سے مطالعہ کیا تھا۔ اس لئے ابتدا میں انھیں افسانوی ادب سے گہری دلچسپی ہو گئی تھی۔ اس لئے قدرتی طور پر ادبی زندگی کا آغاز انھوں نے افسانہ نویسی سے ہی کیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے چند کہانیوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا لیکن جس طرح انھوں نے بہت جلد شاعری کو خیرباد کہہ دیا، اسی طرح افسانہ نویسی سے بھی جلد ہی ترکِ تعلق کر لیا اور ہمہ تن تحقیق و تنقید میں لگ گئے۔ فرماتے ہیں :

"میرے والد کو داستانِ امیر حمزہ کے مطالعے کا شوق تھا اور ان کے پاس اس کی بہت سی جلدیں تھیں۔ میں نے یہ سب بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھیں۔ بوستانِ خیال کی ایک جلد کہیں اور ملی۔ مگر اس میں میرا دل نہ لگا۔ بعد کو میں نے شررؔ، و سرشارؔ کے ناول اور رینلڈس کے ناول کے تراجم بھی دیکھے۔ پریم چند کی بہت سے کہانیاں بھی پڑھیں۔ عنفوانِ شباب میں میں نے خود رومانی انداز کی ایک کہانی لکھی۔ اس کا عنوان مجھے یاد نہیں۔ یہ آگرہ اخبار میں ایک فرضی نام (جذبات حسرت کا مصور) سے چھپی تھی۔ میں بلنگرامی ٹیوٹوریل کالج میں داخل ہوا تو میں نے بہت سے انگریزی ناول دیکھے اور یہ سلسلہ پٹنہ واپس آنے کے بعد بھی جاری رہا۔ یورپ میں شاعری کی بہ نسبت مجھے ناول دیکھنے کا زیادہ شوق رہا۔ اور انگلستان، فرانس، اٹلی، اسپین، ناروے، روس، جرمنی اور امریکہ کا شاید ہی کوئی بڑا ناول لکھنے والا ہو جس کے ناول میری نظر سے نہ گزرے ہوں۔ میرے زمانۂ اقامت یورپ میں جیمس جوائس اور مارسل پردست کا بہت چرچا تھا۔ یورپ سے واپس کے بعد بھی میری دلچسپی ناولوں سے باقی رہی۔ اور میں نے 'معیار' کے لئے خود بھی ایک کہانی لکھی جو ایک فرضی نام سے اس میں شائع ہوئی۔ کہانی کا عنوان "ایک ہونہار نوجوان" ہے میں نے دو، تین کہانیوں کا انگریزی سے ترجمہ بھی کیا ہے" (۱)

رسالہ معیار کا اجراء: قاضی صاحب کو صحافت سے بھی خصوصی دلچسپی

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۲۱

Marfat.com

تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا ہی سے وہ کسی نہ کسی حیثیت سے اردو صحافت سے وابستہ رہے۔ ۱۹۱۰ء میں والد کے انتقال کے بعد ان کے جاری کردہ رسالے تحفۂ حنفیہ، پر مدیر کی حیثیت سے قاضی صاحب کا نام درج ہونے لگا۔ اس وقت ان کا سن ۱۴، ۱۵ برس کا تھا۔ ظاہر ہے اس پر آپ کا نام محض برائے بیت تھا۔ لیکن فنِ صحافت میں یہ آپ کے لئے اوّلین درس تھا۔ یہ رسالہ جلد ہی بند ہو گیا۔ اس کے بعد باقاعدہ صحافتی زندگی کا آغاز آپ نے ۱۹۳۶ء میں ماہنامہ 'معیار' جاری کر کے کیا۔ اس کا پہلا شمارہ مارچ ۱۹۳۶ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ بانکی پور پٹنہ سے شائع ہوا۔ یہ ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ رسالہ نے جلد ہی اعلیٰ ادبی معیار قائم کر لیا۔ ادبی حلقوں میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ لیکن عمر بہت کم ہوئی۔ اس کے ابھی صرف پانچ شمارے ہی نکل پائے تھے کہ قاضی صاحب علیل ہو گئے۔ علالت نے طول کھینچا اور نتیجہ میں رسالہ بند ہو گیا۔ اس کا آخری شمارہ جولائی اور اگست ۱۹۳۶ء کا مشترک شمارہ ہے اس طرح مجموعی طور پر اس کے پانچ شمارے نکلے جو چھ ماہ کی مدت کو محیط ہیں۔ اس میں بیشتر مضامین قاضی صاحب ہی کے شائع ہوئے جن کی مجموعی تعداد ۴۰ ہے۔ ان کے علاوہ چند کہانیاں بھی قاضی صاحب کی شاملِ اشاعت ہوئیں۔ ان مضامین اور کہانیوں کی تفصیلات اس طرح ہیں :

۱۔ معروضات (اداریہ)	معیار	شمارہ ۱	مارچ	۱۹۳۶ء
۲۔ تعارف	"	"	"	"
۳۔ مخمس سال وفات آبرو	"	"	"	"
۴۔ دیوانِ جوشش	"	"	"	"
۵۔ دریائے لطافت	"	"	"	"
۶۔ صوبۂ بہار میں گیارہویں صدی کا اردو نمونہ	"	"	"	"
۷۔ دیوانِ معروف	"	"	"	"
۸۔ نکات الشعراء (مرتبہ عبدالحق پر تبصرہ)	"	"	"	"
۹۔ رسالہ ندیم : بہار نمبر (تبصرہ)	"	"	"	"
۱۰۔ دیوانِ معروف	"	شمارہ ۲	اپریل	"

Marfat.com

۱۱۔ تعارف	,,	,, ۳	مئی	,,
۱۲۔ معروضات	,,	,,	,,	,,
۱۳۔ میر تقی میر	معیار	شمارہ ۳	مئی	۱۹۳۶ء
۱۴۔ سال وفات حاتم	,,	,,	,,	,,
۱۵۔ اوراق پارینہ (دیوان دوم معروف)	,,	,,	,,	,,
۱۶۔ دریائے لطافت : حصہ منطق نوشتۂ قتیل	,,	,,	,,	,,
۱۷۔ استفسارات	,,	,,	,,	,,
۱۸۔ محکمہ : دیوانِ معروف۔ دیوان جوشش	,,	,,	,,	,,
۱۹۔ مطبوعات جدیدہ : خطبات دتاسی (تبصرہ)	,,	,,	,,	,,
۲۰۔ بہار اور اردو شاعری (تبصرہ)	,,	,,	,,	,,
۲۱۔ کلیم عجم (مجموعہ کلام سیماب اکبرآبادی) تبصرہ		,,	,,	,,
۲۲۔ معروضات :	,,	شمارہ ۴	جون	,,
۲۳۔ محکمہ : سال وفات نجف خاں	,,	,,	,,	,,
- سال آغاز تذکرۂ مصحفی	,,	,,	,,	,,
تصحیح دیوانِ معروف	,,	,,	,,	,,
۲۴۔ ہماری زبان	,,	,,	,,	,
۲۵۔ دریائے لطافت : حصہ عروض	,,	,,	,,	,,
۲۶۔ دیوانِ راغب	,,	,,	,,	,,
۲۷۔ غالب اور پنج آہنگ	,,	,,	,,	,,
۲۸۔ غالب کے دو لطیفے	,,	,,	,,	,,
۲۹۔ سراپا سخن اور غالب	,,	,,	,,	,,
۳۰۔ تذکرۂ سرور اور غالب	,,	,,	,,	,,
۳۱۔ معروضات	,,	شمارہ ۵۔۶	جولائی۔ اگست	,,

Marfat.com

۳۲۔ایک ہونہار نوجوان (افسانہ)	”	”	”
۳۳۔واپسی (افسانہ)	”	”	”
۳۴۔عیاریاں (افسانہ)	معیار	شمارہ ۵۔۶ جولائی۔اگست	۱۹۳۶
۳۵۔کیتھرین پارک (ڈراما)	”	”	”
۳۶۔سکندر اور ضاحک	”	”	”
۳۷۔دریائے لطافت	”	”	”
۳۸۔ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد	”	”	”
۳۹۔شرف جہاں کا ایک شعر	”	”	”
۴۰۔مطبوعات جدیدہ (دیوان تاباں)	”	”	”

افسوس کہ بہت جلد اس رسالہ نے دم توڑ دیا اور صرف چھ ماہ بہار دکھا کر یہ قصۂ پارینہ بن گیا۔

رسالہ تحقیق: تحقیق اور تنقید کے خار زار میں الجھے رہنے کے باوجود قاضی صاحب کی صحافت سے دلچسپی کبھی کم نہ ہوئی۔ ۱۹۳۶ء میں رسالہ معیار کے بند ہو جانے کے بعد قاضی صاحب نے رسالہ معاصر کی سرپرستی فرمائی۔ اس کے بارے میں آئندہ صفحات میں تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔ ۱۹۶۳ء میں آپ نے تحقیق کے عنوان سے ایک اور رسالہ جاری کیا۔ اس سلسلے میں یہ ان کی آخری کوشش تھی۔ اس میں مشہور محقق اور دانشور جناب عتیق صدیقی مرحوم آپ کے معاون تھے۔ لیکن یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھی اور اس کا صرف ایک ہی شمارہ مطلع صحافت پر نمودار ہوا۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ بقول عابد بیدار:

”قاضی عبدالودود نے ایک پرچہ معیار کے نام سے نکالا ۱۹۳۶ء میں چھ، سات پرچے نکلے۔ پانچ مہینے بعد بند ہو گیا۔ آرزو جلیلی ان کے مددگار تھے۔ ۱۹۶۳ء میں پھر ایک بار انھوں نے اس میدان میں قدم رکھا اور تحقیق کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ اس بار ان کے مددگار عتیق صدیقی مرحوم تھے۔ اس پرچہ کا بس ایک ہی شمارہ نکلا۔ تحقیق گویا معاصر کے تحقیقی حصہ کی توسیع کے طور سے نکالا تھا۔ جب کہ 'معیار' میں تحقیق و تنقید، ادب کی رفتار، زبان کی ترقی، اردگرد

Marfat.com

کی، ادب اور تہذیب پر معاشرے اور معاشرت پر اثر انداز ہونے والی سبھی باتیں شامل رہتی تھیں۔ تحقیق میں تھکے ہوئے زمانے کی عزلت گزینی تھی اور گزرے ہوؤں کی جستجو۔ معیار میں جوانی کی پوری جولانی تھی اور ماضی کی طرح حال سے بھی پوری پوری دلچسپی"(۱)

رسالہ معاصر: ۱۹۴۰ء کے اواسط میں چند ادبی شخصیتوں اور دانشوروں نے، جن میں پٹنہ سٹی کالج اور پٹنہ سائنس کالج کے اساتذہ بھی شامل تھے، دائرۂ ادب، کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا۔ اس کی نشست ہر ماہ پابندی سے ہوتی تھی۔ ان ہی حضرات نے اس ادارہ کی جانب سے ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۴۰ء میں اس کے ترجمان کی حیثیت سے ایک ماہنامہ "معاصر" جاری ہوا۔ یہ ستر (70) صفحات پر مشتمل تھا۔ ڈاکٹر عظیم الدین احمد اس کے پہلے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس پہلے شمارے میں بارہ مضامین تھے اور مضمون نگاروں میں عظیم الدین احمد، کلیم الدین احمد، حافظ شمس الدین احمد، اور پروفیسر اختر اورینوی شامل تھے۔

قاضی صاحب دائرہ ادب کے رکنِ رکین تھے۔ اور ایک طویل عرصہ تک اس کے ترجمان معاصر کی سرپرستی کرتے رہے۔ معاصر کا علمی معیار بلند کرنے میں آپ نے نمایاں حصہ لیا۔ معاصر بنیادی طور پر ایک تحقیقی اور تنقیدی پرچہ تھا۔ اس کا بنیادی مقصد بہار کے ادبی ذوق کی بازیافت تھا۔ اسی لئے اس کے ہر شمارے میں بہار کے گمنام شعراء اور ادباء کی تخلیقات اور ان سے متعلق مضامین لازماً شائع ہوتے تھے۔ ان مقاصد کی توضیح ان الفاظ میں کی گئی تھی :

(۱) اردو کے معیاری تنقیدی مقالوں کی اشاعت۔

(۲) اردو کے تحقیقی مضامین کی اشاعت۔

(۳) اردو کے غیر مطبوعہ اہم مخطوطات کی اشاعت۔

(۴) اردو کے مختلف علمی اور ادبی مسائل پر بحث و تمحیص۔

(۵) اردو کے ایسے مقالوں کی اشاعت جن کا تعلق سماجی، ثقافتی اور تہذیبی مسائل سے ہے۔

معیار کے مکمل فائل کے مندرجات پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے مندرجہ بالا مقاصد کے حصول میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اور اس سلسلہ میں قاضی صاحب کا رول بہت اہم رہا ہے۔ آپ نے اس سے قلمی تعاون ہی نہیں کیا، بلکہ صحیح معنی میں اس کی سرپرستی بھی

(۱) پیش گفتار (رسالہ معیار و تحقیق۔ شمارہ ۱۔ ۱۹۸۹) ص ۱۔

Marfat.com

فرمائی۔ان کے جتنے مضامین معاصر میں شائع ہوئے اتنے کسی دوسرے رسالے میں شائع نہیں ہوئے اور یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اس میں جتنے مضامین قاضی صاحب کے شائع ہوئے، کسی اور کے نہیں۔ حتیٰ کہ کلیم الدین احمد کے بھی نہیں۔ حالانکہ تقریباً ۹ سال تک ان کے والد جناب عظیم الدین احمد اور لگ بھگ دس سال وہ خود اس کے ایڈیٹر رہے۔ قاضی صاحب کے اس میں ۱۴۷ مضامین شائع ہوئے جب کہ کلیم الدین احمد کے مضامین کی تعداد ۸۲ تک پہنچتی ہے۔ معاصر نے آپ کی خدمات کا اعتراف کیا اور بطور احسان مندی ۱۹۷۶ء میں 'قاضی عبدالودود نمبر' شائع کیا۔ یہ ایک طرح سے مخصوص روایت سے انحراف تھا اس لئے کہ اس وقت تک اس کا کوئی خصوصی نمبر شائع نہیں ہوا تھا۔ اس خصوصی شمارے کے مرتب اردو کے مشہور ناقد اور دانشور جناب کلیم الدین احمد ہیں۔ یہ ۴۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر ضرورت اس بات کی محسوس ہوتی ہے کہ اس کے مندرجات کو ذیل میں نقل کر دیا جائے۔ اس سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ ہمارے دانشور، ناقدین، مدبرین اور سوانح نگار قاضی صاحب کو کس قدر ادب واحترام اور عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھتے تھے:

۱۔ حرف آغاز	مرتب	الف	—
۲۔ افتتاحیہ	فخر الدین علی احمد	و	
۳۔ میں کون ہوں، کیا ہوں	قاضی عبدالودود	۱	۲۶
۴۔ ودود بھائی	حمیدہ سلطان احمد	۲۷	۳۰
۵۔ ایک خط	امتیاز علی خاں عرشی	۳۱	۳۲
۶۔ قاضی عبدالودود	یوسف حسین خاں	۳۳	۳۷
۷۔ قاضی عبدالودود صاحب	مالک رام	۳۸	۴۶
۸۔ ایک قاموسی شخصیت	محمد حسن	۴۷	۶۳
۹۔ بت شکن محقق	گیان چند جین	۶۴	۱۱۹
۱۰۔ تحقیق کا معلم ثانی	رشید حسن خاں	۱۲۰	۱۳۰
۱۱۔ قاضی عبدالودود	مختار الدین احمد	۱۳۰	۱۶۹

Marfat.com

۱۲۔ قاضی عبدالودود	دوارکاداس شعلہ	۱۷۰	۱۸۴
۱۳۔ قاضی صاحب-عالم اور انسان	سید حسن عسکری	۱۸۵	۲۰۷
۱۴۔ قاضی صاحب کا ننھیالی خاندان	شاہ عطاء الرحمٰن	۲۰۸	۲۲۱
۱۵۔ ......لیکن تو چیزے دیگری	سید محمد حسنین	۲۲۲	۲۵۰
۱۶۔ قاضی صاحب	محمد ذکی الحق	۲۵۱	۲۶۹
۱۷۔ قاضی صاحب	سید حسن	۲۷۰	۲۸۵
۱۸۔ قاضی صاحب۔ جیسا میں انھیں دیکھ سکا	محمد صدرالدین فضا	۲۸۶	۲۹۲
۱۹۔ کچھ قاضی صاحب کے بارے میں	عابد رضا بیدار	۲۹۳	۳۱۳
۲۰۔ شاد عظیم آبادی اور قاضی عبدالودود	محمد منصور عالم	۳۱۴	۳۳۱
۲۱۔ خطوط	قاضی عبدالودود	۳۳۲	۳۸۷
۲۲۔ مقالات قاضی عبدالودود کی فہرست	محمد ذکی الحق و منصور عالم	۳۸۸	۴۰۵
۲۳۔ قاضی عبدالودود اور سیاسیات	انیس الرحمٰن	۴۰۶	۴۲۰
۲۴۔ حرف آخر	کلیم الدین احمد	۴۲۱	۴۳۶

رسالہ 'معاصر' سے قاضی صاحب کو خصوصی تعلق تھا اور اس کو زندہ و تابندہ رکھنے کے لئے انھوں نے جو جدو جہد کی اس کا اعتراف جناب کلیم الدین احمد جیسے دانشور اور ناقد نے بڑے شاندار الفاظ میں کیا ہے۔ اسی خصوصی شمارے میں 'حرف آخر' کے تحت وہ لکھتے ہیں :

" قاضی صاحب کو دائرۂ ادب اور معاصر سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ حالانکہ وہ دائرۂ ادب کے رکن نہیں ہیں۔ لیکن وہ پٹنے میں رہتے ہیں اور باصحت رہتے ہیں تو دائرۂ ادب کے جلسوں میں شریک ہوتے ہیں اور ان کے مشورے ہمیشہ مفید اور پُرخلوص ہوتے ہیں۔ معاصر کے لئے وقت نکال کر برابر لکھتے ہیں۔ معاصر کو نکلے ہوئے تقریباً ۳۵ سال ہوئے ہیں۔ اس طویل مدت میں قاضی صاحب کی ہمدردی، عملی ہمدردی برابر معاصر کے ساتھ رہی ہے اور اس مدت میں جتنے مضامین انھوں نے معاصر کے لئے لکھے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ کسی دوسرے رسالے کے لئے نہیں

Marfat.com

لکھے ہیں اور کئی بار تو انھوں نے معاصر کو بند ہونے سے بچالیا۔ ہوا یہ کہ ۱۹۴۹ء کے بعد معاصر کے انتظامی امور میں بدنظمی آگئی۔ دائرۂ ادب کے جلسے مہینوں پر ہوتے۔ معاصر کبھی نکلتا، کبھی نہیں نکلتا۔ مجھے یہ صورتِ حال پسند نہ آئی اور ۱۹۵۰ء کے کسی جلسے میں میں نے کہا اب اگر ہم لوگ معاصر کو باضابطہ نہیں نکال سکتے تو اسے بند کر دیا جائے۔ کچھ لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ خصوصاً قاضی صاحب نے کہا کہ معاصر کو بند نہیں ہونا چاہئے، انتظامی امور کو سنبھالنا چاہئے اور انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ اسے سہ ماہی، علمی، تنقیدی، تحقیقی رسالے کی صورت میں نکالا جائے۔ یہ رائے سبھوں کو پسند آئی اور معاصر ماہوار رسالے سے سہ ماہی رسالہ ہو گیا۔ اور ابھی تک ہے۔ قاضی صاحب نے زیادہ سے زیادہ مضامین لکھے لیکن پھر کوئی ۷۱-۱۹۷۰ء میں میں نے دیکھا کہ پرانی بدنظمی عود کر آئی ہے۔ شروع میں چار نہیں تو تین نمبر ہر سال نکلتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ان کی تعداد میں کمی ہونے لگی اور میں نے دیکھا کہ آخری نمبر جو اس وقت نکلا تھا وہ تقریباً تین برسوں کے بعد۔ دائرۂ ادب کے جلسے بھی سات، آٹھ مہینوں پر کبھی کبھار ہو جایا کرتے تھے۔ تو پھر میں نے وہی تجویز پیش کی کہ شاید دائرۂ ادب اور معاصر کی ضرورت اب باقی نہیں رہی اس لئے انھیں بند کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ قاضی صاحب نے مجھ سے علیحدہ بھی کہا کہ معاصر کو جاری رکھئے یہ آپ کے والد کی یادگار ہے اور پھر میٹنگ میں بھی انھوں نے یہی کہا کہ معاصر کو جاری رکھنا چاہئے اور یہ جاری رہا اور ہے۔ ظاہر ہے کہ قاضی صاحب کو معاصر سے دلچسپی تھی اور ہے" (۱) ۔

دراصل دائرۂ ادب اور اس کے ترجمان معاصر کے روحِ رواں قاضی صاحب اور کلیم الدین احمد صاحب تھے۔ یہ دونوں حضرات جب تک حیات سے تھے، ان دونوں میں روح پھونکتے رہتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد دائرہ ادب کی سرگرمیاں بھی سرد پڑ گئیں اور معاصر بھی بند ہو گیا۔

غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے تعلق: قاضی صاحب کو

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۴۳۳-۴۳۴

Marfat.com

مرزا غالبؔ سے خصوصی لگاؤ تھا۔ اور یہ لگاؤ عشق کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ انھوں نے مرزا غالبؔ کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر متعدد تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھے۔ اور غالبؔ فہمی کے نئے امکانات پیدا کیے۔ اس سلسلہ میں ۱۹۶۹ء میں غالبؔ صدی تقریبات کے دوران بین الاقوامی غالبؔ سیمنار پر قاضی صاحب نے جو کلیدی خطبہ دیا تھا وہ ان کے عمیق اور وسیع مطالعہ کا مظہر ہے۔ یہ قاضی صاحب کی انصاف پسندی اور تحقیق وانتقاد کے سائنٹفک طریقہ کی پاسداری تھی کہ انھوں نے اپنے اس یادگاری خطبہ میں غالبؔ کی صرف مدح سرائی ہی نہیں کی، بلکہ ان کی خامیوں کی طرف بھی اشارے کیے۔ اپنی محبوب شخصیت پر تنقید کرنے کا کارنامہ قاضی صاحب کے علاوہ کوئی اور شخص انجام نہیں دے سکتا۔

غالبؔ صدی تقریبات (فروری ۱۹۶۹) کے طفیل دہلی میں دو اہم ادارے عالمِ وجود میں آئے۔ ایک غالبؔ اکیڈمی، دویم غالبؔ انسٹی ٹیوٹ۔ غالبؔ اکیڈمی کے محرک حکیم عبدالحمید تھے اور غالبؔ انسٹی ٹیوٹ مرحوم صدرِ جمہوریۂ ہند جناب فخر الدین علی احمد کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلہ میں انھیں سب سے زیادہ تعاون قاضی عبدالودود صاحب سے ملا۔ اس کا اعتراف خود فخر الدین علی احمد صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> "اس میں شک نہیں کہ اگر ہمیں قاضی صاحب کے گرانقدر اور مخلصانہ مشورے حاصل نہ ہوتے تو غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کو اتنے شاندار پیانے پر قائم کرنے میں خاصی دشواریوں کا سامنا ہوتا" (۱)

قاضی صاحب کے لئے اس کام میں دو عوامل خاص طور سے کشش رکھتے تھے۔ ایک غالبؔ سے دلچسپی دوسرے جناب فخر الدین علی احمد سے ان کے مخلصانہ اور گہرے تعلقات انھی دونوں عوامل کے سبب انھوں نے نہ صرف غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کے قیام میں دلچسپی لی اور اپنا تعاون پیش کیا، بلکہ قیام کے بعد اس کے کاموں میں مستقل دلچسپی لیتے رہے اور صحیح معنی میں اس کی سرپرستی کرتے رہے۔ غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کے اربابِ اقتدار بھی ہمیشہ آپ کو احترام کی نظر سے دیکھتے رہے اور آپ کی خدمات کا اعتراف کرتے رہے۔ قاضی صاحب کے انتقال کے بعد ان حضرات نے قاضی صاحب کا ذاتی کتب خانہ غالبؔ انسٹی ٹیوٹ میں منتقل کر لیا اور

(۱) غالب نامہ (قاضی عبدالودود نمبر ۷ ۱۹۸ء) ص ۱۲

Marfat.com

اسی کے ساتھ گوشۂ عبدالودود بھی قائم کر دیا۔ فروری ۱۹۸۶ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ نے قاضی صاحب پر ایک یک روزہ سیمینار بھی منعقد کیا جس میں ملک کے دانشوروں، ناقدوں اور محققوں نے شرکت کی اور شاندار الفاظ میں قاضی صاحب کی خدمات کو سراہا۔ اس کے علاوہ جنوری ۱۹۸۷ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ نے اپنے ترجمان 'غالب نامہ' کا قاضی عبدالودود نمبر، بھی شائع کیا۔ اس میں بیشتر مضامین تو وہی ہیں جو قاضی عبدالودود سیمینار میں پڑھے گئے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ دوسرے مضامین بھی ہیں۔ ان کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ 'غالب نامہ' کے اس خصوصی شمارے کے مندرجات کو یہاں نقل کر دیا جائے۔ :

۱۔ قاضی صاحب	فخر الدین علی احمد	۹-۱۲
۲۔ قاضی عبدالودود	مختار الدین احمد	۱۳-۲۸
۳۔ قاضی عبدالودود	کلیم الدین احمد	۲۹-۴۴
۴۔ قاضی عبدالودود	سید حسن عسکری	۴۵-۵۱
۵۔ اگر ان کے والد کچھ دنوں اور زندہ رہتے۔	عطا کاکوی	۵۲-۵۷
۶۔ انسانم آرزوست	امیر حسن عابدی	۵۸-۶۵
۷۔ ایک قاموسی شخصیت	محمد حسن	۶۶-۸۲
۸۔ دو ہم آہنگ محقق	عابد رضا بیدار	۸۳-۱۱۳
۹۔ اردو میں تحقیق کی روایت اور قاضی عبدالودود	نثار احمد فاروقی	۱۱۴-۱۲۳
۱۰۔ قاضی عبدالودود بحیثیت تبصرہ نگار	رشید حسن خاں	۱۲۴-۱۳۱
۱۱۔ قاضی عبدالودود سے قبل اردو تحقیق اور متنی تنقید	خلیق انجم	۱۳۲-۱۴۱
۱۲۔ قاضی عبدالودود کی فارسی تحقیقات	نور الحسن انصاری	۱۴۲-۱۴۷
۱۳۔ قاضی عبدالودود خطوط کے آئینے میں	حمیرا خاتون	۱۴۸-۱۶۵
۱۴۔ مثبت تحقیق اور منفی تحقیق کی اصطلاحیں	جمیل احمد خاں	۱۶۶-۱۷۱

Marfat.com

۱۵۔ عکس تحریر	قاضی عبدالودود	-۱۷۲-
۱۶۔ اصولِ تحقیق	قاضی عبدالودود	۱۸۸-۱۷۲
۱۷۔ متون کی تصحیح و تنقید میں تخریج و تعلیقات کی اہمیت	نذیر احمد	۲۳۱-۱۸۹
۱۸۔ قاضی عبدالودود کے مقالات کا اشاریہ	جمیل احمد خاں	۲۴۹-۲۳۲
۱۹۔ قاضی عبدالودود (محقق اور دانشور)	"	۲۷۵-۲۵۰

اعزازات: قاضی صاحب کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف بر صغیر کے تمام دانشوروں نے کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ صرف ہندوستان کے لئے ہی نہیں بلکہ پوری ادبی اور علمی دنیا کے لئے قابلِ فخر شخصیت تھے اگرچہ وہ خود ان تمام باتوں سے بے نیاز تھے۔ انھیں اپنی علمی خدمات کے سلسلہ میں نہ کسی ستائش کی تمنا تھی، نہ صلے کی خواہش۔ وہ اپنی دنیا میں مگن رہتے تھے۔ تقریباً نصف صدی تک کتب بینی اور پرورش لوح و قلم ان کے محبوب مشغلے رہے ہیں اور اس طویل عرصہ میں انھوں نے کوئی کام بھی ایسا نہیں کیا جس کے متعلق یہ شبہ بھی کیا جاسکے کہ یہ کسی کے تملق یا خوشامد یا خود نمائی کے جذبے سے کیا گیا تھا۔ لیکن مشک چھپائے نہیں چھپتا۔ اس کی خوشبو از خود پھیلتی ہے۔ حیثیت محقق اور ناقد قاضی صاحب کی شہرت خود بخود پھیلتی گئی اور بہت جلد اس نے جغرافیائی حدود پار کرلیں اور نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پورے بر صغیر میں علماء اور دانشور آپ کی تخلیقات کو وقعت اور آپ کی شخصیت کو ادب اور احترام کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اور ایک وقت وہ آیا کہ آپ ہندوپاک کے بزرگ ترین محقق تسلیم کئے جانے لگے۔ اور سرکاری و نیم سرکاری اداروں نے آپ کو انعامات سے نوازنا شروع کیا۔ سب سے پہلے حکومتِ ہند نے آپ کی خدمت میں CERTIFICATE OF HONOUR IN PERSIAN پیش کیا۔ اس کے بعد ۱۹۷۵ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے آپ کو فخر الدین علی احمد غالب ایوارڈ، برائے اردو فارسی تحقیق، سے نوازا۔

غالب انسٹی ٹیوٹ ہر سال اہم ادبی شخصیتوں کو ان کی خدمات کے صلے میں مختلف انعامات سے نوازتا ہے۔ یہ انعامات مبلغ پانچ ہزار روپے، ایک تمغہ، ایک توصیفی سند اور مرزا غالب کی تصاویر کے ایک مرقع پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ابتدا میں یہ انعامات تحقیق، شاعری، نثر اور ڈراما

Marfat.com

کے سلسلہ میں دیے جاتے تھے۔بعد میں طنز و مزاح، اردو صحافت اور فنِ خطاطی میں قابل قدر خدمات کے سلسلہ میں بھی دیے جانے لگے۔ان انعامات کی تفصیل اس طرح ہے :

(۱) مودی غالب انعام برائے	اردو نثر
(۲) مودی غالب انعام برائے	اردو شاعری
(۳) فخر الدین علی احمد غالب انعام برائے	اردو وفارسی تحقیق
(۴) ہم سب غالب انعام برائے	اردو ڈراما
(۵) نانک غالب انعام برائے	اردو صحافت
(۶) پدم چند گپتا غالب انعام برائے	خطاطی
(۷) ساگر مودی غالب انعام برائے	اردو طنز و مزاح

اس طرح غالب انسٹی ٹیوٹ ہر سال سات ادبی شخصیتوں کو نوازتا ہے۔ قاضی صاحب یہ انعام حاصل کرنے والے ابتدائی دانشوروں میں شامل ہیں۔اس سے قاضی صاحب کے اعلیٰ معیار اور غیر معمولی ادبی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔اس کے علاوہ قاضی صاحب کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ فخر الدین علی احمد غالب انعام کے علاوہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے آپ کو خصوصی طور پر ایک توصیفی تمغہ پیش کیا۔یہ آپ کی علمی اور ادبی خدمات کا غیر معمولی اعتراف تھا۔اس سلسلہ میں ۲۱ر نومبر ۱۹۸۳ء کو غالب انسٹی ٹیوٹ کا ایک خصوصی جلسہ پٹنہ میں منعقد ہوا۔ قاضی صاحب اپنی علالت کے باعث دہلی تشریف نہیں لا سکتے تھے اس لئے مجبوراً یہ جلسہ پٹنہ میں کیا گیا تھا۔اس میں بر صغیر کے اس عظیم دانشور اور صفِ اول کے محقق کی خدمت میں ایک طلائی تمغہ اور سپاسنامہ پیش کیا گیا۔یہ تمغہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے بہار کے گورنر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے پیش کیا۔اس خصوصی جلسے میں جناب یونس سلیم، جناب محمد شفیع قریشی، پروفیسر نذیر احمد، خواجہ حسن ثانی نظامی، محترمہ حمیدہ سلطان، جناب رشید حسن خاں، جناب شائل نبی، پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر حسن عسکری اور دیگر عمائد نے شرکت فرمائی۔اس تقریب میں قاضی صاحب کی گل پوشی بھی کی گئی۔اس میں تقریر کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے نائب صدر جناب یونس سلیم نے قاضی صاحب کو زبردست خراجِ عقیدت پیش

Marfat.com

کیا۔آپ نے فرمایا کہ غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کی تعمیر اور اس کی ترقی کے سلسلہ میں مختلف پروگراموں میں مرحوم صدر جمہوریۂ ہند جناب فخرالدین علی احمد کے ساتھ قاضی صاحب کی گہری دلچسپی اور وابستگی رہی ہے۔ اس لئے آپ کا شمار غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ یہ عظیم ادارہ قاضی صاحب کے بارِ احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ اس موقع پر قاضی صاحب کی خدمت میں جو سپاسنامہ پیش کیا گیا، اس میں بجا طور پر کہا گیا تھا :

"قاضی صاحب بڑی پرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ حفظِ مراتب کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ اخلاق نہایت وسیع ہے، نوجوانوں کی تربیت بڑی توجہ سے کرتے ہیں۔ ہندوستان کے طول و عرض سے لوگ بغرضِ استفادہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور ان کی سحر آگیں گفتگو گھنٹوں بیٹھے سنتے رہتے ہیں وقت کے گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا۔"

ایسے عظیم دانشور و محقق اور ایسی نابغۂ روزگار شخصیت کی علمی خدمات کا شایان شان اعتراف مشکل ہے۔ صدر جمہوریۂ ہند کی طرف سے ان کو CERTIFICATE OF HONOUR IN PERSIAN مل چکا ہے۔ غالبؔ انسٹی ٹیوٹ نے بھی ان کی خدمت میں فخرالدین علی احمد ایوارڈ برائے محقق پیش کیا ہے۔ آج غالبؔ انسٹی ٹیوٹ ان کی شاندار خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک طلائی تمغہ اس یقین کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ یہ پیش کش خود ادارے کے لئے موجبِ صد افتخار ہے"۔

یہ صحیح ہے کہ قاضی صاحب کی خدمت میں اعزاز پیش کرنا خود پیش کرنے والے ادارے کے لئے باعث افتخار ہوگا۔ قاضی صاحب خود ان تمام باتوں سے بے نیاز اور مستغنی تھے۔

اہلیہ کی وفات: قاضی صاحب کو اپنی حیات میں پہلا زبردست صدمہ اپنے برادرِ خورد قاضی محمد سعید کی وفات سے پہنچا تھا۔ اس کے بعد ان کی زندگی کا دوسرا عظیم صدمہ ان کی شریکِ حیات کے داغِ مفارقت دینے سے پہنچا۔ یوں تو ان کی صحت عام طور پر اچھی نہیں رہتی تھی۔ کئی بار علالت نے شدت اختیار کرلی۔ ۱۹۶۰ء میں طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ پیٹ میں رسولی ہوگئی تھی جس کا آپریشن کرانا پڑا تھا۔ اس کے متعلق ۳ر اپریل ۱۹۶۰ء کو دوار کاداس شعلہؔ کے نام ایک مکتوب میں قاضی صاحب لکھتے ہیں :

Marfat.com

"میری بیوی ایک مہینے سے بیمار ہیں اور عملِ جراحی ضروری ہو گیا ہے۔ خاموشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کمال یہ ہے کہ ہائی بلڈ پریشر بھی ہے۔ آج ایک ڈاکٹر صرف اس غرض سے بلوایا ہے کہ یہ فیصلہ کرے کہ عمل جراحی جلد ہو سکتا ہے یا نہیں"۔(۱)

اس کے بعد ۲ر جولائی ۱۹۶۰ء کو شعلہ صاحب ہی کو مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"TUMOUR (میں نہیں کہہ سکتا کہ رسولی ہی ہے یا کوئی اور چیز) رحم میں ہے اور مس جون کا خیال ہے کہ اگر زیادہ بڑھ گیا ہے تو نکالا نہیں جا سکتا۔ دت صاحب کی تلاش بیکار ہے۔ آپ یہ لکھئے کہ دوا کس طرح استعمال ہو۔ کسی اچھے ہومیو پیتھ سے دریافت کروں گا۔ بھئی یہ معلوم ہے کہ ابتدا میں ڈریا کرسٹی سین کے ۱۸ انجکشن دیے گئے تھے اور B12 کے اس سے کہیں زیادہ انجکشن دیے جا چکے ہیں"۔(۲)

اس رسولی کو عمل جراحی کے ذریعہ نکال دیا گیا تھا اور اگرچہ مرض کو افاقہ ہو گیا تھا، تاہم صحت مکمل طور پر بحال نہیں ہوئی اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے کوئی نہ کوئی بیماریاں زور کرنے لگی۔ جس کی وجہ سے وہ جسمانی طور پر ہمیشہ کمزور رہیں۔ عام طور پر ہائی بلڈ پریشر کی شکایت بھی رہنے لگی۔ تاآں کہ ۱۵ر جون ۱۹۷۹ء کو ہائی بلڈ پریشر کے سبب غسل خانے میں چکر کھا کر گر گئیں اور اگرچہ کوئی فریکچر نہیں ہوا۔ تاہم حالت ایک دم تشویشناک ہو گئی۔ اس سلسلہ میں ان کے صاحبزادے قاضی محمد مسعود ایک خط میں جناب کاظم علی خاں کو لکھتے ہیں:

"...... ہم لوگ آج کل والدہ صاحبہ کی علالت کی وجہ سے سخت پریشان ہیں۔ وہ کل (یعنی ۱۵ر جون ۱۹۷۹ء) کو غسل خانہ میں چکر آنے کی وجہ سے گر گئیں۔ غنیمت ہے کہ کچھ زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ بلڈ پریشر بہت بڑھا ہوا ہے جس کی وجہ سے تشویش ہے۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے اور علاج ہو رہا ہے دیکھئے اس پریشانی سے کب نجات ہوتی ہے"۔(۳)

اس کے بعد ۱۷ر جون ۱۹۷۹ء کو ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ اگلے دن

---

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۳۶۲
(۲) " ص ۳۶۵
(۳) نیا دور، لکھنؤ (مارچ ۱۹۹۲ء) ص ۲۴

Marfat.com

۱۸/ جون ۱۹۷۹ء کو وہ قاضی صاحب کو داغ مفارقت دے گئیں اور مالکِ حقیقی سے جا ملیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دونوں کا ۵۷ سال تک شبانہ روز ساتھ رہا۔ اس طویل عرصہ میں دو مسافر قدم سے قدم ملا کر ایک دوسرے کا ساتھ نباہتے ہوئے چلتے رہے۔ خواتین جسمانی طور پر مردوں کے مقابلے میں کمزور ہوتی ہیں۔ قاضی صاحب اور ان کی شریکِ حیات ان کی غم خوار و ہمدرد، ان کی مونس اس زندگی کے سفر میں وہ قاضی صاحب سے پہلے تھک گئیں اور ان کا ساتھ چھوڑ گئیں۔

قاضی صاحب اس حادثے سے بے حد متاثر ہوئے۔ یہ ایک قدرتی بات تھی۔ ایک طویل عرصہ تک آپ پر سکوت کی کیفیت طاری رہی۔ قاضی محمد مسعود نے جناب کاظم علی خاں کو ۲۰/ جون ۱۹۷۹ء کے مکتوب میں اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع ان الفاظ میں دی تھی :

"یہ خبر انتہائی رنج و غم کے ساتھ دے رہا ہوں کہ ۱۸/ جون ۱۹۷۹ء کی صبح والدۂ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ ان پر ایک دن پہلے (یعنی ۱۷/ جون ۱۹۷۹ء کو) فالج کا شدید حملہ ہوا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکیں۔ اس سانحے کا ہم لوگوں پر کیا اثر ہو سکتا ہے، آپ اس کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ والد صاحب پر سکتے کا عالم ہے" (۱)

اس کے بعد ۳۰/ جون ۱۹۷۹ء کو قاضی صاحب کی ذہنی کیفیت پر روشنی ڈالتے ہوئے قاضی محمد مسعود لکھتے ہیں :

"والد صاحب بہ ظاہر اپنے اوپر قابو پا چکے ہیں اور اپنے کاموں میں بدستور منہمک نظر آتے ہیں۔ غم غلط کرنے کا یہ اچھا طریقہ ہے" (۲)

یہ صحیح ہے کہ وقتی طور پر قاضی صاحب نے خود کو سنبھال لیا تھا، اور بظاہر وہ اپنے معمولات میں از سر نو مشغول بھی ہو گئے تھے۔ لیکن اندر سے بالکل ٹوٹ گئے تھے۔ اس سانحہ سے ان کا قلب بے حد متاثر ہوا تھا۔ صحت پہلے بھی ان کی کچھ زیادہ مضبوط نہیں تھی۔ اس حادثے کے بعد ان کے جسم میں قوتِ مدافعت بہت کم رہ گئی جس کے سبب پرانی تکالیف پھر عود کرنے لگی۔ اس وقت قاضی صاحب کا سن اسی ۸۰ برس سے متجاوز تھا۔ اس عمر میں قویٰ فطری طور پر مضمحل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا طرح طرح کی بیماریوں کا گھیر لینا قدرتی امر ہوتا ہے۔

(۱) نیا دور لکھنؤ (مارچ ۱۹۹۲ء) ص ۲۴
(۲) ایضاً ،، ص ۲۴

Marfat.com

اپنی شریکِ حیات کی جدائی سے قاضی صاحب ذہنی طور پر بھی بہت متاثر ہوئے تھے۔

علالت: یہ بات پہلے ہی عرض کی جاچکی ہے کہ موجودہ صدی کی تیسری دہائی میں جب قاضی صاحب بہ سلسلۂ تعلیم ولایت میں مقیم تھے تو سخت علیل ہوگئے تھے ان پر پلوریسی کا شدید حملہ ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے انھیں کئی ماہ سینیٹوریم میں رہنا پڑا تھا۔ اور علاج سے وہ صحت مند ہو گئے تھے لیکن اس بیماری کے اثرات اتنے گہرے ہو ئے کہ ان سے ان کی پوری زندگی متاثر ہو گئی۔ کیمبرج یونیورسٹی سے بیر سٹری کا امتحان پاس کرنے کے باوجود، وطن واپس آکر وہ وکالت نہ کر سکے۔ بعد میں بھی کسی نہ کسی مرحلے پر یہ مرض عود کرتا رہا۔ جس کی وجہ سے قاضی صاحب جسمانی طور پر کبھی مضبوط نہ ہو سکے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کی شریکِ حیات بھی بیشتر اوقات علیل ہی رہتی تھیں۔ اس سے ان کی ذہنی الجھنیں اور بڑھ جاتی تھیں۔ جو ان کی صحت کے لئے مزید خرابی کا باعث بن جاتیں۔ اس کے باوجود قاضی صاحب قوت ارادی کے بہت مضبوط تھے۔ ان تمام الجھنوں اور پریشانیوں کے باوجود وہ اپنے معمولات میں فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ وہ ہمیشہ کتب بینی اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔ لیکن بڑی حد تک انھوں نے باہری دنیا سے تعلق منقطع کر لیا تھا۔ اس خلوت نشینی کا اثر ان کی صحت پر اچھا نہیں پڑا۔ طبیعت کی جولانی مفقود ہو گئی، فرحت ان کا ساتھ چھوڑ گئی اور جسم میں قوت مدافعت معدوم ہونے لگی۔ اس لئے بیماریوں کے حملے بار بار ہونے لگے میں نھو نے جو خطوط اپنے دوستوں اور نیاز مندوں کو لکھے۔ ان میں سے بیشتر میں دیگر باتوں کے علاوہ، خرابی صحت کی اطلاع بالالتزام ملتی ہے مثلاً۔ مکتوب بنام محمد حسنین، مورخہ ۲۲ر جنوری ۱۹۵۱ء:

"تین چار دن ہوئے میں نے آپ کو خط لکھا ہے جس میں یہ اطلاع دی ہے کہ یکایک بیمار ہو جانے کی وجہ سے کلکتہ نہ جاسکا اراوہ ابھی تک ہے مگر بعد صحت مجھے بھی آپ کی طرح کھانسی نے ستا رکھا ہے"۔(۱)

---

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ۳۴۳

Marfat.com

۴؍اکتوبر ۱۹۵۲ء کے خط میں ارشد کاکوی کو لکھتے ہیں :

"میری صحت موسم گرما میں ہمیشہ اچھی رہتی ہے۔ شکایتوں کاآغاز اکتوبر سے شروعؔ ہوتا ہے۔ مگر ابھی تک اچھا ہوں" (۱)

مکتوب بنام ڈاکٹر محمد حسن مورخہ ۱۱؍اگست ۱۹۷۲ء :

"طبیعت ناساز تھی اور ہے۔ لیکن طبیعت پر جبر کر کے جواب دے رہا ہوں"۔ (۲)

ان کے علاوہ جناب کاظم علی خاں نے ایک مضمون خطوط قاضی عبدالودود، مطبوعہ نیادور لکھنؤ (مارچ ۱۹۹۲ء) میں اپنے نام قاضی صاحب کے ۱۴ خطوط نقل کئے ہیں۔ ان میں پہلا خط ۲۱مارچ ۱۹۷۶ء کا ہے اور آخری خط ۱۱ر مئی ۱۹۸۲ء کا ہے۔ اس طرح یہ مراسلت تقریباً آٹھ سال کو محیط ہے۔ یہ قاضی صاحب کی زندگی کا آخری دور ہے۔ اس زمانے میں قاضی صاحب بہت نحیف ونزار ہو گئے تھے۔ اور طرح طرح کے امراض نے انھیں گھیر لیا تھا۔ ان خطوط میں انھوں نے اپنی خرابیٔ صحت، ضعفِ قویٰ اور علالت کی بار بار شکایت کی ہے۔ اور بقول مکتوب الیہ "یہ قاضی صاحب کے آخری دور کے خود نوشت ہیلتھ بلیٹن (HEALTH BULLETIN) کی حیثیت بھی رکھتے ہیں" ان ۱۴ خطوط سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ جن سے قاضی صاحب کے امراض کی نشاندہی ہوتی ہے :

۱۔ "میں مدتوں سے بیمار ہوں" (۲۹ نومبر ۱۹۷۶ء)

۲۔ "میں ڈھائی سال سے علیل ہوں۔ ذیفراش تو نہیں، مگر اس کا اثر توانائی، قوتِ ارادی اور حافظے پر پڑا ہے" (۳ جولائی ۱۹۷۸ء)

۳۔ "میری صحت خراب ہو گئی ہے۔ داہنا ہاتھ اور داہنا پاؤں ٹھیک طرح کام نہیں کرتا۔ انگلیوں کا بھی یہی حال ہے" (۲۶ جولائی ۱۹۷۹)

۴۔ "آپ کو خبر نہیں کہ میں مفلوج ہو گیا ہوں۔ داہنے ہاتھ اور داہنے پاؤں پر اثر ہے۔ ہاتھ سے (وہ) سب کام کر لیتا ہوں جو پہلے کرتا تھا۔ مگر دقت کے ساتھ۔ پاؤں پر اثر زیادہ ہے۔ کھڑا ہو سکتا ہوں، لیکن چلنا مشکل ہے" (۳ر ستمبر ۱۹۷۹ء)

۵۔ "میری صحت برسوں سے خراب ہے" (۱۱ مئی ۱۹۸۲ء)

ؔ لفظ شروع زاید ہے۔ ممکن ہے سہوِ کتابت ہو۔
(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۳۳۵
(۲) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۳۴۱

Marfat.com

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ قاضی صاحب ہمیشہ ہی کسی نہ کسی مرض کا شکار رہے۔ اور وہ اپنی خرابی صحت کے شاکی رہے۔ اس کے سبب رفتہ رفتہ ان کے جسم کی قوتِ مدافعت کم ہوتی گئی۔ اور ایک وقت وہ آیا کہ ان کا جسم مختلف امراض کی آماجگاہ بن گیا۔ اس سے ان کا ذہن اور تخلیقی عمل دونوں بری طرح متاثر ہوئے۔

عارضۂ قلب: جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا گیا ہے قاضی صاحب دائم المرض رہے۔ جب تک ان کے بدن میں طاقت رہی وہ ان امراض سے لڑتے رہے اور محض اپنی قوتِ ارادی کے طفیل ہار نہیں مانی اور اپنی علمی سرگرمیوں میں بھی فرق نہیں آنے دیا۔ لیکن جوں جوں عمر بڑھتی گئی قویٰ میں اضمحلال آنا شروع ہو گیا۔ جس سے ان کے اندر امراض سے نبرد آزما ہونے کی قوت بھی کم ہوتی گئی۔ یوں تو عام بیماریوں نے انھیں کمزور و نزار کر ہی رکھا تھا کہ ان پر اختلاج قلب کا بھی شدید حملہ ہوا۔ یہ ۱۹۷۴ء کی بات ہے۔ اس وقت آپ کا سن ۷۸ برس کا تھا۔ اس پیرانہ سالی میں اس نوع کے حملہ کو برداشت کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ قاضی صاحب کے لئے بھی اس کا سہنا دشوار ہو گیا۔ حالت ایک دم تشویشناک ہو گئی۔ خوش نصیبی سے اس وقت ان کا قیام دہلی میں تھا۔ فوری طور پر ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ اس زمانے میں فخر الدین علی احمد صاحب دہلی میں مرکزی وزیر تھے۔ آپ قاضی صاحب کے محب با اخلاص تھے۔ ولایت میں تعلیم کے سلسلے میں دونوں ایک ساتھ رہے تھے۔ اور خوبی یہ تھی کہ معاصرانہ چشمک اور مخاصمت کی بجائے دونوں میں پیار محبت اور اخلاص تھا لہٰذا فخر الدین صاحب کی خصوصی ہدایات پر ہسپتال کے ڈاکٹروں اور دیگر عملہ نے قاضی صاحب پر غیر معمولی توجہ دی جس کے سبب قاضی صاحب جلد صحت یاب ہو گئے۔ اس سلسلے میں قاضی صاحب کے نیاز مند خاص جناب دوارکا پرشاد شعلہ رقمطراز ہیں :

> "ایک عرصہ سے ان کی صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ غدودِ مثانہ کی سوزش اگر کبھی تنگ کرتی تو کبھی وہ دھانس جو دن بھر کی کھانسی کے بعد ہفتوں رفاقت میں رہتی ہے۔ ۱۹۷۴ء میں وہ یہیں دلی میں تھے کہ اختلاج قلب کا دورہ پڑا۔ بہت دن ہسپتال میں رہے۔ اپنی بلند ہمتی کے صدقے وہ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ دہلی تشریف لائے مگر حقیقت یہی ہے کہ اب ان کی صحت دنیوی ہنگاموں کی برداشت نہیں رکھتی" (۱)

---

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۱۸۳

Marfat.com

فالج کا حملہ: جولائی ۱۹۷۹ء میں قاضی صاحب پر فالج کا حملہ ہوا۔ اس نے آپ کی صحت کو چور چور کر دیا۔ اس میں آپ کا داہنا ہاتھ اور داہنا پاؤں زیادہ متاثر ہوا۔ پاؤں کی انگلیاں ایک دم شل ہو گئی تھیں۔ ہاتھ سے بھی اچھی طرح کام کرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ قاضی صاحب ذہنی طور پر بھی اس سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ اس سے ان کے مطالعے پر بھی اثر پڑا تھا۔ اس سلسلے میں جناب کاظم علی خاں کو لکھتے ہیں :

"آپ کو اس کی خبر نہیں کہ میں مفلوج ہو گیا ہوں۔ داہنے ہاتھ اور داہنے پاؤں پر اثر ہے۔ ہاتھ سے (وہ) سب کام کر لیتا ہوں جو پہلے کرتا تھا۔ مگر وقت کے ساتھ پاؤں پر زیادہ اثر ہے۔ کھڑا ہو سکتا ہوں، لیکن چلنا مشکل ہے۔ کچھ پڑھنے کو طبیعت نہیں چاہتی" (۳ر ستمبر ۱۹۷۹) (۱)

ایک دوسرے خط میں کاظم علی خاں صاحب کو لکھتے ہیں :

"میری صحت خراب ہو گئی ہے۔ داہنا ہاتھ اور داہنا پاؤں ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔ انگلیوں کا بھی یہی حال ہے"۔ (۲۶ر جولائی ۱۹۷۹) (۲)

حقیقت تو یہ ہے کہ اس حملے کے بعد قاضی صاحب کا دل دنیا سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ اور کسی کام میں بھی ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ لکھنا پڑھنا، جو ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا، اس سے بھی ان کا دل ہٹ گیا تھا۔ اس موذی مرض کا شکار ہو جانے کے بعد اگرچہ وہ تقریباً چار سال بقیدِ حیات رہے، لیکن ان کا دل مردہ ہو چکا تھا۔ اور وہ مولانا حالی کی اس رباعی کے، (پہلے شعر کے مصرعۂ ثانی میں معمولی سی تحریف کے ساتھ) مصداق بن گئے تھے ؎

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی	بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ ہم کو تو نے چھوڑا	ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

وفات: قاضی صاحب نے طویل عمر پائی۔ وہ تقریباً ۸۸ سال تک اس جہانِ آب و گل میں رہے۔ لیکن زندگی بھر وہ حوادث سے لڑتے اور بیماریوں سے نبرد آزما ہوتے رہے۔ ان کی عام صحت کبھی اچھی نہیں رہی۔ عمر کے ساتھ ساتھ قویٰ مضمحل ہونے لگے۔ اور ایک وقت وہ

---

(۱) نیا دور۔ لکھنؤ (مارچ ۱۹۹۲) ص ۳۲
۲) ایضاً ص ۳۲

Marfat.com

آیا کہ ان کی قوتِ مدافعت یکسر جواب دے گئی۔ بالآخر وقتِ موعود آن پہنچا۔ طویل علالت کے بعد ۲۵ر جنوری ۱۹۸۴ء کو ان کی حیات کے عناصر ترکیبی پریشان ہو گئے اور وہ مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

بقول پروفیسر عطا کاکوی:

"مضامین اور تالیفات کا انبار لگا کر، لوگوں کو حقیقت کا سبق پڑھا کر، سچائی کو مشعلِ راہ بنا کر، بے ہمہ اور باہمہ زندگی گزار کر، بالآخر یہ مخزنِ علم و ادب، معدن صدق و صفا، منبع اخلاق و اخلاص ۲۵ر جنوری ۱۹۸۴ء کو اس جہانِ آب و گل کو چھوڑ کر اس جہان میں چلا گیا جہاں سے کوئی لوٹ کر واپس نہ آیا۔ اس کا جسد خاکی منوں خاک کے تلے مدفون ہو گیا۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے (۱)

پروفیسر موصوف نے آپ کی وفات پر ۱۴ اشعار پر مشتمل ایک قطعۂ تاریخ بھی کہا۔ اور "اعظم محقق نماند" سے ۱۴۰۴ھ سال وفات برآمد کیا۔ مکمل قطعہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

بجھی ہائے شمع شبستانِ علم — جہاں میں عجب سانحہ ہو گیا
وہ گنجِ معانی تہہ خاک ہے — جو تھا فن تحقیق کا رہنما
ہوئی رحلتِ قاضی عبدالودود — سنا جس نے وہ دم بخود رہ گیا
وہ تھا ذات سے اپنی اک انجمن — شگفتہ بیانی میں جو فرد تھا
حقیقت کا جویا، حقیقت شناس — کہاں کوئی اس جیسا اب دوسرا
ہر اک بات اس کی نپی اور تلی — کسی سے لگی لپٹی رکھتا نہ تھا
غضب حافظہ اور بلا یادداشت — کتب بینی دن رات کا مشغلہ
مضامین اس نے لکھے بے شمار — قلم اور قرطاس سے کام تھا
تھا تحریر و تقریر میں حزم و ضبط — رسا فکر تھی ذہن تھا بے خطا

(۱) غالب نما۔ (قاضی عبدالودود نمبر ۷ ۱۹۸ء) ص ۵۶

Marfat.com

بجا ہے کہیں اس کو بحر العلوم ٹھکانا نہ تھا علم کی تھاہ کا
کئی السنہ پر تھا اس کو عبور وہ برہانِ قاطع تھا فرہنگ کا
عطاؔ کو ہوئی فکر تاریخ کی چلے سالِ رحلت کا جس سے پتا
صدا آئی "اعظم محقق نماند"
یہی سال رحلت ہوا برملا (۱۴۰۴)

اخلاق و عادات: قاضی صاحب ایک شریف النفس، بااخلاق اور مرنجان مرنج انسان تھے۔ شخصیت میں جاذبیت تھی۔ گفتگو میں بڑے نرم اور موثر انداز میں کرتے تھے۔ وہ کھرے اور صاف گو انسان تھے۔ منافقت، خوشامد، چاپلوسی اور کسی کی بیجا تعریف سے ہمیشہ اجتناب کرتے تھے گفتگو میں (البتہ مزاج میں کسی قدر انکسار تھا۔ وہ منکسر المزاج تھے، لیکن) بے جا تکلفات اور غیر ضروری سمیات کے وہ بالکل قائل نہ تھے۔ ان کا ذہن ایک خاص نہج پر کام کرتا تھا۔ وہ تحقیق و تنقید کے مرد میدان تھے۔ وہ علمی تحقیق میں جس نتیجہ پر پہنچ جاتے تھے، اس پر سختی سے اصرار کرتے تھے۔ اپنی رائے کے خلاف کسی دوسری رائے سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ جو رائے قائم کرتے تھے، وہ بہت غور و خوض اور وسیع مطالعے کے بعد کرتے تھے۔ اسی لئے وہ سمجھتے کہ جس نتیجہ پر وہ پہنچے ہیں، وہی آخری اور حتمی ہے۔ وہ تعلقات اور مراسم کی پاسداری کرتے تھے۔ اور اپنے مزاج کے مطابق انھیں نباہنے کی بھر پور کوشش بھی کرتے تھے۔ وہ بہت منظم اور منضبط زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ پابندی اوقات پر بہت زور دیتے تھے۔ وقت کی پابندی خود بھی کرتے تھے اور دوسروں سے بھی کراتے تھے۔ جو حضرات ان سے نزدیکی تعلق رکھتے تھے۔ وہ قاضی صاحب کی شخصیت میں عجیب قسم کی کشش محسوس کرتے تھے۔ اور ان سے ایک بار ملنے کے بعد بار بار ملاقات کی خواہش کرتے تھے۔ پروفیسر سید حسن ان کی مہمان نوازی اور عمومی اخلاق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قاضی صاحب بہت ہی خوش اخلاق اور مہمان نواز ہیں۔ ان کی ملاقات کو جو بھی جاتا ہے اس سے خندہ پیشانی اور بلا تکلف ملتے ہیں۔ چائے ناشتہ سے خاطر کرتے ہیں۔ دوست ہو یا مخالف، چھوٹا ہو یا بڑا، سب کے ساتھ اخلاق کا برتاؤ کرتے ہیں۔ پٹنہ سے

Marfat.com

باہر کا کوئی ریسرچ اسکالر، ادیب، یونیورسٹی کا ٹیچر، پٹنہ اپنے کام سے آتا ہے۔ قاضی صاحب اور کلیم الدین احمد صاحب سے ملاقات کی کوشش کرتا ہے۔ کلیم الدین احمد صاحب صدر شہر سے خاصے فاصلہ پر رہتے ہیں اس لئے ان کے یہاں تک پہنچنے کا موقع سب کو نہیں ملتا ہے، البتہ قاضی صاحب کے یہاں چوں کہ مرکز شہر میں ان کا مکان ہے، سب کی رسائی ہو جاتی ہے۔ بیرونی مہمان کو قاضی صاحب چائے، کھانے پر ضرور مدعو کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ چند اور لوگوں کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ ان ملاقاتوں میں قاضی صاحب گفتگو خوب کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ کلیم الدین احمد صاحب کے بالکل برعکس ہیں۔ کلیم صاحب سے ملنے والا باتیں کرتا ہے اور وہ خود بیشتر خاموش رہتے ہیں۔ قاضی صاحب کے یہاں ملنے والا زیادہ تر چپ رہتا ہے اور قاضی صاحب مسلسل گفتگو کرتے ہیں۔ چند سال پہلے تک قاضی صاحب کے یہاں لمبی لمبی نشستیں ہوتی تھیں، جن میں ہر قسم کے موضوع کے متعلق ان کے خیالات سننے کا موقع ملتا تھا۔ کبھی کبھی تو نشست گیارہ بجے رات تک طول کھینچ جاتی تھی اور بات ختم ہونے کو نہیں آتی تھی۔ آج کل لوگ قاضی صاحب کی صحت کا خیال کر کے ان کو زیادہ زحمت دینا گوارا نہیں کرتے اور صحبت کو مختصر کر دیتے ہیں۔ قاضی صاحب کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی ہیں، ان میں مزاح کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔ جن لوگوں کو ان سے بالمشافہ گفتگو کرنے کا موقع نہیں ملا ہے وہ ان کی تحریروں سے گمان کرتے ہیں کہ قاضی صاحب کی باتیں بھی ان کے مضامین کی طرح خشک ہوں گی۔ بات ایسی نہیں ہے، یہ ضرور ہے کہ جب کوئی علمی یا تحقیقی موضوع ہوتا ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے گفتگو کرتے ہیں، لیکن عام قسم کی گفتگو کو وہ خوش طبعی و ہلکے مزاح سے دلچسپ بنا دیتے ہیں"۔ (۱)

جناب سید محمد حسنین کا فرمان ہے کہ علامہ اقبال نے مرد مومن کا جو تصور پیش کیا ہے، اس کا اطلاق بلا تامل قاضی عبدالودود پر کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اس میں سے احکامِ شرعیہ کی پابندی کی شرط ہٹالی جائے۔ فرماتے ہیں:

"اقبال کا مردِ مومن احکام شرعی سے مبرا ہو کر اگر بشری اوصاف کے ساتھ

---

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۷۶ ۱۹ء) ص ۲۷۹۔۲۸۰

Marfat.com

ظہور لے سکتا ہے تو اسے جناب قاضی عبدالودودؒ بیرسٹر کا قالب اختیار کرنے میں جھجک نہ ہوگی۔ دلیری و بیباکی، حق بینی و بیانی، ذوق یقین اور جد و جہد جیسے مومنانہ صفات کی تلاش و دید میں یہاں کاوش کی ضرورت نہیں۔ جو قاضی صاحب کو جانتا ہے اور جس نے ان کے روز و شب کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا ہے وہ ان کے کردار کی خصوصیات بالا سے انکار نہیں کر سکتا"۔(۱)

پروفیسر امیر حسن عابدی، جنھیں قاضی صاحب سے بڑا قرب حاصل تھا اور جنھوں نے قاضی صاحب کو خلوت و جلوت میں بڑے نزدیک سے دیکھا تھا، ان کا کہنا ہے کہ دور سے دیکھنے والوں کو قاضی صاحب ذرا ڈراؤنے نظر آتے ہیں، لیکن قریب سے دیکھنے پر وہ بڑے خوش خلق، خوش گفتار، خوش مزاج اور مخلص انسان نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"قاضی صاحب باہر سے بہت ہیبت ناک اور ڈراؤنے لگتے، مگر قریب سے انتہائی شیریں، خوش مزاج مخلص، زبردست محقق، محبت سے بھرے بے مثل انسان تھے۔ خداوندِ عالم نے انھیں گھر اور سسرال دونوں طرف سے آسودگی عنایت کی تھی۔ اس لئے وہ زندگی کی تگ و دو سے ناآشنا اور بے نیاز تھے۔ انھیں ہم لوگوں کی مشکلات کا اندازہ بھی نہ تھا۔ انھیں تصنع بناوٹ سے سخت نفرت تھی۔ ایک پروفیسر صاحب جو کبھی اپنے کو ودودی کہتے تھے، ہمیشہ ان سے صرف اپنے اغراض کی وجہ سے ملتے اور ان سے صرف فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تھے، جس کا علم انھیں ہو گیا اور پھر انھیں کبھی معاف نہیں کیا"۔(۲)

آپ کے نزدیک قاضی صاحب کی شخصیت بڑی تہ دار تھی جس کی گہرائیوں تک پہنچنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ یہی حال ان کی تحریروں کا بھی ہے۔ فرماتے ہیں:

"قاضی عبدالودود صاحب مرحوم کی شخصیت ایک دریائے ناپیدا کنار تھی جس کی تہوں تک بھی آسانی سے پہنچا نہیں جا سکتا۔ نیز ان کی تحریروں کے سمجھنے کے لئے غیر معمولی لیاقت کی ضرورت ہے"(۳)

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۲۲۲
(۲) غالب نامہ (قاضی عبدالودود نمبر۔ ۱۹۸۷ء) ص ۶۳
(۳) غالب نامہ (قاضی عبدالودود نمبر۔ ۱۹۸۷ء) ص ۶۴

Marfat.com

قاضی صاحب بڑے مخلص اور ہمدرد انسان تھے۔ ان کا بہت بڑا وصف یہ بھی تھا کہ وہ لوگوں کو بہترین مشورے بھی دیتے تھے۔ جو حضرات اپنے ذاتی معاملات میں ان سے مشورہ لیتے یا ان کی رہنمائی کے جویا ہوتے تو قاضی صاحب کبھی اس سے دریغ نہ کرتے۔ ایسے مواقع پر وہ ضرور سرپرستی فرماتے۔ ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جب لوگون نے ان کے مشوروں پر عمل کیا اور کامیابی حاصل کی۔ اسی قسم کا ایک واقعہ جناب دوارکا پرشاد شعلہ نے تحریر کیا ہے، اس سلسلے میں ان کے مضمون بعنوان 'قاضی عبدالودود'، سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اقتباس ہے تو ذرا طویل، لیکن پوری بات کو کماحقہ' سمجھنے کے لئے اسے باوجود اس کی طوالت کے مکمل نقل کرنا ناگزیر ہے۔ ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں :

"قاضی صاحب صرف ادبی اور فنی معاملوں ہی میں صایب الرائے بزرگ نہیں ،بلکہ نجی اور دنیاداری کے معاملے میں بھی ایسی رائے دیتے ہیں جو ہمیشہ مفید ہوتی ہے۔ میں نے اکثر اپنے ذاتی یا کاروباری مسئلوں پر ان کی ہدایت چاہی۔ انھوں نے جو کچھ بھی کہا آخر اسی پر عمل کرنا پڑا کہ اس کے سوا ہر راہ خسارے کی طرف لے جاتی تھی۔ اگست ۱۹۶۵ء میں میرے ایک بڑے ہونہار اور سعادتمند بھتیجے کا امریکہ میں انتقال ہو گیا اور ۱۹۶۶ء کے آغاز میں بچے کی جوانا مرگی کا صدمہ برداشت نہ کر سکنے کے باعث اس کے باپ کا بھی انتقال ہو گیا۔ لالہ درگاداس میرے بھائی تو تھے ہی مگر یہ خوبی انھیں سے متعلق تھی کہ تقسیم کاروبار کی گرما گرمی کے باوجود وہ میرے دست وبازو کی حیثیت رکھتے تھے اور ہر مشکل میں آڑے آتے تھے۔ ان دونوں کی موت سے میں سخت دکھی ہوا.........ان ہی دنوں قاضی صاحب آئے۔ حالات کو دیکھا، معاملات کا جائزہ لیا اور مشورہ دیا کہ اس سے پہلے کہ تمام کاروبار غارت ہو جائے، اسے یا تو بیچ ڈالو یا کوئی قابلِ اعتماد شریک لے لو۔ اپنی رائے کے حسن وقبح کو اس خوبی سے واضح فرمایا کہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ میری بیوی اور چند دوسرے خیر اندیشوں کو اختلاف تھا کہ لے دے کر یہ دوکان ہی اب میرے پاس رہ گئی تھی اور اسی سے گھر کا خرچ چل رہا تھا۔ مگر اس بات کو وہ بھی بھول رہے تھے کہ آمدنی جو محنت چاہتی

Marfat.com

ہے اس کی ہمت مجھ میں دن بہ دن کم ہو رہی تھی اور یہ بھی کہ اگر میرے بھائی کا، جو عمر میں مجھ سے کہیں چھوٹے تھے، اچانک انتقال ہو سکتا ہے تو میرا کیوں نہیں ہو سکتا۔ دوکان کی قیمت اگر اب لاکھ روپیہ مل سکتی تھی تو میرے مرنے پر دس ہزار بھی نہ ملیں گے...... جب قاضی صاحب کے سمجھائے ہوئے سب نکتے میں نے عزیزوں کے سامنے رکھے تو وہ مان تو گئے مگر پھر بھی کہتے تھے کہ باپ کے نام کو بیچ دوگے تو بڑی بے آبروئی ہوگی......... میں نے معاملہ پھر قاضی صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ فرمایا ان لوگوں کی لیت و لعل محض جذباتی ہے اور بے دلیل۔ مگر میں غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ اگر تم نے دوکان کو فروخت کر دیا تو روپے تو خیر مل جائیں گے مگر تمہارے صرفِ اوقات کی صورت کیا ہوگی۔ گھر میں پڑے پڑے کیا کروگے اور خاص طور پر کہ تم مصروفِ زندگی کے عادی ہو، بیکار رہنے سے بیمار پڑ جاؤ گے۔ میرے خیال میں تو کوئی شریک تلاش کرو۔ نصف حصہ دیدو، کچھ روپے بھی پاس ہو جائیں گے اور کام کا سلسلہ بھی چلتا رہے گا۔ میں نے رائے سے اتفاق کیا۔ گھر والوں کو جب قاضی صاحب کے نئے فیصلہ سے آگاہ کیا تو وہ بہت خوش ہوئے کہ نام بھی بچ جائے۔ کام بھی اور دام بھی۔ ہم بھائیوں میں ۱۹۶۲ء میں تقسیم املاک ہوئی تو اس سلسلہ میں قاضی صاحب کے مشورے بے حد مفید اور کارآمد ثابت ہوتے رہے"(۱)

اس کے علاوہ بھی قاضی صاحب کے صائب مشوروں کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان سب کو یہاں پیش کرنا غیر ضروری بھی ہوگا اور بے جا طوالت کا باعث بھی، لہذا اس سے اجتناب کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

وضع قطع: قاضی صاحب متوسط قد، گداز جسم اور پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ چہرے کا رنگ گندمی، کسی قدر سیاہی مائل تھا۔ پیشانی کشادہ، آنکھیں ابھری ہوئی اور روشن جن سے ذہانت اور ذکاوت جھلکتی تھی۔ ان کے چہرے سے ایک مدبر، دانشور، عالم اور بردبار شخص کا نقش ابھرتا تھا۔ انداز گفتگو نرم تھا۔ ان کے ہر انداز سے وقار ٹپکتا تھا۔ بات چیت عام طور پر سنجیدہ اور پُروقار انداز میں کرتے تھے۔ جب جولانی پر ہوتے تو بہت دلچسپ انداز میں

---

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۱۷۸۔۱۸۰

Marfat.com

گفتگو کرتے۔اس میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی ہوتی۔

دوسروں پر تیر و نشتر کی بارش بھی کرتے جاتے۔لیکن کوئی بات معیار سے فروتر نہیں ہوتی تھی۔ان کی ہنسی کبھی مسکراہٹ سے آگے نہ بڑھتی۔ان کی محفل میں قہقہہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔پروفیسر محمد حسن ان کی شوخی طبع، حس مزاح اور ظرافت کے بارے میں فرماتے ہیں :

"قاضی صاحب کی شخصیت کا ایک اور جوہر ان کی حس مزاح میں مضمر ہے۔یہ حس بظاہر قاضی صاحب کے ہاں نمایاں نہیں ہے لیکن در حقیقت ان کی شخصیت میں خاصی رچی بسی ہے۔ان کے سخت اور درشت ظاہری روپ کے پیچھے ایک نہایت لطیف اور دلچسپ شخصیت چھپی ہوئی ہے۔اندرا گاندھی وزیر اعظم ہوئیں تو قاضی صاحب نے ان کی اعلیٰ تعلیمی ڈگری نہ ہونے کے باوجود ملک کے اعلیٰ ترین منصب تک پہنچنے پر اظہار خیال کیا اور حافظؔ کا یہ شعر کسی نے سنایا تو پھڑک اٹھے اور اسے بار بار دُہراتے رہے :

نگارِ من کہ بہ مکتب نرفت و خط نہ نوشت

بہ غمزہ مسئلہ آموزِ صد مدرس شد

قاضی صاحب کو کوئی پُر لطف شخصیت مل جائے تو اس پر برابر برمحل جملے چپکاتے رہیں گے اور تفریح لیتے رہیں گے۔یوں بھی بعض لطائف وہ مزے لے لے کر سناتے ہیں"(۱)

پسندیدہ لباس: قاضی صاحب کی شخصیت میں بڑا دلچسپ تضاد تھا۔وہ مشرقی تہذیب کا بہترین نمونہ تھے۔اخلاق بہت وسیع اور خالص مشرقی طرز کا تھا۔ویسا ہی رکھ رکھاؤ اور اسی طرز کی معاشرت۔لیکن لباس اور غذا مغربی انداز کی انھیں زیادہ مرغوب تھی۔وہ شیروانی اور پاجامہ کے مقابلہ میں کوٹ اور پتلون کو زیادہ پسند کرتے تھے۔اور تقریبات میں انھیں ہی زیب تن فرمایا کرتے تھے۔ان کا مزاج درویشانہ تھا جو ظاہری نمائش اور دکھاوے سے بے نیاز تھا۔انھیں نہ کسی معاملہ میں ستائش کی تمنا تھی نہ کسی کام کے عوض صلے کی خواہش۔جناب محمد صدرالدین فضاؔ جنھیں قاضی صاحب کے کافی قریب رہنے کا شرف حاصل ہے۔فرماتے ہیں کہ انھیں دیکھ کر،ان کی مغربی وضع کے باوجود ایک درویش کی شخصیت سامنے آتی تھی جس سے کوئی شخص بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔اپنے مضمون "قاضی صا...

---

(۱) غالب نامہ (قاضی عبدالودود نمبر ۷ ۱۹۸ء) ص ۷۹

Marfat.com

جیسا میں انھیں دیکھ سکا" میں وہ لکھتے ہیں :

"قاضی صاحب کی شخصیت میں ایک عجیب کشش ہے جو دور رہنے اور نزدیک آنے کے ملے جلے جذبے سے بنی ہے۔ ان سے ملئے تو ملتے رہنے کی خواہش دل میں گھر کر جاتی ہے۔ ان کے بے ریا و بے نمائش طریقۂ بود و باش کا ہر ذی فہم پر اثر پڑتا ہے۔ انگریزی لباس اور وضع قطع کے باوجود ایک درویشانہ انداز ہے جو دلوں کو مسحور کر لیتا ہے انگریزی لباس میں ملبوس ایک سادھو کہہ ڈالئے تو شاید غلط نہ ہو"۔ (۱)

مرغوب غذائیں: قاضی صاحب کو مغربی کھانے زیادہ مرغوب تھے اور ان میں بھی وہ فرانسیسی کھانوں کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ ہندوستانی کھانوں میں آپ کبابوں کے زیادہ شوقین تھے۔ پھلوں میں سب سے زیادہ آم مرغوب تھے۔ پروفیسر مختار الدین احمد نے لکھا ہے کہ مرغ ان کی پسندیدہ غذا ہے اور آموں میں سپیا آم زیادہ پسند فرماتے ہیں :

"ہندوستانی کھانوں میں بریانی اور مرغ ان کی محبوب غذا ہے۔ ویسے وہ یورپی کھانے خاص طور پر فرانسیسی کھانے بہت پسند کرتے ہیں۔ پھلوں میں آم اور آموں میں لنگڑا نہیں، بلکہ سپیا (بہار کا ایک بہت لذیذ آم) انھیں مرغوب ہے۔ پان کبھی نہیں کھاتے۔ ٹرکش سگریٹ پہلے پیتے تھے لیکن مدتوں سے ترک کر رکھی ہے۔ اب انھیں کسی کھیل سے دلچسپی نہیں۔ کیمبرج میں بہت اچھے شطرنج کھیلنے والوں میں شمار کیے جاتے تھے اور انعام میں کالج کلر بھی ملا تھا۔ جب وہ بیرسٹری کرتے تھے تو کلب جانے کا التزام کرتے تھے اور برج شوق سے کھیلتے تھے۔ اب یہی وقت وہ کتب خانۂ خدا بخش بانکی پور کو دیتے ہیں اور قلمی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ صبح کی سیر اور روزانہ غسل کرنے کا انھیں کوئی شوق نہیں۔ پھولوں کے علاوہ ان کے کسی خاص شوق کا مجھے علم نہیں۔ نادر کتابیں وہ خریدتے ہیں، پڑھتے ہیں، فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن انھیں جمع کرنے اور اپنے مکان کو نمائش گاہ بنانے کا خیال کبھی نہیں ہوا" (۲)

---

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۷۶-۱۹۷۷ء) ص ۲۸۱

(۲)(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۷۶-۱۹۷۷ء) ص ۱۳۸-۱۳۹

Marfat.com

لیکن خود قاضی صاحب نے اس بات کی تردید کی ہے کہ مرغ ان کی پسندیدہ غذا ہے اور یہ کہ آموں میں سپیا آم کو وہ سب سے زیادہ مرغوب رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں :

"میں مغربی لباس پہنتا ہوں، مغربی کھانے کو بحیثیت مجموعی مشرقی کھانوں پر ترجیح دیتا ہوں۔ یہ صحیح نہیں (جیسا کہ پروفیسر مختار الدین احمد نے لکھا ہے) کہ میری محبوب غذا مرغ پلاؤ ہے۔ مشرقی کھانوں میں، میں کباب کو بہت پسند کرتا ہوں۔ بعض اوقات مجھے جانوروں کا گوشت کھانا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ میں نے ایک بار مہینوں تک گوشت نہ کھایا۔ مگر اس پر قائم نہ رہ سکا۔ آم میرا محبوب پھل ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ میرے نزدیک سب سے اچھا آم سپیا ہے (بہ قول پروفیسر مختار الدین احمد) کم از کم دس آم ہیں جنھیں میں اس سے بہتر سمجھتا ہوں۔ سگار کا مجھے شوق نہیں رہا۔ چار، پانچ برس سے میں نے سگریٹ پینا بالکل بند کر دیا ہے۔ اور اسے مجھے تکلیف نہیں ہوئی"۔ (۱)

شراب نوشی : انگلستان کے دوران قیام قاضی صاحب نے دخترِ رز کو بھی منہ لگایا تھا۔ اور اس شغل میں وہ کافی آگے بھی بڑھ گئے تھے، لیکن ہندوستان واپس آکر اسے بالکل ترک کر دیا اس لئے نہیں کہ اسے وہ بُرا فعل سمجھتے تھے، بلکہ اس لئے کہ کثرتِ استعمال سے ان کی صحت پر اس کے بُرے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ فرماتے ہیں :

"شراب میں نے کیمبرج میں پینی شروع کی۔ وہاں میرے بہت کم دوست تھے جو نہ پیتے ہوں۔ میں دو، تین بار حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گیا اور اس کا بُرا اثر ہوا۔ اس کے بعد میں نے کبھی زیادہ نہیں پی۔ میں برگنڈی کو اور شرابوں کی بہ نسبت زیادہ پسند کرتا تھا۔ دو، تین برس سے میں نے شراب پینی بالکل بند کر دیا ہے۔ اس سے مجھے کچھ تکلیف نہیں ہوئی"۔ (۲)

تفریحی مشاغل : طالب علمی کے زمانے میں قاضی صاحب تفریح اور کھیلوں کے کافی شوقین تھے۔ کھیلوں میں ٹینس اور کرکٹ سے زیادہ لگاؤ تھا۔ انگلینڈ میں جب حصول تعلیم کی غرض سے مقیم تھے تو وہاں شطرنج اور برج زیادہ کھیلا کرتے تھے۔ ہندوستان واپس آنے

---

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۲۵
(۲) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۲۵

Marfat.com

کے بعد بھی ان کھیلوں سے دلچسپی رہی خصوصیت سے برج بہت کھیلا کرتے تھے۔ لیکن جب وادیٔ تحقیق و تنقید میں داخل ہوئے اور علمی مشاغل زیادہ بڑھ گئے تو رفتہ رفتہ تمام کھیلوں کی طرف سے منہ موڑ لیا اور صرف لکھنے اور پڑھنے کے ہو کر رہ گئے اور یہی ان کا واحد مشغلہ بن گیا۔ پروفیسر مختار الدین احمد نے لکھا ہے کہ کیمبرج کے قیام کے دوران قاضی صاحب شطرنج بہت اچھا کھیلا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کے مضمون سے اقتباس پچھلے صفحہ میں نقل ہو چکا ہے۔ لیکن خود قاضی صاحب کی تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ اس میں کچھ زیادہ مہارت نہیں رکھتے تھے۔ فرماتے ہیں :

"کریکٹ اور ٹینس وغیرہ کھیلے۔ لیکن اس قسم کے کسی کھیل میں آگے نہ بڑھ سکا اور میں نے انھیں کھیلنا ترک کر دیا۔ شطرنج کا مجھے بہت شوق تھا لیکن میں اچھا شاطر نہ بن سکا اور مدتوں سے میں نے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ برج میں نے انگلستان جاتے ہوئے جہاز پر سیکھا اور اس کے بعد یہ میرا محبوب کھیل ہو گیا۔ نہ جانے کتنی بار میں نے رات رات بھر برج کھیلا ہے اس کا شوق ہندوستان واپسی کے بعد بھی رہا۔ مگر اب سے کچھ تعلق نہیں۔ گزشتہ ۳۵ سال میں میں نے صرف ایک بار برج کھیلا ہے"۔(۱)

معمولات یومیہ: قاضی صاحب جب مطالعے اور تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوئے تو انھوں نے اپنی زندگی کو بہت محدود کر لیا اور زندگی کے معمولات کو بہت ہی مختصر کر لیا۔ اس کی وجہ سے ان کی زندگی بڑی منظم اور منضبط ہو گئی تھی۔ وہ نسبتاً سادہ زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ وہ صبح سویرے اُٹھنے کے عادی تھے۔ ناشتہ مختصر کرتے تھے۔ صبح کی چائے کے بعد وہ اپنے مطالعہ میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے جاتے تھے۔ چونکہ ان کے کام کا اصل میدان تحقیق تھا، اس لئے انھیں مختلف کتابوں کی ضرورت بار بار پیش آتی تھی۔ لہذا جب وہ کام شروع کرتے تھے تو رفتہ رفتہ ان کے ارد گرد کتابوں کا ڈھیر لگ جاتا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے وہ کرسی میز پر کام کرنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ مسہری پر بیٹھ کر لکھنے اور پڑھنے کا کام کرتے تھے اس لئے کہ مسہری پر کتابیں پھیلانے کی گنجائش زیادہ رہتی ہے۔ صبح سے دوپہر تک مسلسل وہ مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں مصروف

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۷۶ ۱۹ء) ص ۲۵۔۲۶

Marfat.com

رہتے تھے۔ دوپہر میں کھانا وہیں تناول فرماتے۔ مسہری کے سامنے اسٹول رکھ دیا جاتا اور مسہری پر بیٹھ کر وہ کھانا کھاتے۔ اور چونکہ مسہری پر آس پاس کی کرسیوں پر اور اسٹول وغیرہ پر ہر طرف کتابیں بکھری پڑی رہتی تھیں اس لئے کھانا رکھنے کے لئے اسٹول خالی کرنے میں ہمیشہ دقت پیش آتی۔ قاضی صاحب کھانا بہت جلد کھا لیتے۔ وہ کھانے، غسل کرنے اور کپڑے وغیرہ بدلنے میں کم سے کم وقت صرف کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کھانے کے دوران ان کا ملازم پنکھا جھلتا رہتا تھا۔ کھانے میں سوپ ضرور ہوتا، گوشت میں مرغ اکثر ہوتا۔ اس کے علاوہ پلاؤ بھی ہوتا۔ شیرینی ضرور ہوتی، چاہے بہ شکل پڈنگ یا فرنی۔ اور آخر میں پھل ضرور لیتے۔ پھلوں میں، جیسا کہ گزشتہ صفحات میں عرض کیا گیا، آم زیادہ پسند کرتے تھے۔ ان کے علاوہ سردہ، ناشپاتی، اسٹرابری، چری، سنگترہ اور اناناس بھی انھیں مرغوب تھے۔ پھل وہ اپنے ہاتھ سے ہی تراشتے۔ کسی دوسرے کے ہاتھ سے کٹے ہوئے پھل انھیں پسند نہیں آتے تھے۔ کھانے میں مجموعی طور پر وہ پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگاتے تھے۔ موسم گرما میں تھوڑا قیلولہ بھی کرتے تھے۔ سوتے نہیں تھے۔ مختصر سے وقفہ لیٹ کر وہ اٹھ جاتے تھے اور پھر مطالعے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ سہ پہر میں ٹھیک چار بجے چائے نوش فرماتے تھے۔ اگر اس وقت ان کے پاس کوئی مہمان ہوتا تو اس کے لئے چائے کے ساتھ، حسبِ مراتب، پھل اور مٹھائی وغیرہ بھی ہوتی۔ لیکن خود قاضی صاحب چائے کے علاوہ کچھ اور نہیں لیتے تھے۔ اگر طبیعت میں کبھی اضمحلال ہوتا، تو چائے کے ایک گلاس دودھ لیتے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر چہل قدمی فرماتے، اور پھر اپنے کام میں منہمک ہو جاتے۔ رات کا کھانا نو بجے سے پہلے کھا لیا کرتے تھے۔ اور رات میں دس بجے وہ سونے کو لیٹ جاتے تھے۔ اس طرح ۲۴ گھنٹے میں وہ زیادہ وقت علمی کاموں میں صرف کرتے ۔ اور سب سے کم وقت کھانے پر۔ زندگی چونکہ بہت منظم طریقہ پر گزارتے تھے، اس لئے صحت عام طور پر اچھی نہ رہنے کے باوجود، عمر خاصی طویل پائی۔

احباب: قاضی صاحب کے احباب کی تعداد بہت کم تھی۔ انھیں بڑی آسانی سے انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا ہے۔ البتہ نیاز مندوں اور معتقدوں کی تعداد بے شمار ہے۔ احباب کی تعداد اتنی مختصر ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ سوشل نہیں تھے۔ بڑی بڑی محفلیں جمانا

Marfat.com

انھیں پسند نہیں تھا۔ وہ تقریبات میں بھی کم ہی شرکت کرتے تھے۔ مشاعروں وغیرہ میں نہیں جاتے تھے۔ ان کے خیال میں ان سے وقت ضائع ہوتا تھا۔ انھوں نے بڑی حد تک اپنی زندگی کو مطالعے کے کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ اس لئے ان کے ملاقاتیوں کی تعداد ہمیشہ کم رہی۔ اس کے علاوہ ایک اہم سبب یہ بھی رہا کہ قاضی صاحب صاف گو انسان تھے۔ وہ لگی لپٹی رکھنے کے قائل نہیں تھے۔ ان کی یہ صاف گوئی عام طور پر لوگوں کو پسند نہیں آتی تھی۔ لہٰذا جو حضرات ان کے قریب ہوتے تھے، یا جن سے ان کی رسم وراہ زیادہ ہوتی، وہ قاضی صاحب کی اصول پسندی اور صاف گوئی کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتے تھے اور یا تو ان سے بد ظن ہو جاتے، یا پھر ان سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے تھے۔ اور پھر یہ کہ وہ کوئی گروہ بند انسان بھی نہیں تھے کہ بے جا کسی کی نازبرداری کرتے اور اپنا حلقہ بناتے۔

قاضی صاحب کا کوئی سیاسی حلقہ بھی نہیں تھا۔ نہ ہی ادب میں وہ کسی مخصوص گروہ کی پیروی کرتے تھے۔ وہ نقد و تحقیق میں کسی خاص دبستان سے بھی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ وہ تو خود اپنی ذات سے ایک انجمن اور دبستان تھے۔ ان کی پسند اور ناپسند صرف ان کے اپنے مزاج کی پابند اور طبیعت کی تابع تھی۔ اس میں کوئی دنیاوی غرض یا سیاسی مصلحت شامل نہیں ہوتی تھی۔ وہ نہ بے جا کسی کی تعریف کرتے تھے، نہ خود اپنی ستائش پسند کرتے تھے اور نہ کبھی اپنے بارے میں تعلی سے کام لیتے تھے۔ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنی تعریف کا کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ ظاہر ہے ایسے خشک انسان کے احباب کا حلقہ کس طرح وسیع ہو سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے مخلص دوستوں میں بیرسٹر نورالدین احمد اور جناب فخرالدین علی احمد مرحوم صدر جمہوریہ ہند سر فہرست تھے۔ یہ دونوں حضرات ان کے کیمبرج کے ساتھیوں میں تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین سے بھی آپ کے خصوصی مراسم تھے لیکن اس میں ادب اور احترام کو زیادہ دخل تھا، جب کہ نورالدین صاحب اور فخرالدین صاحب کے ساتھ تعلقات میں اخلاص اور محبت اور معاصرانہ بے تکلفی شامل تھی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر نظام الدین (حیدر آباد)، مسٹر فیضی (بمبئی)، کرنل بشیر حسین زیدی (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)، جناب عمر حیات، جناب واجد محمود، اور ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کو بھی قاضی صاحب کے مخلص دوستوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

ان میں صرف ذاکر حسین صاحب ہی واحد شخصیت تھے جن کا مشورہ قاضی صاحب بے چوں وچرا قبول کر لیا کرتے تھے۔اسی طرح بحیثیت ایک دانشور اور اسکالر ذاکر حسین ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ جناب محمد ذکی الحق نے اپنے مضمون ''قاضی صاحب'' میں ان کے احباب کا تذکرہ کافی تفصیل سے کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''میں نے قاضی صاحب کو تم کر کے مخاطب کرنے والوں میں صرف دو، تین آدمیوں کو دیکھا ہے۔ایک مسٹر حیدر امام بار ایٹ لا پٹنہ اور دوسرے مسٹر نورالدین بار ایٹ لا سپریم کورٹ دہلی۔ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی مرحوم قاضی صاحب سے عمر میں تقریباً دو سال بڑے تھے۔یہ دونوں بچپن میں ساتھ رہے تھے۔قاضی صاحب کے والد قاضی عبدالوحید صاحب کے قائم کیے ہوئے مدرسہ میں ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی نے درسیات کی کتابیں پڑھی تھیں۔ان دونوں میں بڑے مراسم اور روابط تھے۔صدیقی صاحب قاضی صاحب کو تم ہی کہتے تھے۔ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب کو حکومتِ بہار نے انگلستان جاکر تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایک معقول اسکالر شپ دی تھی۔اس لئے وہ قاضی صاحب سے تقریباً ایک سال قبل انگلستان گئے تھے۔ قاضی صاحب انگلستان تشریف لے گئے تو وہ ڈاکٹر زبیر صدیقی کے مہمان رہے اور انھیں کے مشورے سے پہلے مڈل ٹیمپل میں، پھر کیمبرج میں داخلہ لیا۔ قاضی صاحب کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی ان کے دوست تھے......ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور قاضی صاحب کے درمیان دوستی تھی، لیکن بے تکلفی نہ تھی۔ذاکر صاحب محبی، لکھا کرتے تھے...... محمود شیر صاحب قاضی صاحب کے ہم محلہ تھے اور ہم عمر بھی تھے۔اس لئے ان سے خوب تعلقات اور مراسم تھے۔ محمود شیر صاحب ترکِ موالات کی تحریک میں خوب پیش پیش تھے۔ قاضی صاحب بھی سیاسی تگ ودو میں ان کے ساتھ رہے عزت مآب فخر الدین علی احمد صاحب اور قاضی صاحب کے درمیان تعلقات دوستانہ ہیں''۔(۱)

ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈائریکٹر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ نے اپنے مخصوص

---

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۲۶۰-۲۶۱

Marfat.com

انداز میں قاضی صاحب کے احباب کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے :

"ذاکر صاحب ہم عصروں میں، واجد علی خاں کیمبرج کے ساتھیوں میں، مسٹر نورالدین احمد اور مسٹر فخرالدین علی احمد بے تکلف قریب ترین دوستوں اور مولانا محمد علی بزرگوں میں، وہ لوگ ہیں جن کا ذکر قاضی صاحب بڑی محبت سے کرتے ہیں۔ اور میرا اندازہ ہے کہ ذاکر صاحب کو تو شاید وہ محبت سے آگے احترام کا درجہ دیتے ہیں اور نورالدین صاحب وہ تنہا شخص ہیں، میں نے دیکھا جو قاضی صاحب کو ان کے منہ پر بڑے پیار سے کتنی ہی صفات سے متصف کرتے ہوتے تھے ج[illegible]ں سے کوئی ایک صفت کسی دوسرے کی زبان پر آجاتی تو قاضی صاحب ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ کردیتے۔ مگر یہاں سنتے رہتے اور مسکراتے رہتے۔ دونوں دوست ایک دوسرے کو ٹوٹ کے پیار کرتے تھے اور کتنا طویل المدت رشتہ تھا یہ ! کالج کا سا[illegible]ء عمر بھر کا ساتھ ہو گیا تھا۔ یوں کہنے کو کیمبرج کے دوستوں میں ڈاکٹر نظام الدین (حیدرآباد) بھی تھے۔ فیضی (بمبئی) بھی، کرنل زیدی بھی، عمر حیات ملک بھی، واجد محمود بھی، لیکن پرانی دہلی کے بیرسٹر نورالدین احمد سے جیسی نبھی، اس کے آس پاس کچھ پہنچ جاتے ہیں تو بس فخرالدین علی احمد۔ لیکن پھر بھی کتنا بڑا فرق رہ جاتا ہے تم سے تم کے رشتہ میں اور تم سے آپ کے رشتہ میں"۔ (۱)

خود قاضی صاحب کی کوئی تحریر اپنے دوستوں کے متعلق نہیں ملتی، البتہ زبیر صدیقی کے انتقال پر انھوں نے اپنے تاثرات ضرور قلم بند کئے جو پٹنہ کے ہفت روزہ اخبار 'اورنگ' میں شائع ہوئے تھے۔ اس میں قاضی صاحب فرماتے ہیں :

"محمد زبیر صدیقی میرے قدیم ترین دوست تھے۔ ان کے والد حکیم محمد اسحٰق اور میرے والد قاضی عبدالوحید میں گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ محمد زبیر صدیقی عمر میں مجھ سے برس، چھ مہینے بڑے تھے، ہم دونوں بچے ہی تھے کہ دوستی ہو گئی"۔ (۲)

افتاد طبع : قاضی صاحب نازک مزاج اور اصول پسند انسان تھے۔ آپ کی یہ

---

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۳۰۲

(۲) اورنگ (پٹنہ) جلد ۴ شمارہ ۱۵۔۱۶ ص ۲۔

Marfat.com

نازک مزاجی اور اصول پسندی آگے چل کر اصول پرستی کے حدود میں داخل ہو گئی تھی۔ اصول کے خلاف معمولی سی معمولی بات بھی انھیں سخت ناگوار گزرتی تھی۔ چھوٹی سے چھوٹی بات کا بھی وہ سخت نوٹس لیتے اور اسے شدید تنقید کا نشانہ بناتے۔ ان کے نزدیک اصول وہ تھے، جو خود انھوں نے وضع کئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر شخص ان ہی کے وضع کردہ اصول کی سختی سے پابندی کرے۔ ان کے یہاں رعایت اور مروت کا کوئی خانہ نہیں تھا۔ اسی لئے ان کی تحریروں میں بھی سخت گیری پائی جاتی ہے۔ تحریر کے علاوہ وہ گفتگو میں بھی لوگوں پر بے محابا تنقید کر دیتے تھے اور اس بات کا پاس لحاظ بھی نہیں کرتے تھے کہ جو شخص ان کی تنقید کا نشانہ بن رہا ہے، اس سے مخاطب کا کیا تعلق یا رشتہ ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے اپنے مضمون اردو میں تحقیق کی روایت اور قاضی عبدالودود، میں اسی نوع کا ان کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ایک بار وہ مولانا آزاد لائبریری میں بیٹھے مطالعہ کر رہے تھے۔ کسی نے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ یہ واجد علی شاہ پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا "وہ تو ایک لغو اور پوچ آدمی تھا۔ آپ نے ریسرچ کے لئے اس کا انتخاب کیوں کیا" تعارف کرانے والے ایسے سادہ لوح تھے کہ انھوں نے یہ بھی بتا دیا کہ یہ واجد علی شاہ کے پوتے ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا یہ بات آپ کو پہلے ہی بتا دینی چاہیے تھی تاکہ میں اپنی اس رائے کا اظہار نہ کرتا۔ پھر ان سے کہنے لگے کہ میری رائے تو وہی ہے جو آپ نے سنی لیکن اگر مجھے علم ہوتا کہ آپ ان کے پوتے ہیں تو میں آپ کے سامنے اس کا اظہار نہ کرتا۔ اب اظہار کیا ہے تو یہ بھی سُن لیجئے کہ میں ایسا کیوں سمجھتا ہوں۔ جب واجد علی شاہ مٹیا برج کلکتہ میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے تو ان کے حرم کی بعض خواتین لکھنؤ ہی میں رہ گئی تھیں اور وہاں سے عاشقانہ خطوط لکھتی تھیں جن کا جواب بادشاہ بھی ویسے ہی والہانہ انداز میں دیتے تھے۔ کسی گمنام شخص نے واجد علی شاہ کو لکھنؤ سے خط لکھا اور ان کے حرم کی ایک خاتون پر الزام لگایا کہ وہ فلاں شخص سے ناجائز علاقہ رکھتی ہے۔ چوں کہ اس شخص نے اپنا نام پتہ نہیں لکھا تھا واجد علی شاہ نے اس خط کا منظوم جواب لکھا اور اپنے مطبعِ سلطانی سے چھپوایا جس میں ایک جگہ کہتے ہیں کہ تو میری حرم پر کس

Marfat.com

منہ سے الزام لگاتا ہے، تیرے فلاں شعر میں الف دب رہا ہے" اب قاضی صاحب نے ان کے پوتے سے پوچھا کہ بتائے ایسی بات کوئی پوچ آدمی ہی کہے گا یا نہیں!"(۱)

قاضی صاحب کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ اپنے مزاج کے خلاف جو بات دیکھتے اس پر بے لاگ تنقید کر دیتے تھے۔ اور چونکہ ان کی تنقید بر بنائے اخلاص ہوتی تھی اس لئے لوگ اس کو انگیز کر لیتے تھے۔ لیکن خود قاضی صاحب اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کر سکتے تھے، نہ اپنے اوپر تنقید برداشت کرتے تھے، نہ کسی ایسی محفل میں جانا پسند کرتے تھے جہاں ان کی رائے سے اختلاف کرنے والے موجود ہوتے۔ چنانچہ وہ کتنی ہی کمیٹیوں اور متعدد بورڈوں کے ممبر بنائے گئے۔ شروع میں وہ ہر ایک میں دلچسپی لیتے۔ لیکن جب دیکھتے کہ دوسرے ممبران ان کی رائے سے اختلاف کر رہے ہیں تو وہ اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے۔ ان کے مزاج میں تخریب کاری نہیں تھی، اس لئے خاموشی سے وہ علیٰحدہ ہو جاتے تھے اور پھر بے تعلق و بے نیاز ہو جاتے۔ نہ اس کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی کرتے اور نہ اعلیٰ افسران سے مل کر اسے زیر کرنے کی اسکیمیں بناتے۔ اس سلسلے میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

"موجودہ صدی کی پانچویں دہائی کے اواخر اور چھٹی دہائی کے اوائل میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے تاریخ ادب اردو کی از سر نو ترتیب و اشاعت کا منصوبہ بنایا۔ اس کی رو سے کئی جلدوں میں یہ مبسوط تاریخ لکھی جاتی تھی۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اس کے لئے ایک معقول رقم بطور امداد منظور کی اسی کی ہدایت پر ایک مشاورتی کمیٹی بھی تشکیل دی گئی جس میں اردو کے نامور محقق، ادیب، ناقد اور دانشور شامل تھے۔ ان میں قاضی عبدالودود بھی تھے۔ انھوں نے اس کی مشاورتی کمیٹی کے ابتدائی جلسوں میں شرکت کی اور کارروائی میں بڑی دلچسپی لی۔ اس کا کلیدی موضوع اردو ادب کی تاریخ کے ادوار کا تعین تھا۔ قاضی صاحب نے اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا لیکن ان کی رائے سے بہت سے ممبران نے اختلاف کیا۔ قاضی صاحب کو یہ بات پسند نہ آئی اور اس کے بعد انھوں نے کسی اور میٹنگ میں شرکت نہ کی اور خاموشی سے اس مشاورتی کمیٹی سے خود کو علیٰحدہ کر لیا۔

اسی طرح جناب فخرالدین علی احمد کی کوششوں سے پٹنہ میں جب بہار اردو اکیڈمی وجود میں آئی۔

---

(۱) غالب نامہ (قاضی عبدالودود نمبر ۷ ۱۹۸ء) ص ۱۲۲

Marfat.com

اس زمانہ میں جناب دیو کانت بروا صوبۂ بہار کے گورنر تھے۔ وہ قاضی صاحب سے ذاتی طور سے واقف اور ان کی علمیت کے معترف تھے۔ انھوں نے فخر الدین صاحب کے ایما پر قاضی صاحب کو بھی اس کی مجلس منتظمہ کا رکن نامزد کیا۔ ابتدا میں قاضی صاحب نے اسے بھر پور تعاون کیا لیکن بعد میں وہ اس کے دیگر ممبران کے رویہ اور طریقِ کار سے دل برداشتہ ہو گئے اور جلسوں میں شرکت کرنا چھوڑ دی۔ گورنر صاحب اس کے چیرمین تھے۔ انھوں نے ذاتی مراسم کی بناء پر قاضی صاحب سے متعدد بار شرکت کی استدعاء کی لیکن قاضی صاحب نے نہ صرف ان درخواستوں کو نظر انداز کر دیا۔ بلکہ اکیڈمی کی رکنیت سے ہی استعفٰی دیدیا۔

اسی نوع کا رویہ انھوں نے گجرال کمیٹی کے ساتھ بھی روا رکھا۔ ایک بار اس کمیٹی نے بہار میں اردو کی صورت حال جاننے کے لئے وہاں کا دورہ کیا۔ پٹنہ میں اس کی میٹنگ ہوئی۔ قاضی صاحب کو بھی خصوصی طور پر اس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ لیکن انھوں نے اس دعوت کو در خورِ اعتنا نہ سمجھا اور شرکت کی زحمت گوارانہ فرمائی۔ جب لوگوں نے ان سے شرکت کے لئے اصرار کیا تو فرمانے لگے کہ کمیشن کا کیا مطلب ؟ اردو کا مقدمہ تو مدتوں پہلے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کی سرکار میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اب تو اس پر فیصلے اور نفاذ کی ضرورت ہے۔ اردو کی جو زبوں حالی ہے اس سے حکومت بے خبر نہیں ہے۔ اس نوع کی گفتگو انھوں نے اردو کے بہی خواہوں اور اپنے مخلصین سے کی اور باوجود بے انتہا خوشامد اور اصرار کے انھوں نے کمیشن کے جلسوں میں شرکت نہیں کی۔

اسی طرز کا ایک واقعہ جناب کلیم الدین احمد صاحب کے ساتھ بھی پیش آیا۔ وہ لکھتے ہیں :

"جو دنیا سے الگ رہے وہ دنیاداری نہیں جانتا۔ قاضی صاحب کا بھی یہی حال ہے۔ میں جب ڈی۔ پی۔ آئی تھا تو میں نے چاہا کہ ان سے کچھ دنیا کا کام لیا جائے لیکن ادبی قسم کا۔ انھیں گورنمنٹ نے گورنمنٹ اردو لائبریری کی مینجنگ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا اور پھر وہ خدا بخش لائبریری کی مینجنگ کمیٹی کے ممبر نامزد ہوئے لیکن اردو لائبریری میں یہ زیادہ دنوں تک نہ رہ سکے حالانکہ لائبریری کے سکریٹری ان کے دوست حیدر امام صاحب مینجنگ کمیٹی کی میٹنگ سال میں صرف ایک بار کیا کرتے تھے اور پھر سلطان

Marfat.com

احمد صاحب لائبریرین اپنی مرضی کے مطابق کتابیں لائبریری کے لئے خرید لیا کرتے تھے۔ قاضی صاحب نے کہا کہ کمیٹی کی میٹنگ سال میں کم سے کم دوبار ہوا کرے اور کتابوں کی فہرست ممبروں سے مانگ لی جائے اور اس کے مطابق کتابیں خریدی جائیں۔اس طرح اچھی اور کارآمد کتابیں لائبریری کے لئے لی جا سکیں گی۔ دونوں باتیں بہت معقول تھی لیکن حیدر امام صاحب نے ان باتوں پر دھیان نہیں دیا۔ قاضی صاحب نے استعفیٰ دیدیا"۔(۱)

قاضی صاحب کی افتادِ طبع اور معیار تحقیق کا ایک انتہائی دلچسپ واقعہ جناب محمد حسنین نے بیان کیا ہے۔ قاضی صاحب سے متعلق اپنے مضمون "......لیکن توچیزے دیگری" میں وہ لکھتے ہیں :

"پرنسپل فضل الرحمن کی توجہ سے قاضی صاحب بہار یونیورسٹی میں اردو ایم۔ اے کے اکزامنر مقرر ہوئے۔ قاضی صاحب رضامند نہ تھے۔ پرنسپل فضل الرحمن نے یہ کام میرے سپرد کیا۔ سوالات نجیب اشرف مرحوم نے بنائے تھے وہی پہلے ممتحن بھی تھے۔ جانچ کردہ کاپیاں قاضی صاحب کو بھیج دی گئیں۔نو، دس بجے شب میں عبدالغفور، قاضی صاحب کا ملازم میری تلاش میں گھر پہنچا۔ قاضی صاحب کا مژدہ تھا کہ صبح سات بجے ان سے ملوں۔ قاضی صاحب ان دنوں اپنی قیام گاہ کی نچلی منزل کے جنوبی کمرے میں ملاقات کرتے تھے۔ عبدالغفور نے مجھے اندر بٹھایا اور خود اطلاع کرنے اوپر چلا گیا۔ خلاف توقع مجھے اوپر ہی طلب کیا گیا۔ معمولات کی یہ بے ضابطگی غیر معمولی تھی.......... سلیپنگ سوٹ پر ڈریسنگ گاؤن ڈالے قاضی صاحب پشت کے کمرہ سے نمودار ہوئے۔ہاتھ میں بہار یونیورسٹی کا بڑا براؤن لفافہ تھا۔ مصافحہ کرتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پہلے وہ دروازہ بند کیا جس سے میں داخل ہوا تھا۔ پھر بیٹھتے ہوئے کہا، صاحب! میں سخت الجھن میں مبتلا ہو گیا ہوں اور اس کے ذمہ دار آپ بھی ہیں.....بتائیے میں کیا کروں؟ لفافہ سے دو، تین کاپیاں نکالیں۔ یہ جانچ کردہ تھیں میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا، دیکھیے، کتنے بیہودہ جوابات ہیں۔ یہ دانش گاہوں کے صاحبزادے ہیں۔ایسی بے سروپا باتیں لکھتے ہیں۔انھیں پڑھ کر صحت دماغ

(۱) غالب نامہ (قاضی عبدالودود نمبر ۷ ۱۹۸ء) ص ۳۶

Marfat.com

ختم ہو جائے۔ ایسی تعلیم کو موقوف ہی کر دینی چاہیے۔

قاضی صاحب جھلا رہے تھے۔ ان کی جانچ کردہ کاپیوں کو دیکھنے لگا۔ کاپیاں دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ ادبی انکشافات یا املائی اختراعات پر نہیں، اوراق کے ان سرخ اور نیلے کراس پر! ہر جگہ قاضی صاحب نے اغلاطِ مضمون، اغلاطِ بیان اور اغلاطِ املا کو رڈبلو پنسل سے چیر کر رکھ دیا تھا! سطریں داغدار تھیں۔ جہاں تہاں "بکواس، جہل مرکب، لغو" جیسے ریمارک علاحدہ تھے...... قاضی صاحب نے آمرانہ انداز میں کہا، میں ان کو جانچنا تضیع اوقات سمجھتا ہوں۔ آپ یہ کاپیاں واپس لے جائیں" (۱)

ڈاکٹر ذاکر حسین قاضی صاحب کا بڑا خیال رکھتے تھے اور ان کی علمیت اور ادبی لیاقت کے معترف بھی تھے۔ جس زمانے میں وہ بہار کے گورنر تھے تو دونوں کے تعلقات میں اور استواری آئی اور استحکام پیدا ہوا۔ ذاکر صاحب کو مرزا غالبؔ سے والہانہ عقیدت تھی۔ اسی زمانے میں انھوں نے قاضی صاحب سے فرمائش کی کہ وہ مرزا غالبؔ کی جملہ تصانیف کو مع حوالہ، حواشی اور مقدمہ ایڈٹ کریں پھر ان کو یکساں حجم اور سائز وغیرہ پر طبع کرا دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ایک جامع منصوبہ جناب کلیم الدین احمد نے بنایا۔ قاضی صاحب نے اس پر کام کرنا شروع کیا۔ اس کے لئے ذاکر صاحب نے بہار سرکار کی جانب سے ایک معقول رقم بھی ان کی خدمت میں پیش کر دی اور یہ بھی طے کر دیا کہ ان سے حساب نہیں لیا جائے گا۔ لیکن قاضی صاحب نے یہ کام مکمل کیا اور نہ حساب فہمی کی۔ البتہ 'برہان قاطع و رسائل متعلقہ' ضرور شائع ہوئی۔ لیکن اس میں بھی نہ مقدمہ، نہ حواشی، نہ طباعت و کتابت کا معیار بلند اور نہ کاغذ ہی اچھا۔ جناب کلیم الدین احمد نے اس پورے واقعہ کو ذرا سی تحریف کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:

"میں ڈی۔ پی۔ آئی تھا تو قاضی صاحب نے مجھ سے کہا کہ وہ غالبؔ کی تصانیف کو ایڈٹ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے اسکیم بنا کر گورنمنٹ سے منظوری لینے کی ضرورت تھی۔ لیکن میں نے کام شروع کرنے کے لئے پانچ ہزار روپے دیدیے۔ انھوں نے ذاکر صاحب سے بھی اس کا تذکرہ کیا تھا۔ انھوں نے مجھے بلا بھیجا اور کہا: کلیم صاحب کوئی صورت نکالئے۔ میں چاہتا ہوں کہ اچھا سا ایڈیشن ہو۔ آفسیٹ پر نٹنگ ہو

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۲۴۷۔۲۴۹

Marfat.com

کیونکہ یہ کام باربار ہو نہیں سکتا۔ اگر مجھ سے کسی سے پیروی کرنے کے لئے کہے گا تو میں کروں گا۔ میں نے کہا، میں کوشش کرتا ہوں۔ میں نے قاضی سعید سے کہا کہ ایک اسکیم بنا کر دیجئے۔ لیکن جو اسکیم انھوں نے بنائی وہ ناکافی تھی۔ میں نے خود ایک اسکیم بنائی۔ تفصیل کے ساتھ کتنی جلدیں ہوں گی، کتابت، طباعت، کاغذ، جلد بندی وغیرہ میں کیا خرچ ہوگا، مواد جمع کرنے میں کیا خرچ ہوگا۔ تقریباً ایک لاکھ روپوں کی اسکیم تھی اور یہ اسکیم منظور بھی ہو گئی۔ ذاکر صاحب بہت خوش ہوئے۔ قاضی صاحب کے پاس مواد تو موجود ہی تھا۔ بہت کچھ کام وہ کر چکے تھے۔ کام شروع ہوا، لیکن وقت گزرتا گیا۔ اور ایک جلد بھی شائع نہ ہوئی تو میں نے قاضی صاحب سے پوچھا۔ انھوں نے یہ کہا کہ مقدمہ لکھنا باقی ہے۔ جب زیادہ دیر ہوئی تو میں نے رائے دی کہ وہ متن شائع کر دیں اور سارے مقدمے ایک علیٰحدہ جلد میں شائع کر دئے جائیں گے۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح کے کام میں سہولت ہوگی اور کم سے کم غالب کی ساری تصنیفات ۱۹۶۹ء تک شائع ہو جائیں گی لیکن یہ بھی نہ ہوا۔ پہلی جلد برہان قاطع کا متن شائع ہو لباقی جلدیں شائع نہ ہو سکیں۔ اس پر مجھ کو تاسف بھی ہوا۔ وجہ وہی تکمیل کی جستجو تھی۔ جب تک یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ کوئی غلطی نہیں، کوئی کوتاہی نہیں، کوئی ضروری مسئلہ ایسا نہیں جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو، اس وقت تک قاضی صاحب اپنے کو COMMIT کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ یہ بات بہت اچھی ہے لیکن اس کی وجہ سے ایک بڑا نقصان ہو گیا۔ اگر مکمل ایڈیشن شائع ہو جاتا تو وہ ایک یادگار چیز ہوتی"۔(۱)

قاضی صاحب دوسروں کی رائے کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ نجی زندگی میں بھی اور ادبی معاملات میں بھی اپنی رائے کو وہ آخری اور حتمی سمجھتے تھے اور اس میں معمولی سی ترمیم کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ یہی حال ان کی ادبی تحقیقات کا بھی تھا۔ ان کے نزدیک تحقیق اور تنقید کا وہی ضابطہ معیاری ہے جس کو انھوں نے وضع کیا اور جس پر وہ سختی سے کاربند ہیں۔ اس کسی بھی مرحلے میں معمولی انحراف یا ترمیم کی گنجائش نہیں۔ انھوں نے اردو کا املاء بھی سب سے الگ اختیار کیا تھا۔ اور چاہتے تھے دوسرے حضرات بھی اس کی پابندی سختی سے

(۱) غالب نامہ (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۸۷ء) ص ۳۶-۳۷

Marfat.com

کریں۔ مثلاً ان کا خیال تھا کہ حرف 'ی' کی ایسی آواز جو معروف اور مجہول کے درمیان ہو اسے نیم دائرے کے ساتھ لکھنا چاہئے۔ اسی لئے وہ لفظ 'ہے' کو ہمیشہ 'ہی' لکھتے تھے اور جو شخص اس کی پابندی نہیں کرتا تھا وہ اس کو املا کی غلطی بتا کر اس کی سخت گرفت کرتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ ۱۹۶۹ء میں غالب صدی تقریبات کے سلسلے میں قاضی صاحب کے ایماء پر مالک رام صاحب نے 'دیوان غالب' ترتیب دیا۔ اس کی کتابت ملک کے عدیم المثال کاتب خلیق ٹونکی سے کرائی گئی۔ کتابت شدہ اوراق کی صحت و اصلاح کا کام خود قاضی صاحب نے اپنے ذمہ لیا۔ اور کتابت شدہ اس پورے مسودے کی تصحیح انھوں نے اپنے وضع کردہ املا کے مطابق کی اور اتنی کانٹ چھانٹ کی کہ اصلاح کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی اشاعت کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس طرح ایک اچھا کام منظر عام پر آنے سے رہ گیا اور مالک رام کی محنت اور اخراجات کا زیاں الگ ہوا۔ لیکن قاضی صاحب کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوئی۔ نہ کسی قسم کا ملال ہوا۔

قاضی صاحب قول کے سچے، وعدے کے پکے اور وقت کے پابند تھے۔ انھوں نے اپنی راست گفتاری پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔ انھوں نے کسی مصلحت سے بھی سچائی اور حقیقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اسی طرح حتی المقدور وہ اپنے وعدے کا بھی ہمیشہ پاس کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ وقت کی پابندی کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ لوگوں سے ملاقات کرنے اور دعوتوں نیز تقریبوں میں بھی وقت کا خصوصی خیال رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ پروفیسر مختار الدین احمد نے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"ایک بار ایک صاحب نے اپنے یہاں تقریب میں مدعو کیا اور پانچ بجے شام کا وقت مقرر ہوا۔ قاضی صاحب ٹھیک وقت پر وہاں پہنچے تو مکان، میزبان اور مہمان سے خالی تھا۔ قاضی صاحب انتظار میں بیٹھے رہے۔ فراش چھڑکاؤ کرتے رہے۔ اور شہنائی بجانے والے شہنائی بجاتے رہے۔ چھ بجے جب قاضی صاحب لائبریری جانے کے لئے اٹھے تو صاحب خانہ وارد ہوئے۔ یہ جان کر بہت شرمندہ ہوئے کہ وہ پانچ بجے سے انتظار میں ہیں اور بولے : میری مراد پانچ بجے سے پانچ نہ تھی۔ قاضی صاحب نے کہا : لیکن میری مراد ہمیشہ پانچ سے پانچ ہوتی ہے۔ یہ کہا اور رخصت ہو گئے" (۱)

---

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۷۶ ۱۹ء) ص ۱۳۱

Marfat.com

تصانیف: یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ قاضی صاحب ہمارے عہد کے عظیم ترین محقق اور بے نظیر ناقد ہیں۔ انھوں نے ادب میں بہت سے بتوں کو توڑا ہے نیز اردو تحقیق کو نئی بلندی اور نئی سمت عطا کی ہے۔ ان کا حافظہ غیر معمولی اور مطالعہ انتہائی عمیق اور وسیع تھا۔ اردو اور فارسی کے علاوہ مغربی ادبیات کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انھیں فرانسیسی اور انگریزی ادب سے خصوصی لگاؤ تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں جب آپ انگلستان میں مقیم تھے تو ایام تعطیل میں آپ فرانس چلے جایا کرتے تھے۔ وہاں آپ نے فرانسیسی زبان سیکھی اور اس میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ ترجمہ کی مدد کے بغیر فرانسیسی ادب کا براہِ راست مطالعہ کر سکتے تھے۔ اس دوران انھوں نے فرانسیسی ناول اور ڈراموں کا وسعت سے مطالعہ کیا۔ یہیں سے انھوں نے اپنا طرزِ تحریر بدلا، معیار تحقیق کو نئی سمت دی، تنقید کا سائنٹیفک طرز سیکھا اور اپنے ادبی تصورات کو وسعت دی۔ ان کا کل تصنیفی سرمایہ مضامین، مقدمے، مقالات اور تبصروں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے کوئی مستقل تصنیف بطور یادگار نہیں چھوڑی۔ اپنے مطالعے کی وسعت اور تصنیف و تالیف کے لئے سہولتیں انھیں حاصل تھیں، اس کے تناسب سے ان کی تخلیقات کی تعداد بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ انھوں نے اس کی طرف سے کوئی غفلت برتی، بلکہ اس کا واحد سبب ہے ان کا اعلیٰ معیار اور تکمیل کی تلاش۔ وہ تحقیق و تنقید کے جس بلند معیار پر دوسروں کو دیکھنا چاہتے تھے، وہی معیار وہ اپنے لئے بھی روا رکھتے تھے۔ اس لئے جب تک وہ پوری طرح معیار سے مطمئن نہ ہو جاتے تھے اور جب تک وہ مکمل طور پر اس بات کا اطمینان نہ کر لیتے تھے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ہر طرح کے نقائص سے پاک ہے، اس وقت تک وہ اسے منظر عام پر نہیں لاتے تھے۔ آپ کے بہت سے مضامین آپ کے اسی معیار کا شکار ہو گئے۔ ہمارے دانشور ہمیشہ ان سے اس سلسلے میں شاکی رہے ہیں عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ قاضی صاحب کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک حرف اہل بینش کے لئے سرمۂ بصیرت احتیاط کا حکم رکھتا تھا چنانچہ اس کو شائع کرانے اور منظر عام پر لانے میں قاضی صاحب کی غیر ضروری احتیاط اور پس و پیش کی بناء پر ادبی دنیا کتنے ہی ادب پاروں سے محروم ہو گئی اور نہ معلوم کتنے شاہکار عالم وجود میں آنے سے رہ گئے۔ ایسے بے شمار

Marfat.com

مضامین کی نشاندہی خود قاضی صاحب نے بھی کی ہے اور بعد میں ان کے سوانح نگاروں نے بھی، جو مکمل لکھے جانے کے باوجود اشاعت پذیر نہ ہو سکے صرف اس لئے کہ قاضی صاحب مسلسل ان میں ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ کرتے رہے اور اس کام میں انھیں اتنا زیادہ عرصہ لگ گیا کہ یا تو اس کی معنویت ختم ہو گئی یا پھر تبدیلی اتنی زیادہ ہو گئی کہ مضمون کی اصل ہیئت ہی بدل گئی۔ اس کے نتیجہ میں مضمون شائع ہونے سے پہلے ہی رہ گیا۔ آپ نے ایک زمانے میں مصحفی پر کام کرنا شروع کیا تھا۔ اور ان پر ایک بہت مبسوط مضمون لکھ بھی لیا تھا لیکن وہ شائع نہیں ہو سکا۔ صرف اس لئے کہ جو کچھ لکھا تھا قاضی صاحب اس سے مطمئن نہیں ہوئے، اس میں وقتاً فوقتاً اضافے کرتے رہے۔ لیکن اس کی قسمت میں تکمیل حاصل کرنا نہیں تھا، چنانچہ وہ نہ کبھی مکمل ہوا اور نہ کبھی شائع ہوا۔ اس کی تفصیل خود قاضی صاحب نے ان الفاظ میں بیان کی ہے :

"یورپ سے واپسی کے بعد پٹنہ میں مستشرقین کی کانفرنس ہوئی۔ اس کے لئے میں نے ایک بسیط مقالہ مصحفی پر لکھا تھا۔ اس وقت تک مصحفی کے تذکرے شائع نہیں ہوئے تھے۔ اور اس کے دواوین بھی غیر مطبوعہ تھے۔ میں نے اپنے مقالے میں ان سب سے کام لیا تھا۔ مدیران "اردو" و "معارف" نے اسے اشاعت کے لئے لینا چاہا تھا مگر میں اس میں کچھ اضافہ کرنا چاہتا تھا اور اس کے بغیر اشاعت مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ اضافہ ہوا نہیں اور مقالہ ضائع ہو گیا۔"(۱)

بعض مضامین پر تو انھوں نے نظر ثانی کرنے میں بیس بیس سال لگا دے اور اس کے باوجود بھی کام ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہوا۔ بالآخر اسے انھوں نے سرد خانہ میں ڈال دیا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ مضمون کتابت کے لئے بھیج دینے کے بعد بھی اس میں اضافہ اور ترمیم و تنسیخ کے لئے ہدایات بھی مسلسل بھیجتے رہتے تھے۔ اس سے کاتب بھی پریشان ہوتا اور اگر وہ کسی رسالے میں اشاعت کی خاطر بھیجا گیا تو اس کا مدیر ذہنی الجھن میں مبتلا ہو جاتا تھا، اس سلسلے میں پروفیسر مختار الدین احمد نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے اس سے ان کی افتادِ طبع کا پتہ چلتا ہے لہٰذا اسے نقل کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں :

"انھیں اپنی کتاب یا مضمون کی تصحیح کا بڑا خیال رہتا ہے۔ اس میں وہ جس قدر

---

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۱۸۔۱۹

Marfat.com

اہتمام کرتے ہیں، کھڑاگ کھڑا کرتے ہیں وہ عام تو عام، خاص لوگوں کے بھی بس کا نہیں...... "غالب نمبر" میں میں نے غالب کے ایک فرضی استاد عبدالصمد پر ان کا مضمون شائع کیا۔ مضمون لکھنے کے بعد سے چھپنے تک اس میں وہ تبدیلیاں اور اضافے کرتے رہے اور جب میں نے اسے "احوالِ غالب" میں دوبارہ شائع کرنا چاہا تو انھوں نے اس طرح شائع کرانے سے انکار کر دیا۔ پورا مضمون دوبارہ لکھا۔ یہاں تک کہ انھوں نے عنوان بھی بدل ڈالا"۔(۱)

اسی مضمون میں مختار الدین صاحب نے اپنے مضمون میں ترمیم واضافے کا ایک اور دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ اتنی تحقیق اور ایک مضمون پر مسلسل محنت قاضی صاحب کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نہیں کر سکتا تھا۔ ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں:

"غالب نمبر ہی میں ان کا مضمون "غالب بہ حیثیت محقق" شائع ہوا۔ ان کے افکار نے تو ان کے ذہن میں پتا نہیں کتنی شکلیں بدلی ہوں گی جب مضمون نے یہ قالب اختیار کیا ہو گا۔ مضمون مکمل ہو چکا تو انھوں نے اغلاط کی تصحیح کی۔ جابجا قطع و برید کیے۔ کہیں کہیں مکرر اصلاح کی۔ بعض باتیں بدلیں، بعض نئی لکھیں۔ اب مسودے میں کانٹ چھانٹ کی مزید گنجائش نہ رہی۔ تو انھوں نے سادہ کاغذ کی چپیاں مضمون پر چسپاں کیں۔ کہیں کہیں سطر اور پیراگراف کا پیراگراف انھوں نے نئی چپیوں پر لکھا۔ مضمون جب مجھے ملا اور کتابت کے لئے میں نے کاتب کے حوالے کیا تو ان کا والا نامہ آیا جس میں انھوں نے بعض اور امور کی تصحیح کی تھی۔ مسودہ درست کیا گیا۔ پھر دوسرا خط آیا۔ اس میں یہ خواہش ظاہر کی کہ مسودے میں اس طرح ترمیم کر دی جائے۔ یہ بھی کر دیا گیا۔ ان کی فرمائش تھی کہ کاپی کی تصحیح وہ خود کریں گے۔ علی گڑھ والوں کے لئے یہ بات بالکل نئی تھی لیکن میں نے اپنی ذمہ داری پر یہ وعدہ کر لیا اور انھیں کتابت شدہ اجزا بھیج دیے گئے۔ انھوں نے اغلاط کی تصحیح کی۔ کچھ مزید مکرر اصلاح کی اور اضافے کئے۔ کاپی نویس ان غلطیوں کو کاٹ پیٹ کر درست کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس عرصہ میں ان کے کئی خطوط آئے اور اس طرح مضمون میں کچھ نہ

---

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۱۶۶

Marfat.com

کچھ مزید اضافے اور ترمیمات ہوتی رہیں۔ پروف اتروا کر انھیں بھجوائے گئے اور اس میں بھی مکرر اصلاح ہوئی تصحیح کے اس اہتمام اور دیدہ ریزی کے باوجود جب غالبؔ نمبر شائع ہوا تو تصحیح کی طرف سے مطمئن نظر نہ آئے اور انھوں نے مجھے بتایا کہ مضمون میں بعض فاحش اغلاط رہ گئے ہیں"۔(۱)

انھوں نے اس قسم کی تمام احتیاطوں کے باوجود ان کا کوئی مضمون ایسا نہیں ہوتا جس کے آخر میں غلط نامہ، یا تتمۂ تصحیح واضافہ' درج نہ ہو۔ اس کے باوجود جب یہ مضمون ان کی خدمت میں پہنچتا تو اس میں بھی وہ اپنے قلم سے حواشی ضرور لکھتے یا تصحیح واضافے کرتے۔

اس طرح غالبؔ صدی تقریبات کے سلسلے میں غالبؔ انسائیکلوپیڈیا مرتب کر کے شائع کرنے کا ایک جامع منصوبہ بنایا گیا تھا۔ جس میں غالبؔ کی تحریروں میں جن قابل ذکر تاریخی، ادبی، تہذیبی اور لسانی امور کے حوالے ملتے ہیں، ان پر حواشی لکھ کر انسائیکلوپیڈیا کی شکل میں دی جانی تھی۔ اس کا طریق کار اور اندراجات کا انداز وہی طے پایا تھا جو ایک دائرۃ المعارف کا ہوتا ہے۔ یعنی متعلقہ اندراج کی اجمالی تشریح، اس کے منابع کی تصریح اور اس کے متعلق جو اطلاعات حاصل ہو چکی ہیں ان سب کا جامع تذکرہ اور چونکہ اس نوع کا کام اپنے طور پر قاضی صاحب پہلے سے کر رہے تھے، اس لئے اس مجوزہ دائرۃ المعارف کی تہذیب وترتیب کا کام ان ہی کے سپرد کیا گیا۔

انھوں نے اس کا عنوان 'جہانِ غالبؔ' تجویز کیا تھا اور اس پر بڑی تیزی سے کام شروع بھی کر دیا تھا لیکن حسبِ معمول اس کام میں بھی وہ تحقیق و جستجو کے بحر زخار میں غوطہ زنی کرنے لگے اور ایسی گہرائی تک پہنچ گئے جہاں سے ان کے لئے ابھرنا مشکل ہو گیا۔ انھوں نے ان گہرائیوں سے نکلنے کی بہتیری کوشش کی، لیکن کنارہ ہاتھ نہ لگا اور بالآخر وہ ہمت ہار کر بیٹھ گئے۔ اس طرح ایک انتہائی مفید کام محض قاضی صاحب کی افتاد طبع کے سبب تشنۂ تکمیل رہ گیا۔ ان کے اس تحقیقی مزاج کے بارے میں جناب سید حسن نے صحیح فرمایا ہے:

"قاضی صاحب کے تحقیقی کارناموں کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ان کا کوئی کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔ غالبؔ کی تالیفات کو ایڈٹ کرنے کا معاملہ ہو، یا یادداشتوں کے جمع کرنے وترتیب دینے کا کام ہو، کسی کام کے انجام تک پہنچنے کی

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۱۶۷

Marfat.com

امید نہیں۔ بات یہ ہے کہ ان کا معیار اتنا بلند ہے کہ وہ اپنے کام سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ جو کتابیں انھوں نے مرتب کر کے طبع کرائی ہیں وہ بھی ان کے لئے اطمینان بخش نہیں ہیں۔ تذکرۂ امین اللہ خاں یا عیارستان، دونوں ہی میں اصلاحیں کر دی ہیں۔

اشتر و سوزن میں نہ معلوم کیا نقص رہ گیا کہ چھپنے کے بعد وہ گوشے میں ڈال دی گئی ہے اور اسے باہر کی ہوا بھی نہیں لگنے پائی۔ وہ دوسرے محققوں سے بھی اسی معیار کی توقع رکھتے ہیں جس تک خود ان کے لئے بھی کبھی کبھی پہنچنا دشوار ہوتا ہے۔ میں نے اس معاملہ میں بھی کئی دفعہ گفتگو کی ہے کہ آپ کو جو فراغت حاصل ہے وہ ہم میں سے بہتوں کو نصیب نہیں۔ ہم جن حالات اور مالی مشکلات میں رہ کر کام کرتے ہیں ان کا آپ کو اندازہ نہیں ہو سکتا۔ قاضی صاحب کبھی میرے ہم خیال بھی ہو جاتے ہیں۔ پھر جب معیارِ تحقیق کی بات آجاتی ہے تو میری بات بے اثر ہو جاتی ہے"۔(۱)

یہی سبب ہے کہ قاضی صاحب کے علمی آثار ان کے تجرِ علمی اور وسعت مطالعہ کی نسبت سے بہت کم ہیں۔ اور جب ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ معاش کی طرف سے انھیں کوئی فکر نہیں تھی ، وہ آزادانہ زندگی گزارتے تھے۔ ملازمت کی کھکھیڑ بھی نہیں تھی، فرائض منصبی بھی ادا نہیں کرنے تھے۔ علائق دنیا سے بھی خود کو انھوں نے بڑی حد تک بے تعلق کر لیا تھا۔ سوائے مطالعہ کرنے اور تصنیف و تالیف کے انھیں کوئی کام نہ تھا۔ اتنی سہولتوں اور آسائشوں کے با وجود انھوں نے بہت کم لکھا۔ یا یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انھوں نے لکھا تو بہت، لیکن اس میں سے بہت کم کو قابلِ اشاعت سمجھا۔

قاضی صاحب کے مقالات کی فہرستیں شائع ہو چکی ہیں ان میں سے ایک تو محمد ذکی الحق اور محمد منصور الحق صاحبان نے مرتب کی جو 'معاصر' کے قاضی عبدالودود نمبر میں شائع ہوئی۔ دوسری جمیل احمد خاں صاحب نے ترتیب دی تھی جو 'غالب نامہ' کے قاضی عبدالودود نمبر میں شائع ہوئی۔ پہلی فہرست میں ۲۶۳ مقالات کو شامل کیا گیا ہے جب کہ دوسری فہرست میں ان کی تعداد ۲۹۰ ہے۔ ہمارے خیال میں دونوں نامکمل ہیں اور دونوں کی ترتیب غیر سائنسی

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۲۸۴۔۲۸۵

Marfat.com

طریقے پر کی گئی ہے۔ ذیل میں قاضی صاحب کی کتابوں، ڈراموں، افسانوں، مقالوں اور دیگر تحریروں کا مکمل اور جامع اشاریہ پیش کیا جاتا ہے۔ کتابوں کے ساتھ حسب ضرورت توضیح بھی کردی گئی ہے۔ مقالوں میں وضاحت کی ضرورت کہیں کہیں محسوس ہوئی۔ ویسے ان کی وضاحت عنوان سے بھی ہو جاتی ہے۔

کتب

۱۔ عیارستان۔ پٹنہ، ادارہ تحقیقات اردو ۱۹۵۷ء

اس میں حسب ذیل تین کتابوں پر تفصیلی تبصرے شامل ہیں :

(۱) دیوان فائز : مرتبہ مسعود حسن رضوی ص ۱۔۱۷

(۲) مرقع شعراء : مرتبہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ص ۱۸۔۲۶

(۳) میر تقی میرؔ : حیات اور شاعری مؤلفہ خواجہ احمد فاروقی ص ۲۷۔۱۹۲

انتساب : "یہ کتاب جناب ڈاکٹر محمد زبیر احمد صدیقی کے نام معنون کی جاتی ہے"

۲۔ اشتر و سوزن۔ پٹنہ، ادارۂ تحقیقات اردو ۱۹۶۴ء

اس میں مندرجہ ذیل کتابوں پر مبسوط تبصرے شامل ہیں :

(۱) عمدۂ منتخبہ یعنی تذکرۂ سرور؛ مرتبہ خواجہ احمد فاروقی۔ ص ۱۔۶۰

(۲) شادؔ کی کہانی، شادؔ کی زبانی؛ مرتبہ محمد مسلم عظیم آبادی۔ ص ۶۱۔۱۲۸

انتساب : "بنام نورالدین احمد"

۳۔ دیوان جوشش عظیم آبادی؛ مرتبہ قاضی عبدالودود۔ دہلی، انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۱ء

۴۔ تذکرہ شعراء، مؤلفہ امین اللہ طوفانؔ؛ مرتبہ قاضی عبدالودود

۵۔ قاطع برہان و رسائل متعلقہ مرزا غالبؔ، مرتبہ قاضی عبدالودود

۶۔ قطعات دلدارؔ (بہار کے قدیم شاعر دلدار بیگ دلدارؔ کا کلام) مرتبہ قاضی عبدالودود۔ پٹنہ، ادارہ تحقیقات اردو (ب ت)

۷۔ شہر آشوب قلق

۸۔ فرہنگ آصفیہ پر تبصرہ پٹنہ، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۸۱ء

Marfat.com

دیگر تحریرات کا اشاریہ (ابجدی ترتیب سے)

۱۔ آب حیات اور طبقات الشعراء		معاصر	پٹنہ	ح۴	۱۹۵۳ء
۲۔ آب حیات کے دو مآخذ		"		ح۱	۱۹۵۱ء
۳۔ آزاد بحیثیت محقق	(قسط۱)	نوائے ادب	بمبئی	اپریل	۱۹۵۶ء
۴۔ آزاد بحیثیت محقق	(قسط۲)	"	"	جولائی	۱۹۵۶ء
۵۔ آزاد بحیثیت محقق	(قسط۳)	"	"	اکتوبر	۱۹۵۶ء
۶۔ آصف الدولہ کا جشن ہولی اور افسوس کی مثنوی		معاصر	پٹنہ	حصہ ۱	۱۹۵۱ء
۷۔ آوارہ گرد اشعار	(قسط۱)	"	"	"	۱۹۵۱ء
۸۔ "	(قسط۲)	"	"	حصہ ۲	۱۹۵۲ء
۹۔ آگرہ احوال		آگرہ اخبار			
۱۰۔ اردو انڈین کرانیکل پٹنہ		معاصر	پٹنہ	ح۳	
۱۱۔ اردو بہار ہیر اللہ		"	پٹنہ	ح۵	
۱۲۔ اردو کا پہلا تاریخی ناول		"	"	ح۲ جنوری	۱۹۵۲ء
۱۳۔ اردو کا پہلا واسوخت		"	"	ستمبر	۱۹۴۱ء
۱۴۔ استفسارات		"	"	اگست	۱۹۴۱ء
۱۵۔ اسعد الاخبار آگرہ		"	"	جون	۱۹۴۲ء
۱۶۔ "	(قسط۲)	"	"	جولائی	۱۹۴۴ء
۱۷۔ "	(قسط۳)	"	"	اگست	۱۹۴۴ء
۱۸۔ "	(قسط۴)	"	"	ستمبر	۱۹۴۴ء
۱۹۔ "	(قسط۵)	"	"	اکتوبر	۱۹۴۴ء
۲۰۔ "	(قسط۶)	"	"	نومبر	۱۹۴۴ء
۲۱۔ "	(قسط۷)	"	"	دسمبر	۱۹۴۴ء
۲۲۔ "	(قسط۸)	"	"	جنوری	۱۹۴۵ء

Marfat.com

۲۳۔ اشارات	”	”	فروری	۱۹۴۱ء
۲۴۔ ”	”	”	مارچ	۱۹۴۱ء
۲۵۔ اشارات	معاصر	پٹنہ	فروری	۱۹۴۲ء
۲۶۔ ”	”	”	اگست	۱۹۴۲ء
۲۷۔ ”	”	”	مئی۔جون	۱۹۴۳ء
۲۸۔ اصول تحقیق	آج کل	دہلی	اگست	۱۹۶۷ء
۲۹۔ اقتباس سفینۂ خوشگو	نوائے ادب	بمبئی	جولائی	۱۹۵۷ء
۳۰۔ انتخاب دیوان آنند رام مخلص	”	”	اکتوبر	۱۹۵۰ء
۳۱۔ انشآء کا غیر مطبوعہ کلام	معاصر	پٹنہ	ح۸	
۳۲۔ انشآء کی مثنوی خالص ہندوستانی زبان میں	”	”	ح۱	۱۹۵۱ء
۳۳۔ انشائے مومن	”	”	ح۱۶	۱۹۶۰ء
۳۴۔ ”	”	”	ح۱۷	۱۹۶۰ء
۳۵۔ ایک انگریز مستشرق کا سرقہ	”	”	ح۱	۱۹۵۱ء
۳۶۔ ایک قدیم بیاض کے منتخبات	”	”	ح۱۴	۱۹۵۹ء
۳۷۔ اپنچ ۱۹۰۲ء	”	”	ح۱۷	۱۹۵۲ء
۳۸۔ ایک قدیم ناول : نقش طاؤس	”	”	ح۲	۱۹۵۲ء
۳۹۔ آوارہ گرد اشعار	تحقیق	”	ح۱	۱۹۶۱ء
۴۰۔ ”	نقوش	لاہور	جولائی	۱۹۶۰ء
۴۱۔ برہان قاطع اور ہندوستان	نوائے ادب	بمبئی	اکتوبر	۱۹۶۳ء
۴۲۔ ”	”	”	اپریل	۱۹۶۵ء
۴۳۔ بزم خاص	معاصر	پٹنہ	ح۲	۱۹۵۲ء
۴۴۔ بزم معاصر	”	”	ح۵	۱۹۴۴ء
۴۵۔ ”	معاصر	پٹنہ	ح۷	۱۹۴۴ء

Marfat.com

۴۶۔ بزم معاصر	معاصر	پٹنہ	ح ۹	۱۹۴۵ء
۴۷۔ بشارۃ الامامہ	"	"	اپریل	۱۹۴۲
۴۸۔ بشارۃ الامامہ	معاصر	پٹنہ	مئی	۱۹۴۲ء
۴۹۔ بہار (ماہنامہ)	اشارہ	"	نومبر	۱۹۶۰ء
۵۰۔ بدرالدین راقم	تحریک	دہلی	ستمبر	۱۹۵۷ء
۵۱۔ بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقاء (قسط اول)	نوائے ادب	بمبئی	اکتوبر	۱۹۵۸ء
۵۲۔ " (قسط ۲)	"	"	جنوری	۱۹۵۹ء
۵۳۔ " (قسط ۳)	"	"	اپریل	۱۹۵۹ء
۵۴۔ " (قسط ۴)	"	"	جولائی	۱۹۵۹ء
۵۵۔ " (قسط ۵)	"	"	اکتوبر	۱۹۵۹ء
(ڈاکٹر اختر اورینوی کی کتاب 'بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقاء' پر مبسوط تبصرہ)				
۵۶۔ بیاضِ عنایت حسین خاں مجور	نوائے ادب	بمبئی	جنوری	۱۹۶۰ء
۵۷۔ بیدل اور تذکرہ خوشگو	معارف	اعظم گڈھ	مئی	۱۹۴۲ء
۵۸۔ "	"	"	جولائی	۱۹۴۲ء
۵۹۔ تذکرۂ صادقہ اور لسان الصدق	آج کل	دہلی	جون	۱۹۵۹ء
۶۰۔ تذکرۂ مسرت افزا	معاصر	پٹنہ	ح ۵	۱۹۵۷ء
۶۱۔ "	"	"	ح ۶	۱۹۵۸ء
۶۲۔ "	"	"	ح ۷	۱۹۵۸ء
۶۳۔ "	"	"	ح ۸	۱۹۵۹ء
۶۴ "	"	"	ح ۱۴	۱۹۵۹ء
۶۵۔ تذکرۂ یوسف علی خاں	نوائے ادب	بمبئی	اپریل	۱۹۵۱ء
۶۶۔ تعارف	معیار	پٹنہ	مارچ	۱۹۳۶ء
۶۷۔ "	"	"	مئی	۱۹۳۶ء

Marfat.com

۶۸۔ تعین زمانہ	معاصر	"	ح ۱۷	۱۹۵۱ء
۶۹۔ "	"	"	ح ۲	۱۹۵۲ء
۷۰۔ تعین زمانہ	معاصر	پٹنہ	ح ۳	۱۹۵۲ء
۷۱۔ "	"	"	ح ۸	"
۷۲۔ "	"	"	ح ۱۰	۱۹۵۷ء
۷۳۔ "	"	"	ح ۱۸	۱۹۶۲ء
۷۴۔ "	"	"	ح ۲۳	"
۷۵۔ توضیحات	نیادور	لکھنؤ	نومبر	۱۹۵۹ء
۷۶۔ تیغ تیز	فکر و نظر	علی گڑھ	جولائی	۱۹۶۱ء
۷۷۔ تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی	صحیفہ	لاہو	دسمبر	۱۹۵۷ء
۷۸۔ تاریخ ادبیات اردو مصنفہ محمد صادق	نوائے ادب	بمبئی	اکتوبر	۱۹۶۷ء
۷۹۔ تاریخ ادبیات ہندوی از دتاسی	معاصر	پٹنہ	حصہ ۱۱	"
۸۰۔ تبصرہ خطوط غالب	"	"	اکتوبر	۱۹۴۳ء
۸۱۔ "	"	"	جولائی	۱۹۴۴ء
۸۲۔ تبصرۂ کتب	"	"	حصہ ۷	۱۹۵۴ء

تاریخ صحافت اردو از امداد صابری، مصحفی اور ان کا کلام از ابواللیث صدیقی افسر امروہوی پر تفصیلی تبصرے

۸۳۔ تبصرۂ کتب	معاصر	پٹنہ	ح ۷	۱۹۵۴ء

مطالعہ غالب از مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی اور ولی گجراتی از ظہیر الدین مدنی پر تبصرے

۸۴۔ تذکرۃ الابرار (خلاصہ)	معاصر	پٹنہ	حصہ ۱۸	"
۸۵۔ تذکرۃ الاسلاف	نوائے ادب	بمبئی	جنوری	۱۹۶۳ء
۸۶۔ تذکرۂ شورش	"	"	"	"
۸۷۔ تبصرہ فرہنگ آصفیہ	خدابخش لائبریری جرنل	پٹنہ	ن ۲	۱۹۷۸ء

Marfat.com

۸۸ تبصرہ فرہنگ آصفیہ خدابخش لائبریری جرنل		پٹنہ	ن ۳	۱۹۷۸ء
۸۹۔ تبصرہ فرہنگ آصفیہ خدابخش لائبریری جرنل		پٹنہ	ن ۴	۱۹۷۸ء
۹۰ "	"	"	ن ۵	
۹۱ "	"	"	۱۹	
۹۲۔ پٹنہ ہرکارہ ۱۸۵۵۔۱۹۵۶ء	معاصر	پٹنہ	ح ۱۵	
۹۳۔ جہان غالب	"	"	ح ۱	۱۹۵۱ء
۹۴۔ "	"	"	ح ۲	۱۹۵۲ء
۹۵۔ "	"	"	ح ۴	۱۹۵۳ء
۹۶۔ "	"	"	ح ۷	۱۹۵۴ء
۹۷۔ "	"	"	ح ۹	۱۹۵۶ء
۹۸۔ "	"	"	ح ۲۳	۱۹۵۶ء
۹۹۔ "	مطالعہ	"	فروری	۱۹۶۹ء
۱۰۰۔ "	"	"	مارچ	۱۹۷۱ء
۱۰۱۔	شاعر	بمبئی	"	۱۹۶۹ء
۱۰۲۔ چند الفاظ	معاصر	پٹنہ	ح ۷	۱۹۵۴ء
۱۰۳۔ چند الفاظ اور طریق استعمال	صبح نو	"	مارچ	۱۹۶۳ء
۱۰۴۔ حافظ اور ذال فارسی	نقوش	لاہور		۱۹۶۶ء
۱۰۵۔ حواشی	معاصر	پٹنہ	ح ۱۸	۱۹۶۲ء
۱۰۶۔ خاتمۂ خلاصۃ الافکار	نوائے ادب	بمبئی	جولائی	۱۹۵۱ء
۱۰۷۔ خاش اور خماش اور غالب	معاصر	پٹنہ	ح ۶	۱۹۶۰ء
۱۰۸۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت	اشارہ	"	اگست	۱۹۶۲ء
۱۰۹۔ داستان عشاق	"	"	"	"
۱۱۰۔ درد اور شاد	تحریک	دہلی	اگست	۱۹۷۳ء

Marfat.com

۱۱۱۔ دردِ دل مصنفہ خواجہ میر درد	آج کل	نئی دہلی	اکتوبر	۱۹۶۰ء
۱۱۲۔ دریائے لطافت	معیار	پٹنہ	مارچ	۱۹۳۶ء
۱۱۳۔ "	"	"	مئی	"
۱۱۴۔ "	"	"	جولائی	"
۱۱۵۔ دساتیر	نقوش	لاہور	سالنامہ	۱۹۶۶ء
۱۱۶۔ دہ مجلس فضلی	معاصر	پٹنہ	ح ۴	۱۹۵۳ء
۱۱۷۔ دیوان آغا علی خاں مہر لکھنوی	نیا دور	لکھنؤ (اسپیشل نمبر) ۱۹۶۱ء		
۱۱۸۔ دیوان افسر	نگار	رامپور	مارچ	۱۹۶۳ء
۱۱۹۔ دیوان اوج	معاصر	پٹنہ	ح ۱۳	۱۹۵۸ء
۱۲۰۔ "	"	"	ح ۱۴	۱۹۵۹ء
۱۲۱۔ دیوان ترابی	"	"	"	"
۱۲۲۔ دیوانِ جوشش	معیار	"	مارچ	۱۹۳۶ء
۱۲۳۔ دیوانِ دوم معروف	"	"	مئی	۱۹۳۶ء
۱۲۴۔ دیوانِ رضا عظیم آبادی	معاصر	"	مئی	۱۹۴۶ء
۱۲۵۔ دیوانِ راغب	معیار	"	جولائی	۱۹۳۶ء
۱۲۶۔ دیوان غالب کے دو نسخے	معاصر	"	ح ۱۲	۱۹۵۷ء
۱۲۷۔ "	"	"	ح ۱۳	۱۹۵۸ء
۱۲۸۔ دیوانِ نجیب الدین جرباد قانی	"	"	"	"
۱۲۹۔ دیوان نوا	نقوش	لاہور	جنوری	۱۹۶۲ء
۱۳۰۔ دیوانِ نوازش	آج کل	نئی دہلی	جولائی	۱۹۶۲ء
۱۳۱۔ دیوان نوعی	فکر و نظر	علی گڑھ	اکتوبر	۱۹۶۰ء
۱۳۲۔ دیوان یقین مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ	اشارہ	پٹنہ	جنوری	۱۹۶۰ء
۱۳۳۔ دلی کا دبستان شاعری از نور الحسن ہاشمی	ہماری زبان	علی گڑھ	۸ فروری	۱۹۵۹ء

Marfat.com

۱۳۴ دلی کا دبستان شاعری از نورالحسن ہاشمی	ہماری زبان	علی گڑھ	۸/ فروری	۱۹۵۹ء
۱۳۵۔ "	"	"	۸/ مارچ	۱۹۵۹
۱۳۶۔ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی	اورنگ	پٹنہ	۱۵/ اپریل	۱۹۷۶ء
۱۳۷۔ ذکر خواجہ امین الدین امین	الصباح	"	اپریل	۱۹۲۳ء
۱۳۸۔ رامائن بیدل معروف بہ نرگستان	معاصر	"	ح۲	۱۹۵۲
۱۳۹۔ روزروشن	بہار کی خبریں	"	(آزادی نمبر)	۱۹۶۱ء
۱۴۰۔ زبان شناسی	معاصر	پٹنہ	ح۲۵	"
۱۴۱۔ "	"	"	ح۲۶	"
۱۴۲۔ سال وفات آبرو	معیار	"	مارچ	۱۹۳۶ء
۱۴۳۔ سراج المعرفت	فکر و نظر	علی گڑھ	اپریل	۱۹۶۲ء
۱۴۴۔ سراج نظم مصنفہ ناسخ	معاصر	پٹنہ	ح۲	۱۹۵۲ء
۱۴۵۔ سفر آشوب	"	"	ح۱۷	۱۹۶۲ء
۱۴۶۔ سفینہ ہندی	نوائے ادب	بمبئی	اکتوبر	۱۹۵۷ء
۱۴۷۔ سنتوکھ رائے بیتاب	معاصر	پٹنہ	ح۲	۱۹۵۲ء
۱۴۸۔ سودا اور مکین	"	"	ح۱	۱۹۵۱ء
۱۴۹۔ سودا کے کبت	"	"	ح۱	"
۱۵۰۔ شاد عظیم آبادی اور حیدر آباد	تحریک	دہلی	مارچ	۱۹۶۱ء
۱۹۵۱۔ شاہ کمال علی کمال	معاصر	پٹنہ	مئی	۱۹۴۱ء
۱۵۲۔ "	"	"	جون	۱۹۴۱ء
۱۵۳۔ "	"	"	جولائی	۱۹۴۱ء
۱۵۴۔ "	"	"	اگست	۱۹۴۱ء
۱۵۵۔ "	"	"	ستمبر	۱۹۴۱ء
۱۵۶۔ "	"	"	اکتوبر	۱۹۴۱ء

Marfat.com

۱۵۷۔ "	"	"	نومبر	۱۹۴۱ء	
۱۵۸۔ "	"	"	دسمبر	۱۹۴۱ء	
۱۵۹۔ "	"	"	مارچ	۱۹۴۲ء	
۱۶۰۔ "	"	"	فروری	۱۹۴۳ء	
۱۶۱۔ شمشیر تیز تر	نقوش	لاہور	اگست	۱۹۶۱ء	
۱۶۲۔ شمع محفل	معاصر	پٹنہ	ح ۱۸	۱۹۶۲ء	

۱۶۳۔ شاد کی کہانی، شاد کی زبانی (مشمولہ: اشتر و سوزن۔ مطبوعہ ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ ۱۹۶۴ء
(جناب محمد مسلم عظیم آبادی کی کتاب شاد کی کہانی، شاد کی زبانی پر تفصیلی تبصرہ)

۱۶۴۔ صحت متن	تحریک	دہلی		
۱۶۵۔ صوبہ بہار میں گیارہویں صدی کی اردو کا نمونہ	معیار	پٹنہ	مارچ	۱۹۳۶ء
۱۶۶۔ طبقات الشعراء ہند	معاصر	"	ح ۱	۱۹۵۶ء
۱۶۷۔ عبدالحق بحیثیت محقق	"	"	ح ۱۳	۱۹۵۸ء
۱۶۸۔ "	"	"	ح ۱۴	۱۹۵۹ء
۱۶۹۔ "	"	"	ح ۱۵	۱۹۵۹ء

۱۷۰۔ عمدۂ منتخبہ یعنی تذکرۂ سرور (مشمولہ: اشتر و سوزن۔ پٹنہ، ادارۂ تحقیقات اردو، ۱۹۶۴ء
(تذکرۂ سرور؛ مرتبہ خواجہ احمد فاروقی پر مبسوط تبصرہ)

۱۷۱۔ عہد شاہجہاں کا ایک ادبی مناقشہ اور غالب	معاصر	پٹنہ	ح ۵	۱۹۵۴ء
۱۷۲۔ غالب اور بہار	مطالعہ	"	جنوری	۱۹۶۹ء
۱۷۳۔ غالب اور پنج آہنگ	معیار	"	جون	۱۹۳۶ء
۱۷۴۔ غالب کے دو لطیفے	"	"	"	۱۹۳۶ء
۱۷۵۔ غالب: سراپا سخن اور غالب	"	"	"	"
تذکرۂ سرور اور غالب	"	"	"	"
۱۷۶۔ غالب اور تیئں	"	"	"	"

Marfat.com

۱۷۷۔ غالبؔ بحیثیت محقق (مشمولہ : نقد غالب۔ مرتبہ مختار الدین احمد
(مرزا غالبؔ کی لغت دانی اور برہانِ قاطع کے مصنف پر اعتراضات کا بھرپور جائزہ)
۱۷۸۔ غالبؔ کے اشعارِ فارسی کا ایک مجموعہ فکر و نظر علی گڑھ اپریل ۱۹۶۰ء
۱۷۹۔ غالبؔ کے بارے میں بعض وضاحتی امور نقوش لاہور فروری ۱۹۶۹ء
۱۸۰۔ غالبؔ کے فارسی خطوط : ایک نیا مجموعہ ماہ نو کراچی فروری ۱۹۶۲ء
۱۸۱۔ غالبؔ کے کلیات نظم فارسی کا قدیم ترین موجود نسخہ مجلہ علوم الاسلامیہ علی گڑھ دسمبر ۱۹۶۰ء
۱۸۲۔ غالبؔ کی غزل گوئی کے پانچ دور مطالعہ پٹنہ جنوری ۱۹۶۹ء
۱۸۳۔ غالبؔ نے اردو میں خط و کتابت کب سے شروع کی
۱۸۴۔ غالبؔ کے خطوط صفیرؔ بلگرامی کے نام آج کل نئی دہلی اگست ۱۹۵۲ء
۱۸۵۔ غیر مطبوعہ کلام میرؔ : قصیدہ در شکایت نفاق یاران زماں۔ دلی کالج میگزین ۱۹۶۲ء
۱۸۶۔ فارسی تذکرے اور ریختہ گو شعرا نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۷ء
۱۸۷۔ فہرست کتب خانہ گارساں دتاسی " " جنوری ۱۹۵۸ء
۱۸۸۔ قصائد مصحفیؔ معاصر پٹنہ جولائی ۱۹۴۳ء
۱۸۹۔ قصیدہ مصحفیؔ " " نومبر ۱۹۴۲ء
۱۹۰۔ قطعاتِ جوششؔ " " فروری ۱۹۴۱ء
۱۹۱۔ قاضی عبدالودود (خود نوشت حالات) نقوش لاہور (آپ بیتی نمبر ج۲) ۱۹۶۴ء
۱۹۲۔ کچھ انشاء کے بارے میں نوائے ادب بمبئی جنوری ۱۹۵۱ء
۱۹۳۔ " " " اکتوبر ۱۹۵۳ء
۱۹۴۔ کچھ سوداؔ کے بارے میں معاصر پٹنہ ح۴ ۱۹۵۲ء
۱۹۵۔ کچھ میر حسنؔ کے بارے میں بہار کی خبریں " جنوری ۱۹۶۱ء
۱۹۶۔ کریم الدین اور گارساں دتاسی دلی کالج میگزین دہلی (کالج نمبر) ۱۹۵۳ء
۱۹۷۔ کلام ثابتؔ معاصر پٹنہ جولائی ۱۹۴۲ء
۱۹۸۔ کلام دلؔ " " اپریل ۱۹۴۱ء

Marfat.com

۱۹۹۔ کلام دلدار	"	"	دسمبر	۱۹۴۳ء
۲۰۰۔ کلام راسخ	"	"	ستمبر	۱۹۴۲ء
۲۰۱۔ "	"	"	اکتوبر	۱۹۴۲ء
۲۰۲ کلام رضا	"	"	اکتوبر	۱۹۴۱ء
۲۰۳۔ کلام رضا ثابت عظیم آبادی	"	"	اگست	۱۹۴۲ء
۲۰۴۔ کلام غلام علی حیدری	"	"	جون	۱۹۴۲ء
۲۰۵۔ کلام فدوی	"	"	جولائی	۱۹۴۱ء
۲۰۶۔ کلام میر ضیاء	"	"	مارچ	۱۹۴۲ء
۲۰۷۔ کلام نالاں	"	"	اگست	۱۹۴۱ء
۲۰۸۔ کلیات سودا کا خطی نسخہ	نوائے ادب	بمبئی	جولائی	۱۹۶۱ء
۲۰۹۔ کلیم الدین احمد	نقوش	لاہور	جنوری	۱۹۵۵ء
۲۱۰۔ کلیات میر کی اولین اشاعت	دلی کالج میگزین		میر نمبر	۱۹۶۲ء
۲۱۱۔ گلدستۂ بہار	بہار کی خبریں		آزادی نمبر	
۲۱۲۔ گلدستۂ شعراء پٹنہ	معاصر	پٹنہ	ح ۱۴	۱۹۵۹ء
۲۱۳۔ گلستان سخن	دلی کالج میگزین		کالج نمبر	۱۹۵۳ء
۲۱۴۔ گلشن بیخار	نوائے ادب	بمبئی		
۲۱۵۔ گلشن سخن	معاصر	پٹنہ	ح ۲۷	
۲۱۶۔ گارساں دتاسی کا مرتبہ دیوان ولی	خدابخش لائبریری جرنل۔ شمارہ ۱۲			
۲۱۷۔ لسانیات	معاصر	پٹنہ	ح ۱	۱۹۵۱ء
۲۱۸۔ لطائف سعادت مصنفہ انشا	"	"	ح ۴	۱۹۵۳ء
۲۱۹۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری	ساغر	"	جولائی	۱۹۴۴ء
۲۲۰۔ لسان الصدق	شاعر	بمبئی (سالنامہ)		۱۹۶۰ء
۲۲۱۔ ماہنامہ ادیب، پٹنہ	اشارہ	پٹنہ	فروری	۱۹۵۹ء

Marfat.com

۲۲۲۔ متفرقات	آج کل	نئی دہلی	اگست	۱۹۵۷ء
۲۲۳۔ مثنوی اکبر علی خاں اکبر	معاصر	پٹنہ	ح ۱۰	۱۹۵۷ء
۲۲۴۔ مثنویات راسخ (مثنویات راسخ مرتبہ ممتاز احمد پر طویل تبصرہ)	ہماری زبان	علی گڑھ	نومبر	۱۹۵۸ء
۲۲۵۔ مثنویات رکن الدین عشق دہلوی				
۲۲۶۔ مجموعۂ اشعار حسین علی خاں شاداں				
۲۲۷۔ محرق قاطع برہان	نوائے ادب	بمبئی	اپریل	۱۹۶۲ء
۲۲۸۔ محکمہ	معیار	پٹنہ	مارچ	۱۹۳۶ء
۲۲۹۔ "	"	"	اپریل	۱۹۳۶ء
۲۳۰۔ محکمہ: دیوان معروف، دیوان جوشش، خطبات دتاسی	معیار	پٹنہ	مئی	۱۹۳۶ء
۲۳۱۔ محکمہ: سال وفات نجف خاں و سال آغاز تذکرہ مصحفی، تصحیح دیوان معروف	معیار	پٹنہ	جون	۱۹۳۶ء
۲۳۲۔ محکمہ: دریائے لطافت، ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد، شرف جہاں کا ایک شعر	معیار	پٹنہ	جولائی	۱۹۳۶ء
۲۳۳۔ مرثیہ ظہور علی خلیق	معاصر	پٹنہ	ح ۴	۱۹۵۳ء
۲۳۴۔ مرزا قتیل	"	"	"	"
۲۳۵۔ مرزا محمد علی فدوی از سید محمد حسنین (تبصرہ)	صنم	"	بہار نمبر	۱۹۵۹ء
۲۳۶۔ مرگ انیس	معاصر	"	ح ۱	۱۹۵۱ء
۲۳۷۔ مرگ دبیر	"	"	"	"
۲۳۸۔ مصحفی اور انشاء	اردو ادب	علی گڑھ	جنوری	"
۲۳۹۔ مصحفی اور جرات	معاصر	پٹنہ	ح ۲	۱۹۵۲ء
۲۴۰۔ مصحفی اور سودا	اردو ادب	علی گڑھ	اکتوبر	۱۹۵۰ء
۲۴۱۔ مصحفی کا سال وفات	معارف	اعظم گڑھ	اکتوبر	۱۹۳۷ء

Marfat.com

۲۴۲۔ مصحفی کا غیر مطبوعہ کلام	معاصر	پٹنہ	فروری	۱۹۴۳ء
۲۴۳۔ مصحفی کے قصیدے	معاصر	پٹنہ	مئی	۱۹۴۳ء
۲۴۴۔ مطالعات	„	„	ح ۱۸	۱۹۶۲ء
۲۴۵۔ مطبوعاتِ جدیدہ	معیار	„	مارچ	۱۹۳۶ء

(دیوان معروف، دریائے لطافت اور نکات الشعراء پر تبصرے)

۲۴۶۔ مطبوعات جدیدہ (خطبات دتاسی)	معیار	پٹنہ	مارچ	۱۹۳۶ء
۲۴۷۔ „ (دیوان تاباںؔ)	„	„	جولائی	۱۹۳۶ء
۲۴۸۔ „	معاصر	„	ستمبر	۱۹۴۱ء
۲۴۹۔ „	„	„	اکتوبر	۱۹۴۱ء
۲۵۰۔ „	„	„	نومبر	۱۹۴۱ء
۲۵۱۔ „	„	„	مارچ	۱۹۴۲ء
۲۵۲۔ „	„	„	مئی	„
۲۵۳۔ „	„	„	جون	„
۲۵۴۔ „	„	„	اگست	„
۲۵۵۔ معروضات	معیار	„	مارچ	۱۹۳۶ء
۲۵۶۔ „	„	„	مئی	„
۲۵۷۔ „	„	„	جون	„
۲۵۸۔ „	„	„	جولائی	۱۹۳۶ء

۲۵۹۔ مقالہ افتتاحیہ (مشمولہ: بین الاقوامی غالب سمینار؛ مرتبہ یوسف حسین خاں ۱۹۶۹)
(بین الاقوامی غالب سیمینار منعقدہ ۱۷ر فروری ۱۹۶۹ء میں دیا گیا کلیدی خطبہ؛)

۲۶۰۔ مقدمہ	معاصر	پٹنہ	ح ۱۷	۱۹۶۱ء
۲۶۱۔ مقدمہ دیوان رضا	„	„	جنوری	۱۹۴۳ء
۲۶۲۔ „	„	„	فروری	۱۹۴۳ء

Marfat.com

۲۶۳۔ مکاتیب غالب　　"　　"　　مارچ　　۱۹۴۳ء

۲۶۴۔ "　　معاصر　　پٹنہ　　اپریل　　۱۹۴۳ء

۲۶۵۔ "　　"　　"　　مئی　　"

۲۶۶۔ مکتوبات غالب　　معاصر　　"　　اپریل　　۱۹۴۲ء

۲۶۷۔ مولانا ابوالکلام کی قدیم تحریریں　　نقوش　　لاہور　　اگست　　۱۹۶۰ء

۲۶۸۔ میر تقی میر　　معیار　　پٹنہ　　مئی　　۱۹۳۶ء

۲۶۹۔ میر ضاحک دہلوی　　علی گڑھ میگزین (طنز و ظرافت نمبر)　　۱۹۵۳ء

۲۷۰۔ میر ماشاء اللہ خان مصدر　　معاصر　　پٹنہ　　ح۲　　۱۹۵۲ء

۲۷۱۔ نادر خطوط غالب　　"　　"　　جنوری　　۱۹۴۳ء

۲۷۲۔ نعیم دہلوی　　دلی کالج میگزین　　دلی نمبر　　۱۹۵۹ء

۲۷۳۔ نوبہار یعنی قصۂ گل و صنوبر،

از بینی نراین جہاں　　نیا دور　　لکھنؤ　　جولائی　　۱۹۵۹ء

۲۷۴۔ نئی مطبوعات　　معاصر　　پٹنہ　　ح۲　　۱۹۵۲ء

مندرجہ ذیل مطبوعات پر تبصرے:

۱۔ وقائع عالم شاہی ۲۔ ذکر غالب از مالک رام ۳۔ نور المعرفت، از ولی ۴۔ خطوط اکبر

۵۔ اصطلاحات اقبال ۶۔ تاریخ ہندی قرون وسطیٰ جلد ۲، از ناظر۔

۷۔ پرچھائیں اور اس کا دوسرا رخ از حکیم الدین

۲۷۵۔ نئی مطبوعات　　معاصر　　پٹنہ　　ح۱　　۱۹۵۱ء

مندرجہ ذیل کتابوں پر تبصرے:

۱۔ نادرات غالب از امتیاز علی خاں عرشی

۲۔ چھان بین، از جعفر علی خاں اثر لکھنوی

۳۔ دیوان فائز مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب

۲۷۶۔ نئی مطبوعات　　معاصر　　پٹنہ　　ح۹　　۱۹۵۶ء

Marfat.com

مندرجہ ذیل کتابوں پر تبصرے:

۱۔ میر تقی میر حیات اور شاعری

۲۔ کلام انشاء ؛ مرتبہ محمد عسکری

۳۔ احوالِ غالب ؛ مرتبہ مختار الدین احمد

۲۷۷۔ نئی مطبوعات	معاصر	پٹنہ	ح ۱۰	۱۹۵۷ء

۱۔ میر تقی میر : حیات اور شاعری از خواجہ احمد فاروقی (قسط ۲)

۲۔ وجیہ الدین وجدی از محمد عمر پر تبصرے

۲۷۸۔ یادداشت	معاصر	پٹنہ	ح ۷ اجولائی	۱۹۶۰ء
"	"	"	ح ۱۸ جولائی	۱۹۶۲ء
"	"	"	ح ۱۹ جولائی	۱۹۶۲ء
"	اشارہ	"	اگست	۱۹۶۱ء
۲۷۹۔ مخمس سال وفات آبرو	معیار	"	مارچ	۱۹۳۶ء
۲۸۰۔ ہماری زبان	"	"	جون	۱۹۳۶ء
۲۸۱۔ واجد علی شاہ کا سفر کلکتہ	"	"	"	"

Marfat.com

حصہ دوم

فکر و فن

اشارہ تصانیف و مقالات قاضی عبدالودود

Marfat.com

Marfat.com

اردو میں تحقیق کی روایت

اردو میں تحقیق کی روایت بہت زیادہ قدیم ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کی خشت اول گزشتہ صدی کے نصف اول میں سرسیّد کے دستِ مبارک سے رکھی گئی تو بے جا نہ ہوگا۔ آثار الصنادید' اس سلسلے کی اولین اور عظیم الشان کوشش ہے۔ سرسیّد نے اس کے ذریعے اردو میں باقاعدہ، منضبط اور سائنٹفک طرز کی تحقیق کی بنیاد ڈالی۔ جس نے بعد کے محققین ادب کے لئے رہبری وراہنمائی کا کام انجام دیا۔ سرسیّد کا یہ کارنامہ کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں۔ انھوں نے تحقیق اور ترتیب متن کی بنیاد اس وقت ڈالی جب اردو میں اس کا کوئی تصور بھی نہیں تھا۔ اس زمانے تک اردو یا فارسی ادبیات میں باقاعدہ اور منظم تحقیق نیز متنی تنقید کی کوئی مثال نہیں ملتی تھی۔ ہمارے ادیب اور دانشور اس وقت تک اس تصور سے ہی ناآشنا تھے۔ اس زمانے میں تخلیق پر زیادہ زور دیا جاتا تھا، تحقیق و تنقید پر نہیں۔ البتہ عربی و فارسی کی جو کتابیں مختلف درسیات میں شامل نصاب تھیں، طالب علموں کی سہولت کی خاطر ان کی شرح ضرور لکھ دی جاتی تھی۔ لیکن یہاں بھی الفاظ کے معانی و مفاہیم بیان کرنے پر اکتفا کر لیا جاتا تھا، ان پر تنقیدی یا تحقیقی نظر نہیں ڈالی جاتی تھی۔

آثار الصنادید میں دہلی کی عمارتوں کا بیان ہے، ان کی تاریخ، عمارت کی خصوصیات، فنی نزاکتیں، کتبات کی نقل، نقشے وغیرہ سبھی کچھ ہے۔ اس کے علاوہ دہلی کی حویلیوں، مسجدوں، مندروں، بازاروں، کنوؤں، باولیوں کی تفصیلات بھی ہیں۔ ان تمام تفاصیل کو جمع کرنے اور پھر ایک سلسلہ سے ان کی تدوین کرنے میں سرسیّد نے جس محنت اور جاں فشانی سے کام لیا ہے، اس کی تفصیل مولانا حالؔی نے 'حیاتِ جاوید' میں شرح و بسط سے بیان کر دی ہے۔ اس سے ان کے تحقیقی ذہن اور متجسس طبیعت کا پتہ چلتا ہے کتاب کے آخر میں ایک باب میں اردو زبان کا ذکر ہے۔ یہ باب اردو کی لسانی تاریخ کے لحاظ سے بہت اہم اور قابلِ استفادہ ہے۔ آخری باب میں دہلی کی قابلِ ذکر شخصیات کے احوال بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اشخاص شامل ہیں۔ ان میں علماء بھی ہیں، مشائخ بھی، شعراء بھی ہیں اور نثر نگار بھی، خوش نویس بھی ہیں اور موسیقار بھی۔ ان سب کے حالات سرسیّد نے بڑے دلچسپ انداز میں تحریر کیے ہیں۔

آثار الصنادید بنیادی طور پر ایک تاریخی کتاب ہے۔ اس کا بڑا حصہ فن تعمیر سے تعلق رکھتا

Marfat.com

ہے۔ اس سے ہندوستان میں عموماً اور دہلی میں خصوصاً فنِ تعمیر کے ارتقاء پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے ذریعے اردو میں مثبت تحقیق کے لئے راہیں ہموار ہوئیں۔

تحقیق و ترتیب متن کے سلسلے میں سر سیّد کا دوسرا اہم کام "آئین اکبری" کی ترتیب و اشاعت ہے۔ اس میں سر سید نے اصل متن کی صحت کا خصوصی اہتمام کیا۔ یہ ابوالفضل علامی کی تصنیف ہے جس میں عہد اکبری کی سیاسی، ثقافتی اور ادبی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ یہ اس عہد کی تاریخ کے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ سر سیّد نے اسے متنی تنقید کے سائنٹیفک اصول پر مرتب کیا۔ اس کی تفصیل مولانا حالی کے الفاظ میں:

"آئینِ اکبری کے نسخے کاتبوں کے سہو و خطا سے اکثر مسخ ہو گئے تھے، اس لئے اس کا صحیح کرنا سخت دشوار تھا۔ سر سیّد نے اول جہاں تک مل سکے اس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے۔ اس میں ایک آدھ نسخہ صحیح بھی مل گیا اور اس طرح غلط اور صحیح نسخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے ایک نسخہ سب سے زیادہ صحیح تیار ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے فارسی، عربی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے اکثر غریب الفاظ کی شرح کی۔ جو اصطلاحیں اکبر کے زمانے میں ہر ایک آئین کے متعلق مستعمل تھیں یا خود ابوالفضل نے اختراع کی تھیں، ان کی جابجا تشریح کی۔ اس زمانے کے اوزان اور نقود کی اس زمانے کے اوزان و نقود سے مطابقت کی۔ جن جدولوں میں مصنف نے کچھ خانے خالی چھوڑے دیے تھے اور تمام نسخوں میں وہ خانے خالی پائے گئے، ان کو اور کتابوں سے تحقیق کر کے معمور کیا۔ کہیں کہیں جدولوں میں جو خود مصنف نے غلطی کی تھی، اس کو بھی بہت تحقیق کر کے درست کیا۔ بعد جدولوں میں ہندسوں کی جگہ حروف لکھے ہوئے تھے، ان کی قیمت ہندسوں میں بھی ظاہر کر دی۔ بعض جدولیں جو تمام نسخوں میں مختلف پائی گئیں، وہ آئین کے انگریزی ترجمے کے مطابق، جس میں ہر جدول نہایت صحت کے ساتھ لکھی گئی تھی، کتاب میں داخل کیں۔ اکثر جدولوں میں ایک خانہ اپنی طرف سے آخر میں اس لئے اضافہ کیا کہ اس سے پہلے خانے کا مفہوم ہر شخص

Marfat.com

باسانی سمجھ جائے"(۱)

آئین اکبری کی ترتیب میں سر سیّد نے شعوری یا غیر شعوری طور پر مغرب کے اصول کی پیروی کی ہے۔

ادبی تحقیق اور ترتیبِ متن کے سلسلے میں سر سید کا دوسرا عظیم کارنامہ برنی کی تاریخ 'فیروز شاہی' کی ترتیب و تدوین ہے۔ ضیاء الدین برنی کی یہ تالیف سلطان غیاث الدین بلبن سے سلطان فیروز شاہ تک آٹھ سلاطین دہلی کی تاریخ ہے اور اس عہد کی تاریخ کے لئے جیاد کا کام دیتی ہے۔ آج بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔ یوں تو یہ متعدد بار شائع ہو چکی تھی، لیکن 'آئین اکبری' کی طرح اس کا بھی کوئی مستند اور اغلاط سے پاک ایڈیشن دستیاب نہیں تھا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (Royal Asiatic Society of Bengal, Calcutta) کے ایماء پر سر سیّد نے اسے دستیاب نسخوں کی مدد سے از سر نو مرتب کیا اور مستند نیز اغلاط سے پاک ایڈیشن تیار کیا۔ اسی کے ساتھ اس پر ایک مبسوط دیباچہ بھی تحریر کیا اور ضیاء الدین برنی کے حالات جمع کئے، نیز شاہان ہند پر تاریخ فیروز شاہی کے علاوہ جتنی کتابیں اس وقت دستیاب تھیں، ان کے بارے میں بھی معلومات فراہم کیں۔ کسی سبب سے یہ دیباچہ کتاب کے ساتھ شائع نہ ہو سکا۔ بعد میں سر سید نے اسے 'اخبار سائنٹیفک سوسائٹی (۲۴/ اگست ۱۸۶۶ء) میں شائع کیا۔ سر سید کی ترتیب دی ہوئی تاریخ فیروز شاہی کو ۱۸۶۲ء میں اپنے روایتی انداز سے انتہائی شاندار طریقے پر شائع کیا۔ سر سید کی محنت اور جانفشانی سے اصل کتاب کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ ہوا۔

اس کے دو سال بعد سر سید نے توزک جہانگیری کو ایڈیٹ کیا۔ یہ مغل شہنشاہ نور الدین جہانگیر (۱۶۰۵۔۱۶۲۶ء) کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ اس کی ادبی اور تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ سر سید نے اس کی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے تحقیق کے جدید اصول اور متنی تنقید کے سائنٹیفک طرز پر ایڈیٹ کیا اور ۱۸۶۴ء میں اپنے پرائیویٹ پریس سے شائع کیا۔

' سلسلۃ الملوک' سر سیّد کا مختصر سا لیکن انتہائی مفید رسالہ ہے۔ دراصل یہ ایک جدول ہے جس میں ان راجاؤں اور بادشاہوں کی فہرست ہے جو دہلی پر گزشتہ پانچ ہزار سال کے عرصے میں حکمراں ہوئے۔ اس میں راجہ یدھشٹر سے لے کر ملکۂ معظمہ قیصرۂ ہند تک ۲۰۲

---

(۱) حیات جاوید (ترقی اردو بیورو، ۱۹۷۹) ص ۷۲۔۷۳

Marfat.com

فرمانرواؤں کے نام، باپ کے نام، سنہ جلوس، دارالسلطنت اور عہد وغیرہ انتہائی تحقیق اور محنت و مشقت سے لکھے گئے ہیں۔ بعد میں یہ جدول آثار الصنادید کے دوسرے ایڈیشن (۱۸۵۴ء) میں پہلے باب کے طور پر شامل ہوئی۔

مندرجہ بالا کتابوں کے مطالعہ سے ہمیں سر سیّد کے تحقیقی ذہن اور تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے تحقیق اور تنقید کو یک جا کر کے اردو میں مثبت تحقیق اور متنی تنقید کی روایت کو مستحکم بنیادوں پر قائم کی۔

سر سیّد کے رفقاء، معتقدین اور جانشینوں نے ان کے علمی و ادبی اثرات قبول کئے اور ان کی قائم کردہ روایات کو استحکام بخشا اور ان میں قابل قدر اضافے بھی کئے۔ دبستان سر سیّد کی ایک اہم شخصیت علامہ شبلی کی ہے جنھوں نے افادی ادب اور تحقیق کا سبق سر سید سے ہی پڑھا تھا۔ علامہ کے ادبی کارنامے اتنے وسیع اور متنوع ہیں کہ ان سب کا تعارف کرانے کے لئے ایک دفتر مطلوب ہوگا۔ وہ شاعر تھے، ادیب تھے، مؤرّخ تھے، سوانح نگار تھے، ناقد تھے، محقق تھے اور ان سب کے ساتھ ایک زبردست عالم بھی۔ ان کی تمام تحریروں میں جمالیاتی عنصر نمایاں ہے۔ شعر العجم (۵ جلدیں)، موازنۂ انیس و دبیر، المامون، سیرۃ الصدیق، سیرۃ النعمان اور سیرۃ النبی (جلد اول و دوم) آپ کی معروف اور مقبول تصانیف ہیں۔ ان کے علاوہ سیکڑوں مضامین بھی لکھے جن میں سے بعض اپنی طوالت کے سبب مستقل تصانیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں کتب خانہ اسکندریہ، اور عالمگیر اورنگ زیب پر ایک نظر، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں علامہ شبلی نے بہترین صلاحیتوں کا ثبوت پیش کیا ہے۔ شعر العجم میں فارسی شاعری کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور اگرچہ بعد کے ناقدوں اور محققوں نے جن میں پروفیسر محمود شیرانی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، اس پر اعتراضات بھی کئے ہیں، تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے اردو میں تحقیق و تنقید کے لئے نئی راہیں کھولیں۔ شبلی کے معاصرین میں حالی اور محمد حسین آزاد نے اپنی سوانحی اور تاریخی تصانیف کے ذریعے اردو میں تحقیق کے عمل کو فروغ دیا اور نئی نسل کے محققوں کی ذہنی تربیت بھی کی۔

ان بزرگوں کے بعد زمانہ آتا ہے پروفیسر محمد شفیع اور حافظ محمود شیروانی کا۔ پروفیسر محمد شفیع اورینٹل کالج لاہور سے وابستہ تھے۔ ابتدا میں لکچرر کی حیثیت سے ملازم ہوئے تھے اور ترقی

Marfat.com

کے منازل طے کرتے کرتے اس کے پرنسپل بن گئے اور اسی حیثیت سے وظیفہ یاب ہوئے۔
آپ نے کالج سے وابستگی کے زمانے میں ایک بڑا اہم کام یہ کیا کہ 'اورینٹل کالج میگزین' جاری فرمایا۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۲ء تک مسلسل ۱۷ سال تک یہ آپ ہی کی ادارت میں نکلتا رہا۔ رسالہ تو اس کے بعد بھی جاری رہا لیکن پروفیسر صاحب موصوف ریٹائر ہو جانے کے سبب اس کی ادارت کے فرائض انجام نہ دے سکے۔ لیکن آپ نے اپنے زمانۂ ادارت میں تحقیق و تنقید کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا تھا وہ آخر تک برقرار رہا۔ اس میں جو مضامین شائع ہوتے تھے ان میں سے بیشتر فارسی ادبیات سے متعلق ہوتے تھے لیکن اردو ادب سے تعلق رکھنے والے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے تھے۔ اور چونکہ تمام مضامین اردو زبان میں ہوتے تھے، اس لئے فارسی ادبیات سے تعلق رکھنے کے باوجود اردو میں بھی ان کی اہمیت مسلم ہے۔

پروفیسر محمد شفیع نے کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی، لیکن سیکڑوں مضامین ضرور بطور یادگار چھوڑے۔ ان میں سے بعض انتہائی طویل اور ضخیم ہیں اور کسی طرح بھی مستقل تصنیف سے کم اہم نہیں۔ آپ نے مختلف موضوعات پر جو مضامین قلم بند کیے ان میں تحقیق اور تنقید دونوں کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ یہ ہماری ادبیات کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے حافظ محمود شیرانی کی تحقیقات پر تبصرہ کرتے ہوئے انھیں صحیح معنی میں پروفیسر محمد شفیع کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"پروفیسر شیرانی ادب کے مورخ اور محقق ہونے کے علاوہ تحقیقات کے بھی منفرد ماہر تھے۔ علم سکہ شناسی، کتبہ شناسی، مہر شناسی، تصویر شناسی، قدیم روشنائی، آرائش، نقش و نگار اور خط کی شناخت کے علاوہ اسالیب ادب سے گہری واقفیت رکھتے تھے اور اس مہارت کی وجہ سے تصنیفات کے تاریخی مغالطوں کو کامیابی سے دور کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان معاملات میں برصغیر پاک و ہند میں صرف مرحوم استاد مولوی محمد شفیع ہی ایک ایسے شخص تھے جنھیں پروفیسر شیرانی کا ہم رتبہ کہا جا سکتا ہے"۔

اس بات پر تمام دانشوروں کا اتفاق ہے کہ اس صدی کے عظیم ترین محقق پروفیسر محمود شیرانی ہیں۔ آپ نے مثبت تحقیق اور متنی تنقید کی بہترین مثالیں قائم کیں اور کتنے ہی اُبھرتے

Marfat.com

ہوئے محققوں کی ذہنی تربیت کی۔ ان ہی کے ہم رتبہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی بھی ہیں لیکن پروفیسر محمد شفیع کی طرح آپ نے بھی کوئی مستقل تصنیف بطور یادگار نہیں چھوڑی۔ یہ ہمارے ادب کا بہت بڑا المیہ ہے۔ پروفیسر حافظ محمود شیرانی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے مضامین بھی لکھے اور مستقل کتابیں بھی تالیف کیں۔ پنجاب میں اردو، ان کہ لافانی تصنیف ہے جس کی افادیت اور اہمیت کسی عہد میں بھی کم نہیں ہو گی۔ اس کے اب تک بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی دوسری اہم کتاب 'تنقید شعر العجم' ہے اس کو بھی تنقیدی اور تحقیقی اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح "فردوسی پر چار مقالے" ان کے گہرے مطالعے، تحقیقی ذہن اور اعلیٰ تنقیدی شعور کے مظہر ہیں۔ ان کی تحقیق اور تنقید کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ محض نکتہ چینی اور عیب جوئی نہیں بلکہ اس میں انھوں نے بڑی تحقیق اور تلاش و جستجو سے فردوسی کے شاہنامے اور سلطان محمود غزنوی کے سلسلے میں بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا اور عوام کے دلوں میں ان کے تعلق سے جو مفروضات گھر کر گئے تھے، مدلل شواہد کی روشنی میں ان کا ازالہ کیا۔

'پنجاب میں اردو' میں انھوں نے اردو زبان کی پیدائش اور اس کے مولد سے تفصیلی بحث کی ہے بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ اردو کا اصلی وطن پنجاب ہے اور وہی اس کی جائے پیدائش ہے۔ بعد کے محققین اور ماہرین لسانیات نے ان کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے۔ لیکن تحقیق میں کوئی بات بھی حرف آخر کا درجہ نہیں رکھتی۔ اس لئے کہ تحقیق کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے اور ہر لمحہ کسی نئی دریافت یا نئے شواہد کے منظر عام پر آنے کے امکانات بر قرار رہتے ہیں۔ اس لئے دنیائے تحقیق میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے انقلابات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ لہذا شیرانی کے نظریے کی نفی ہو جانے سے، شیرانی کی محققانہ حیثیت پر کوئی حرف نہیں آتا اور نہ ہی ان کے نظریے کی قدر و قیمت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ شیرانی نے شمالی ہند میں اردو کی تصنیفی عمر کے بارے میں یہ مغالطہ دور کیا کہ اس کی شروعات عہد محمد شاہ یا اس کے قریبی زمانے سے ہوئی اور یہ کہ اس زبان کا تعلق ابتداءً صرف اردوئے معلی سے تھا۔ ان کے نزدیک اصلیت یہ ہے کہ اردو نے ایک عوامی زبان کی حیثیت سے ہر اس جگہ ترقی پائی جہاں اسے پھلنے، پھولنے کے مواقع نصیب ہوئے۔ اس سے ان کے قول کے مطابق اردو کی وسعت کا بھی

Marfat.com

اندازہ ہوتا ہے اور پنجابی زبان کی تعین بھی ہو جاتی ہے۔ اور اسی سے یہ عقدہ بھی کھل جاتا ہے کہ لاہور یا امرتسر، جو پنجابی زبان کے اہم مراکز ہیں، وہاں سے نکلتے ہی پنجابی کے اثرات کم کیوں ہو جاتے ہیں اور اردو کے اثرات کیوں گہرے اور واضح ہونے لگتے ہیں۔

اصل بحث پر آنے سے قبل پس منظر کے طور پر حافظ شیرانی نے لفظ 'اردو' کی اصلیت سے تفصیلی گفتگو کی ہے اور اس کے معانی و مفاہیم متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کے بعد ان مختلف ناموں سے بھی بحث کی ہے جو اس نوزائیدہ زبان کے لئے مستعمل ہوتے رہے جسے بعد میں شیخ امام بخش ناسخ نے 'اردو' زبان کا نام دیا۔ اس مرحلے پر انہوں نے معلومات کی وسعت، مطالعے کی گہرائی، تحقیقی بصیرت اور تنقیدی شعور کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں لفظ 'ریختہ' سے جو بحث کی ہے، وہ حیرت انگیز بھی ہے اور قابلِ داد بھی۔ انھوں نے لفظ 'ریختہ' اور مصدر 'ریختن' کے جو معنی متعین کئے ہیں وہ اس زمانے کے لحاظ سے یکسر نئے نہ سہی لیکن نادر ضرور تھے اور ان سے قبل کسی محقق یا ماہرِ لسانیات نے اس جانب توجہ نہیں کی تھی۔ ملاحظہ ہو 'ریختن' مصدر کے بارے میں وہ لکھتے ہیں :

> "ہمیں یاد رہے کہ ریختن فارسی زبان میں متعدد معنی میں آتا ہے۔ اور معنی سے قطع نظر وہ (۱) بنانے، ایجاد کرنے (۲) کسی چیز کو قالب میں ڈھالنے، نئی چیز بنانے اور (۳) موزوں کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے"۔(۱)

اس کے بعد 'ریختہ' اور لفظ اردو کے مفاہیم میں خفیف سے اختلاف کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر شیرانی لکھتے ہیں :

> "ریختہ سے مراد اگرچہ ولی اور سراج کے ہاں نظم اردو ہے، لیکن دہلویوں نے بالآخر اس کو زبان اردو کے معنی دیدیے اور یہ معنی قدرتاً پیدا ہو گئے اس لئے کہ ان ایام میں اردو زبان کا تمام تر سرمایہ نظم ہی میں تھا۔ جب نثر پیدا ہو گئی تو یہی اصطلاح اس پر ناطق آگئی۔ اس طرح ریختہ قدرتاً اردو زبان کا نام ہو گیا"۔(۲)

محمود شیرانی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ خارجی شواہد کے مقابلے میں داخلی شواہد پر زیادہ زور

---

(۱) پنجاب میں اردو (مکتبہ کلیان لکھنؤ ۱۹۶۰) ص ۴۰
(۲) " " ص ۴۸

Marfat.com

دیتے ہیں اور اسی کے ذریعے نتائج کا استنباط کرتے ہیں۔ انھوں نے اس بات کا بھی عملی ثبوت پیش کیا کہ تحقیق جلدبازی کا کام نہیں ہے۔ اس میں بڑی محنت، لگن اور ژرف نگاہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جب تک ہم سچی لگن سے منضبط طریقے پر کام نہیں کریں گے، اس وقت تک ہم کامیاب محقق نہیں بن سکتے۔ ان کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ نے صحیح لکھا ہے۔ :

"شیرانی نے اپنی تحقیق میں خارجی شواہد کے علاوہ داخلی شہادت کا طریقہ استعمال کیا اور یہ بہت کامیاب رہا۔ اس طریقے سے انھوں نے بعض کتابوں کے غلط انتساب کے مغالطوں کو دور کیا۔ مثلاً دیوانِ حسن، دیوان معینی، پرتھی راج راسا اور خالق باری جو اپنے اصل مصنفوں کے بجائے بعض دوسرے لوگوں کی طرف منسوب ہو گئی تھیں، پروفیسر شیرانی نے اصل مصنفوں کو ان کی گمشدہ کتابیں واپس دلائیں۔ یہ بازیافت بھی گمشدہ بازیافت کی طرح پروفیسر شیرانی کا خاص میدان تحقیق تھا اور اس میں ان کی یکتائی تسلیم شدہ امر ہے"۔(۱)

آگے چل کر لکھتے ہیں :

"شیرانی نے تھوڑے ہی عرصہ میں جو بڑے کام کر دکھائے ان میں ایک امر لائق توجہ یہ ہے کہ انھوں نے ارزاں تصنیف اور سہل الحصول مورخانہ خامہ فرسائی کے راستے بند کر دیے، تاریخی تحریروں میں سخت اور کڑی تنقید کر کے لکھنے والوں میں ذمہ داری کا احساس پیدا کیا، مصنفوں کو محنت کا عادی بنایا اور قدیم ادب کو سمجھنے کا ایسا گر بتایا جو لوگوں کو اگر معلوم بھی تھا تو اس پر عمل نہیں ہوا کرتا تھا، اصول یہ بتایا کہ کسی کتاب کے بارے میں سب سے زیادہ رہنمائی کتاب کے اندر سے ملتی ہے کیوں کہ ہر کتاب آپ اپنی شہادت ہے"۔(۲)

اردو تحقیق کے بلند وبالا ایوان کے ایک اہم ستون بابائے اردو مولوی عبدالحق ہیں انھوں نے تقریباً نصف صدی تک اردو زبان وادب کی دل وجان سے خدمت کی اور اپنا سب کچھ، حتیٰ کہ عیش وآرام بھی اردو کے مفادات کی خاطر قربان کر دیا۔ بابائے اردو علی گڑھ کالج کے پروردہ

(۱) مقدمہ مقالاتِ شیرانی (مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۷) ص ۵
(۲) " " ص ۶

Marfat.com

تھے۔ انھوں نے سر سید کی آنکھیں دیکھی تھیں اور ان سے براہِ راست اکتسابِ فیض کیا تھا۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران انھیں حالیؔ اور شبلیؔ سے بھی استفادہ کا موقع ملا تھا۔ علی گڑھ سے بی۔ اے کرنے کے بعد آپ نے کچھ عرصے تک نواب محسن الملک کے سکریٹری کی حیثیت سے بھی کام کیا اور آپ ہی کی سفارش پر عبدالحق کو حیدرآباد میں ملازمت ملی۔ اس طرح آپ کی تعلیم اور ذہنی تربیت میں سر سید، حالیؔ، شبلیؔ اور محسن الملک کا بڑا ہاتھ رہا۔ مولوی صاحب نے ان بزرگوں کی قائم کردہ ادبی روایات کی بڑی حد تک پاسداری کی اور ان کو متاعِ عزیز کی طرح سینے سے لگائے رکھا۔ چنانچہ ان کی تنقید اور اندازِ تحقیق میں ان بزرگوں کے طریقِ کار اور طرزِ استدلال کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ انھوں نے قدیم متون کی ترتیب و تدوین پر خاص توجہ کی۔ مولوی صاحب پہلے محقق ہیں جنھوں نے خالص اردو کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ انھوں نے حیدرآباد اور اورنگ آباد کے قیام کے دوران دکنی ادب کی بازیافت کے سلسلہ میں عدیم النظیر کام کئے۔ آپ نے دکن کے بے شمار ادب پاروں کو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ اور اس طرح دکن کے بہت سے شاعروں اور نثر نگاروں کو جو انسدادِ زمانہ سے قعرِ گمنامی میں چلے گئے تھے، ادبی حلقوں میں از سرِ نو متعارف کرایا اور حیاتِ نو بخشی۔ اس سلسلے کا سب سے پہلا قابلِ ذکر کام ملا وجہی کی تصنیف 'سب رس' کی تدوین و اشاعت ہے۔ مولوی صاحب نے اس پر ایک مبسوط مقدمہ لکھا اور ابتدائی اردو نیز دکنی ادب میں اس کی قدر و قیمت کا تعین کیا۔ یہ متنی تنقید اور مثبت تحقیق کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس میں انھوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ سب رس ملا وجہی کی طبع زاد تصنیف نہیں ہے، بلکہ اصلاً یہ فارسی قصہ 'حسن و دل' کا ترجمہ ہے۔ اس کے بعد انھوں نے 'حسن و دل' کے مصنف کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی ہیں۔

دکنی ادب کی بازیافت کے سلسلے میں ملا وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' کی تلاش و تحقیق اور ترتیب و اشاعت ہے۔ اس میں انھوں نے تحقیق و تنقید دونوں سے حسبِ ضرورت کام لیا اور ان کی مدد سے اس کا اغلاط سے پاک مستند ایڈیشن تیار کیا، اس پر مقدمہ تحریر کیا اور آخر میں نامانوس دکنی الفاظ کے معنی بھی دیئے جو بڑی حد تک مثنوی کے مشکل الفاظ کی تشریح کا کام بھی دیتے ہیں۔

Marfat.com

اس کے بعد ان کی معرکۃ الآراء تالیف 'نصرتی' شائع ہوئی جس میں دکن کے اس عظیم شاعر کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں اور اسی کے ساتھ اس کے کلام کا تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ نصرتی عادل شاہی دور کا بڑا اہم شاعر تھا۔ مولوی صاحب نے اس کے متعلق اس انداز سے معلومات فراہم کی ہیں کہ اس عہد کا پورا ادبی ماحول ہماری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ اسی طرح آپ نے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے رسالے 'معراج العاشقین' کو دریافت کر کے اپنے تعارفی مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ اس طرح آپ نے عارفانہ ادب میں ایک انتہائی اہم تصنیف کا اضافہ کیا اور دکنی ادب کی گمشدہ کڑی کو تلاش کیا۔

دکنی ادبیات کے علاوہ مولوی صاحب نے شمالی ہندوستان کی تصانیف پر بھی محنت کی اور انتہائی جانفشانی سے تلاش و جستجو کر کے انھیں شائع کیا۔ ان کے تمام قلمی نسخوں کو چھانا پھٹکا اور ان کے مستند ایڈیشن طبع کیے اور ان پر تعارفی نوٹ نیز تحقیقی و تنقیدی مقدمے لکھ کر ان کی اہمیت کو واضح کیا۔ اس سلسلے میں میر انشاء اللہ خاں انشا کی دریائے لطافت (مطبوعہ: ۱۹۱۶ء)، خواجہ میر درد کے بھائی خواجہ میر اثر کی مثنوی 'خواب و خیال' (مطبوعہ: ۱۹۲۶ء) اور میر تقی میر کی آپ بیتی 'ذکر میر' (مطبوعہ: ۱۹۲۸ء) کا ذکر خاص طور پر کیا جا سکتا ہے۔

مولوی صاحب کا ایک قابلِ قدر کارنامہ اردو تذکروں کی بازیافت بھی ہے۔ آپ نے گلشن ہند؛ مؤلفہ مرزا علی لطف، تذکرۂ ہندی مؤلفہ مصحفی، تذکرہ ریاض الفصحاء، عقد ثریا از مصحفی، نکات الشعراء، مؤلفہ میر تقی میر، چمنستان شعراء مؤلفہ لکشمی نرائن شفیق، مخزن شعراء مؤلفہ نور الدین حسین خاں فائق اور گل عجائب، مؤلفہ اسد علی تمنا، جیسے اہم تذکروں کے مخطوطات تلاش کر کے انھیں اپنے تعارفی مقدموں کے ساتھ شائع کیا۔ ان تذکروں کی اشاعت سے مولوی صاحب نے اردو ادب کی تاریخ میں کم از کم دو صدیوں کا اضافہ کیا۔

مولوی صاحب کی تحقیق کا ایک نادر نمونہ ان کی مختصر سی تالیف اردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام ہے۔ یہ کئی انداز سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ سیرت نگاری بھی ہے، مثبت اور ٹھوس تحقیق بھی اور اعلیٰ پایہ کی تنقید بھی۔ اس کی اہمیت ادبی بھی ہے اور لسانی بھی، سوانحی بھی ہے اور مذہبی بھی۔ اس سے ایک طرف اردو زبان کے آغاز و ارتقاء پر روشنی پڑتی

Marfat.com

ہے تو دوسری جانب ان بزرگوں کے حالاتِ زندگی بھی ملتے ہیں، جن کے اقوال اس میں درج کئے گئے ہیں۔ اسی کے ساتھ اس کے مطالعہ سے مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندوستان کی سماجی و معاشرتی حالت سے بھی آگاہی ہو جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر خلیق انجم:

"مولوی صاحب کی ایک کتاب 'اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام' بہت مختصر ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اردو میں پہلی بار صوفیائے کرام کے ملفوظات اور سوانح سے اردو کے وہ فقرے نکالے گئے ہیں جو صوفیا کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ اس کتاب میں مولوی صاحب نے پہلی بار ہماری توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ اردو کے چلن کو عام کرنے میں صوفیائے کرام کا بہت اہم رول رہا ہے۔ بعض صوفیاء حضرات اپنے گھر کے لوگوں اور اپنے مریدوں سے اردو ہی میں بات کرتے تھے"۔(۱)

مولوی صاحب کی ایک اور اہم تالیف 'مرحوم دہلی کالج' ہے پہلے یہ سہ ماہی اردو، میں شائع ہوئی بعد میں کتابی شکل میں آئی۔ اس میں دہلی کالج کی تاریخ اور علمی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ دراصل شمالی ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے فوراً بعد کی نثری ادب کا جائزہ اور اس کے مصنفین کے احوال کا تذکرہ ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم شخصیت ماسٹر رام چندر کی ہے جو دہلی کالج سے حیثیت استاد کے وابستہ تھے اور جنھوں نے اردو میں سائنس کے موضوعات پر مضامین لکھ کر اردو کے دامن کو وسیع کیا تھا۔ آپ نے محب ہند کے نام سے اردو میں ایک ماہنامہ بھی جاری کیا تھا جس میں جدید علوم بالخصوص سائنس وریاضیات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس طرح انھوں نے اردو میں علوم جدیدہ اور علوم مفیدہ کو فروغ دیا۔ مولوی صاحب نے ماسٹر رام چند اور آپ کے دیگر رفقاء کے احوال اور ان کے احوال و علمی کارنامے بیان کر کے انھیں علمی وادبی دنیا سے متعارف کرایا۔ اور ادب کی تاریخ میں ایک شاندار باب کا اضافہ کیا۔

اردو میں متنی تنقید اور ادبی تحقیق کا ایک اعلیٰ نمونہ مولوی صاحب کی مرتب کردہ میر امن کی 'باغ و بہار' ہے مولوی صاحب نے اس پر جو محققانہ مقدمہ سپردِ قلم کیا ہے، وہ آج بھی بنیادی ماخذ کا کام دیتا ہے۔ اس کے ذریعے سب سے پہلے مولوی صاحب نے ہماری توجہ اس

(۱) مولوی عبدالحق: ادبی اور لسانی خدمات (انجمن ترقی اردو، نئی دہلی، ۱۹۹۲) ص ۹۔

Marfat.com

جانب مبذول کرائی ہے کہ یہ امر تحقیق طلب ہے کہ اصلاً یہ امیر خسرو کے فارسی 'قصہ چہار درویش' پر مبنی ہے۔ انھوں نے ٹھوس دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ میر محمد حسین عطا خاں تحسین کی 'داستان نوطرز مرصع' کا جدید روپ ہے۔ بعد کے محققین نے مولوی صاحب کی اس تحقیق کو سند صحت عطا کی۔ آپ کے تحقیقی کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر رفیعہ سلطانہ نے درست ہی لکھا ہے:

"ان کی تحقیقات اردو زبان کے متعلق بھی ہیں اور ادب کے متعلق بھی۔ دونوں میں ان کا طریقہ استخراجی (INDUCTIVE) بھی ہے اور اشتقاقی (DERIVATIVE) بھی۔ یعنی وہ اندرونی اور بیرونی دونوں شواہد (EVIDENCES) سے کام لیتے ہیں۔ پھر لطف یہ کہ تحقیق میں یبوست یعنی 'خشکی' نہیں ہونے پاتی، بلکہ شگفتگی برقرار رہتی ہے۔ یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی وجہ سے ان کی تحقیقات محقق اور متعلم سطح نظر، عام آدمی (LAY MAN) کے لئے بھی دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔ ان کے پیش رو اور مابعد کے محققین میں بھی، بجز چند کے بہت کم میں، یہ خصوصیت نظر آتی ہے۔ حالی اور آزاد کے پاس شگفتگی ہے لیکن دقتِ نظر نہیں، شبلی کے پاس دقتِ نظر ہے لیکن شگفتگی کا فقدان ہے۔ مولوی عبدالحق کی تحقیق حالی اور شبلی دونوں کا سنگم ہے۔ وہ اپنے اسکول کے آپ بانی ہیں"۔ (۱)

عہد حاضر میں اردو تحقیق کی سب سے زیادہ مستند اور معتبر شخصیت قاضی عبدالودود مرحوم کی ہے۔ آپ نے تحقیق کو نیا ضابطہ اور نیا آئین دیا۔ ان کے مطالعہ کی وسعت ناپیدا کنار علمی تبحر عدیم المثال تھا۔ انھوں نے مصنفوں کو منضبط اور مربوط ڈھنگ سے اظہار خیال کی تلقین کی، افراط و تفریط سے اجتناب کرنے اور مبالغہ آرائی سے پرہیز کرنے کا درس دیا۔ اور جہاں انھوں نے مصنفوں کو اس راستے سے بھٹکتے ہوئے دیکھا، وہیں انھوں نے سخت گرفت کی اور اپنی تحقیقات کی روشنی میں ان کے بیانات کی عدم صحت کو اجاگر کیا۔ آپ کے تحقیقی کارناموں کا تفصیلی جائزہ آئندہ ابواب میں لیا جائے گا۔ لہذا یہاں ان کے سلسلے میں مزید کچھ عرض کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ لہذا ان کے بارے میں گفتگو یہیں ختم کی جاتی ہے۔

---

(۱) مولوی عبدالحق: ادبی اور لسانی خدمات: مرتبہ: خلیق انجم۔ ص ۸۵۔۸۶

Marfat.com

اردو میں علمی تحقیق کی روایت کو آگے بڑھانے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے بھی نمایاں رول ادا کیا ہے۔ مولانا عربی، فارسی اور اردو کے زبردست عالم اور صف اول کے مصنف ،مؤلف اور مرتب تھے۔ آپ کی تحقیقات کو درجۂ استناد حاصل ہے۔ آپ نے تینوں زبانوں میں تحقیق اور ترتیب متن کا کام انجام دیا اور ناقابلِ فراموش کارنامے بطور یادگار چھوڑے۔ آپ تقریباً ۴۵ سال تک نوابین رامپور کے شاہی کتب خانہ 'رضا لائبریری' کے ناظم رہے۔ اس دوران آپ نے یہاں کے فقید المثال علمی ذخائر سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور یہاں کے اہم مخطوطات کو ایڈیٹ کرکے اپنے تعارفی مقدموں کے ساتھ شائع کیا۔ اس سلسلہ میں آپ کا سب سے اہم کام مرزا غالب کے اردو دیوان کی ترتیب واشاعت ہے۔ یہ پہلی بار ۱۹۵۸ء میں دیوان غالب: نسخۂ عرشی، کے نام سے شائع ہوا۔ اس کی ترتیب و تدوین انھوں نے سائنٹیفک طریقے پر کی ہے۔ اس کے سلسلے میں عرشؔی صاحب نے تمام دستیاب مآخذ سے استفادہ کیا۔ اس میں پہلے مرحلے کے طور پر انھوں نے دیوان غالب کے ایسے تمام نسخوں کا آپس میں مقابلہ کیا جو غالبؔ کی زندگی میں شائع ہوئے تھے۔ بعد ازاں ان کا مقابلہ ان نسخوں سے کیا جو مرزا غالبؔ کی حیات کے بعد اشاعت پذیر ہوئے تھے۔ اس کے بعد وہ قلمی نسخوں کی جانب متوجہ ہوئے۔ اور پھر ان تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں کا باہمی مقابلہ کرکے مستند متن تیار کیا۔ اس کے لئے آپ نے لفظی اغلاط یا اختلافِ قرأت کی اصلاح کی اور ساقط الفاظ کا اضافہ کیا۔ اس طرح آپ کا تیار کردہ دیوان غالبؔ کا متن مثبت تحقیق اور تنقید متن کا بہترین نمونہ بن گیا۔ یہ دیوان آج بھی مرزا غالبؔ کے اردو کلام کا مستند ترین متن تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس سے عرشؔی صاحب کی غالبؔ سے فریفتگی، شیفتگی، وارفتگی اور عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔

مرزا غالبؔ سے ان کی دلی محبت کا ثبوت ان کے مرتب کردہ 'مکاتیب غالبؔ' سے بھی ملتا ہے۔ یہ اہم کام انھوں نے ۱۹۳۷ء میں انجام دیا۔ یہ وہ خطوط ہیں جو مرزا غالب نے نواب یوسف علی خاں ناظم اور ان کے جانشین نواب کلب علی خاں والیانِ ریاست رامپور کے نام لکھے تھے۔ یہ خطوط اپنی اصل حالت میں رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہیں۔ عرشی صاحب نے ان سب کو بڑی محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا اور مقدمہ، حواشی اور تعلیقات کے ساتھ شائع

Marfat.com

کیا۔ یہ پہلی کتاب ہے جس نے انھیں محقق کی صفِ اول میں نمایاں مقام پر پہنچادیا۔اس کام میں عرشی صاحب نے جس محنت اور محققانہ بصیرت سے کام لیا ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ اصل خطوط کا متن ۱۴۱ صفحوں میں ہے اور اس پر عرشی صاحب نے جو مقدمہ سپرد قلم کیا ہے وہ ۱۸۳ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ان خطوط کے ذریعے عرشی صاحب نے غالب کی زندگی کے بعض ایسے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو اب تک پردۂ خفا میں تھے۔ ان خطوط کی ترتیب واشاعت کو عرشی صاحب کا عظیم تحقیقی کارنامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

غالب کے سلسلہ کی ایک اور اہم کڑی عرشی صاحب کا ترتیب دیا ہوا انتخاب غالب ہے جس میں غالب کے اردو و فارسی نمائندہ کلام کو حواشی کے ساتھ یک جا کر دیا گیا ہے۔ یہ ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں عرشی صاحب کا ایک اور عظیم تحقیقی کارنامہ 'فرہنگ غالب' منظر عام پر آیا۔ اس کو ادبی اور لسانی دونوں حیثیتوں سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مرزا غالب نے اپنے شاگردوں اور دوستوں کو جو سیکڑوں خطوط لکھے، ان میں سے بیشتر میں ادبی مسائل پر روشنی ڈالی ہے، نیز اردو و فارسی لغات کے مفاہیم اور ان کے محل استعمال سے بحث کی ہے۔ عرشی صاحب نے ان خطوط سے لغات سے متعلق معلومات اخذ کر کے یک جا کر دی ہیں۔ اور اس پر ایک طویل محققانہ مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں ہندوستان میں لغت نویسی کا جائزہ لیا ہے۔ اسی ضمن میں یہاں لکھی جانے والی کتب لغات کی فہرست بھی درج کر دی ہے۔ اس مقدمے سے لغت نویسی اور کتب لغات پر ان کی غیر معمولی دسترس کا پتہ چلتا ہے۔

عرشی صاحب کے دوسرے تحقیقی کارناموں میں 'نادرات شاہی' (مطبوعہ ۱۹۴۴ء) اور تاریخ محمدی (مطبوعہ ۱۹۶۰ء) ہے۔ 'نادرات شاہی' شاہ عالم ثانی کے اردو اور ہندی کلام کا مجموعہ ہے۔ یہ نستعلیق اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں چھپی ہے۔ 'تاریخ محمدی' مرزا محمد حارثی بدخشی دہلوی کی تالیف ہے جس میں ۱۱۰۱ھ / ۱۶۸۹ء سے ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۹ء تک کے مشاہیر، اکابر اور اعاظم کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ تاریخ قندہاری، کی ترتیب و تدوین بھی آپ کی تحقیق کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اس کا اصل نام 'تاریخ اکبری' ہے لیکن 'تاریخ قندہاری' کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ 'عہد اکبری' کی ایک نہایت معتبر اور مستند تاریخ ہے۔ اس کا ایک قلمی

Marfat.com

نسخہ رضا لائبریری رامپور میں اور دوسرا نسخہ کیمبرج میں محفوظ ہے۔ عرشی صاحب نے کیمبرج سے اس نسخے کی نقل حاصل کر کے رامپور والے نسخے سے اس کا مقابلہ کیا اور اس طرح دونوں کی مدد سے تاریخ قندھاری کا مستند متن تیار کر کے اسے مفید حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ عربی میں 'دیوان جاحظ' کو ایڈٹ کر کے عرشی صاحب نے عربی زبان و ادب پر اپنی غیر معمولی مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عرشی صاحب نے مخطوطات کی ترتیب و تدوین اور اشاعت میں غیر معمولی محنت، ژرف نگاہی اور تحقیقی بصیرت سے کام لیا ہے اور ان پر آپ نے جو مقدمے اور دیباچے سپردِ قلم کئے ہیں وہ مثبت تحقیق کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان میں " تحقیقی رنگ بھی ہے، کاوش و محنت بھی، جدت و اختراع بھی ہے۔ سفینے کا علم بھی ہے، سینے کا نور بھی اور پیشانی کا پسینہ بھی"۔

ہمارے دور کے محققین میں پروفیسر نذیر احمد (سابق صدر شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کو بھی نمایاں مقام حاصل ہے۔ وہ پروفیسر محمد شفیع اور حافظ محمود شیرانی کی طرز کے محقق ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کی مانند نذیر صاحب کی تحقیق کا بھی خاص میدان فارسی ادبیات ہے لیکن بابائے اردو کی طرح دکنی ادب کے سلسلے میں بھی آپ کی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔ آپ بجا طور پر ایک عظیم محقق، متنی نقاد، ماہر لغات اور ماہر دکنیات کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ آپ کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ آپ کی تحقیقات کو ہندوستان کے علاوہ ایران، پاکستان وسطی ایشیا، ترکی اور ان تمام ممالک میں جہاں فارسی زبان و ادب سے ذوق رکھنے والے حضرات بستے ہیں، عزت و وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور وہاں کے تمام دانشور، اسکالر اور ادیب ادبی و علمی مسائل میں آپ سے رجوع کرتے رہتے ہیں۔

آپ گزشتہ تقریباً ۴۵ سال سے انتہائی اہم موضوعات پر تحقیقی مضامین لکھتے رہے ہیں اور بلند پایہ تالیفات منظر عام پر لاتے رہے ہیں۔ آپ کے بعض مضامین تو اپنی ضخامت اور جامعیت کے لحاظ سے مکمل کتاب کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ کی سب سے پہلی اور اہم کتاب ملا نور الدین ظہوری پر ہے۔ ظہوری عہد عادل شاہ کا اہم شاعر اور ممتاز نثر نگار ہے۔ 'نثر ظہوری' اس کی سب

Marfat.com

سے زیادہ مشہور تصنیف ہے۔ نذیر صاحب نے تلاش و تحقیق سے اس کے حالات جمع کیے اور اس کے علمی آثار کی کھوج کی۔ آپ کی یہ کتاب اعلیٰ تحقیق اور عمدہ تنقید کا بہترین نمونہ ہے۔

دکنی ادبیات کے سلسلہ میں آپ کا اہم کام 'کتاب نورس' کی ترتیب واشاعت ہے۔ یہ بیجاپور کے حکمراں ابراہیم عادل شاہ کی تصنیف ہے۔ یہ بڑا زندہ دل فرمانروا تھا اسے ادب اور شاعری کے علاوہ موسیقی سے بھی دلچسپی تھی اور 'جگت گرو' کہلاتا تھا۔ کتابِ نورس اس کی بہت ہی اہم تصنیف ہے۔ امتدادِ زمانہ سے یہ پردۂ خفا میں چلی گئی تھی البتہ دکن کے کچھ کتب خانوں میں اس کے چند مخطوطے محفوظ تھے۔ لیکن ان کی اشاعت کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہوئی تھی۔ نذیر صاحب نے اس کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ مختلف قلمی نسخوں سے اصل متن کا مقابلہ کیا اور ان کی مدد سے ایک مستند اور محقق متن تیار کیا۔ اور پھر اس کے متعلق جملہ معلومات سے بھرپور مقدمہ لکھا۔ اور حواشی قلمبند کیے۔ اس سلسلے میں نذیر صاحب کو کتنی محنت کرنی پڑی ہوگی اس کا اندازہ کام کی نوعیت سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ کسی ایسے شخص کے لئے جس کا براہِ راست دکن سے تعلق نہ ہو دکنی زبان کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے اس پر مستزاد اس زبان کا مخطوطہ پڑھنا وہ بھی قدیم دکنی کا۔ اس میں ایک ایک لفظ کا تعین بڑا ہی دقت طلب اور صبر آزما کام تھا۔ پھر اس کتاب میں موسیقی کی بے شمار اصطلاحیں اور ہندو صنمیات بھی ہیں جن کی صحیح قرأت کوئی آسان کام نہیں، اس کے علاوہ ان کا سمجھنا اور معنی متعین کرنا سخت دشوار کام تھا۔ لیکن نذیر صاحب ان تمام مراحل سے انتہائی کامیابی سے گزرے۔ یہ ان کا ایسا کارنامہ ہے جس نے اردو ادب کی تاریخ کو آگے بڑھایا۔

فارسی ادب کے سلسلے میں نذیر صاحب کا سب سے اہم کام حافظؔ شیرازی کے دیوان کی ترتیبِ جدید ہے۔ آپ نے دیوان حافظؔ کے قدیم ترین نسخے کی بازیافت کی اور اس کی مدد سے مستند ایڈیشن تیار کیا۔ ایران کے ادبی حلقوں نے نذیر صاحب کی اس کوشش کو بےحد سراہا۔ اسی طرح آپ کے مرتب کردہ 'مکاتیب سنائی' کو بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ سنائی فارسی کا مشہور شاعر ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ فارسی نثر نگاری میں بھی اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ غالبؔ کی طرح اس کے مکاتیب بھی فارسی نثر نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نذیر صاحب نے ان کو بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے مرتب کیا اور اس پر تفصیلی مقدمہ لکھا اور تعلیقات کا اضافہ کیا۔

Marfat.com

فارسی لغت نویسی کے سلسلے میں بھی نذیر صاحب نے بہت کام کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی ان کا اصل میدان ہے۔ نقدِ قاطع برہان، زفانِ گویا اور دستور الافاضل جیسے اہم فارسی لغات کے جدید ایڈیشن اور ان کے متعلق آپ کے مضامین انتہائی وقیع اور تحقیقی ہیں۔ نقد قاطع برہان مرزا غالب کی تحقیقی و تنقیدی ایڈیشن ہے مرزا غالب نے محمد حسین تبریزی کی فارسی لغت برہان قاطع پر سخت نکتہ چینی کی تھی جس پر اس زمانے میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ غالب کے یہ اعتراضات قاطع برہان، کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئے تھے۔ اس کے بعد جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہوا جس نے انتہائی تکلیف دہ شکل اختیار کرلی۔ لیکن جلد ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور رفتہ رفتہ لوگوں کی توجہ قاطع برہان کی جانب سے بھی ہٹ گئی۔ اور پھر یہ عدم توجہی کا شکار ہو گئی۔ ایک طویل عرصہ کے بعد قاضی عبدالودود صاحب نے اس کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور غالب کی چند کوتاہیوں کی نشاندہی کی، لیکن وہ اس کام کو آگے نہ بڑھا سکے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اس پر تفصیلی کام کیا اور جہاں جہاں غالب نے محمد حسین تبریزی پر اعتراضات کیے تھے، نذیر احمد صاحب نے ان تمام مقامات کا جائزہ لیا اور ایک ایک لفظ اور اس کے معانی و مفاہیم سے تفصیلی بحث کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے فرہنگِ قواس، زفانِ گویا، دستور الافاضل اور بحر الفضائل نیز دیگر مستند کتبِ لغات سے مدد لی۔ اور یہ ثابت کیا کہ اگرچہ برہانِ قاطع، اغلاط سے پاک نہیں، تاہم مرزا غالب نے جو اس پر اعتراضات کیے ہیں، وہ بھی مزید تحقیق اور تنقید و تنقیح کے محتاج ہیں۔ نقدِ قاطع برہان' کے مطالعہ سے اس حقیقت کا ادراک ہوتا ہے کہ دوسروں کی تحقیق پر بھروسا کر کے کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہی جاسکتی۔ کتاب کے آخر میں پانچ ضمیمے بھی ہیں جن کے عنوانات ہیں: (۱) دساتیر پر ایک نظر (۲) برہان قاطع (۳) غالب اور صاحب برہان قاطع میں اتحادِ نظر (۴) غالب اور ذال فارسی اور ز (۵) تصحیفات اور لغاتِ فارسی۔ یہ پانچوں مضامین بہت طویل، انتہائی اہم اور پُر از معلومات ہیں۔ یہ نذیر صاحب کے محققانہ ذہن اور تنقیدی بصیرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ خصوصیت سے 'دستاویز پر ایک نظر' اور غالب اور صاحب برہان قاطع میں اتحادِ نظر، تو نقد قاطع برہان' کے گل سر سبد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دساتیر پر آپ نے جو ضمیمہ قلم بند کیا ہے۔ وہ اپنے موضوع پر پہلی اور اب تک کی آخری کوشش ہے۔ اس سے نذیر احمد صاحب کے تحقیقی ذہن اور قدیم فارسی ادب پر غیر معمولی قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔

Marfat.com

نذیر صاحب کے کارناموں اور تحقیقی طریقِ کار کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے اس دور کے عظیم محقق اور دانشور قاضی عبدالودود نے درست فرمایا تھا۔

"تحقیق کے لئے قانون، ریاضی یا فلسفے کا ڈسپلن ضروری ہے اور ڈاکٹر نذیر احمد اس معاملے میں تنہا استثنا ہیں جو اس قسم کے کسی ڈسپلن کے بغیر تحقیق کا حق ادا کرتے ہیں"۔

مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ نذیر صاحب کی تحقیقی فتوحات کئی لحاظ سے منفرد ہیں۔ انھوں نے اپنے کاموں کو محض تحقیق اور ترتیب متن تک ہی محدود نہیں رکھا ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھایا۔ اس کے علاوہ ان کا بہت بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے دوسروں کے اغلاط کی گرفت کرنے کے بجائے اپنی اور یجنل تحقیق کی طرف زیادہ توجہ کی اور اس طرح اپنے تحقیقی کاموں کو منفی تحقیق کی حدود میں داخل ہونے سے محفوظ رکھا ہے۔ اسی طرح انھوں نے اپنی تنقید کو بھی محض نکتہ چینی اور عیب جوئی کے زمرے میں قدم رکھنے سے بچالیا ہے۔ ان کی تنقید دراصل ان کے تحقیقی کاموں میں مدد کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس طرح وہ نقد و نظر کے سہارے اپنے تحقیقی کارواں کو جادۂ اعتدال پر ڈالتے ہیں کہ یہیں سے بامقصد اور مثبت تحقیق کی منزل تک رسائی ممکن ہوتی ہے۔

اردو میں تحقیق کے اس سرسری جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے ادب میں یہ روایت بہت مستحکم اور مضبوط ہے۔ ہمارے محققوں اور دانشوروں نے اردو میں تحقیق کو ایک مستقل فن کی شکل عطا کی اور صحیح معنی میں اسے صنفِ ادب بنادیا۔ اگر ہم عالمی ادب کا بغور مطالعہ کریں تو یہ بات از خود واضح ہو جائے گی کہ کسی بھی ادب میں بجز اردو ادب کے، تحقیق کو یہ درجہ اور یہ مقام حاصل نہیں ہے۔ ہمارے دانشوروں نے تحقیق کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، اس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ ان حضرات نے ایک بہت بڑا کام یہ کیا کہ پہلے اصولِ تحقیق وضع کیے، پھر تحقیق اور تنقید میں ربط قایم کیا، پھر ان روابط کے حدود مقرر کیے اور دونوں کا دائرہ کار متعین کیا۔ ان حضرات نے یہ بات بھی واضح کی کہ تحقیق بغیر تنقیدی شعور کے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتی۔ نیز یہ بھی واضح کیا کہ ایک اچھے اور اعلیٰ پائے کے محقق کے لئے لازم ہے کہ وہ صاف وشفاف تنقیدی شعور بھی رکھتا ہو۔ یہ حضرات خود بھی اعلیٰ تنقیدی ذوق کے مالک تھے اسی لئے تحقیق کے میدان میں ایسے عظیم الشان کام انجام دے سکے جن کی نظیر ملنی مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہے۔

Marfat.com

اُصولِ تحقیق قاضی صاحب کی نظر میں

اس سے قبل کہ قاضی صاحب کے تحقیقی کارناموں کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا جائے، ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے یہ دیکھا جائے کہ تحقیق کے اصول کیا ہیں اور ان پر ہی ہمارے محققین کی کاوشیں کہاں تک پوری اترتی ہیں۔ نیز یہ کہ خود قاضی صاحب نے کس نہج پر کام کیا اور اتنے عظیم کارنامے انجام دینے میں انھوں نے کن اصول و ضوابط کی پابندی کی۔ اس سلسلے میں قاضی صاحب نے خود ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جو اصولِ تحقیق کے عنوان سے ششماہی 'غالب نامہ' (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۸۴ء) میں شائع ہوا۔ ذیل میں اسی مضمون کو بنیاد بنا کر تحقیق سے متعلق قاضی صاحب کے وضع کردہ اصول کی تعبیر و تشریح اور توضیح کی جاتی ہے۔ اس مضمون میں سب سے پہلے قاضی صاحب نے فنِ تحقیق کے مفہوم کی وضاحت کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ تحقیق کسی امر کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ یہ کوشش ہمیشہ مشکور ہی ہو۔ اس میں کامیابی یقینی نہیں۔ دونوں ہی امکانات موجود رہتے ہیں۔ کبھی کامیابی ہوتی ہے اور کبھی نہیں بھی ہوتی۔ اور کبھی بیک وقت دونوں ہی باتیں ہوتی ہیں۔ یعنی جزوی کامیابی۔ اس سلسلے میں آپ نے ایک امریکی دانشور مسٹر مل (MILL) کے ایک قول کا حوالہ دیا ہے کہ خارجی حقیقت کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ خارجی حقیقت کے لئے اس نے لفظ OBJECTIVE REALITY کا استعمال کیا ہے۔ قاضی صاحب کا فرمانا ہے کہ یہ بات غلط ہے کہ خارجی حقیقت کا وجود نہیں، بلکہ حقیقت ہر حال میں موجود رہتی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ اسے ہم تلاش نہ کر پائیں یا ذرائع کی قلت کے باعث اس کا ادراک نہ کر سکیں۔ اس کے بعد تحقیق کا پہلا اصول بتاتے ہوئے قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ محقق کو موضوع منتخب کرنے سے قبل اس بات کا تیقن کر لینا چاہیے کہ وہ موضوع کے ساتھ انصاف کر سکے گا۔ یعنی یہ کہ اس پر کام کرنے کی اس میں کماحقہٗ صلاحیت ہے اور اس کے متعلق تمام ضروری وسائل اسے حاصل ہوں گے۔

قاضی صاحب راست گفتاری کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ وہ مبالغہ آرائی کو بے حد ناپسند

Marfat.com

کرتے ہیں۔ چنانچہ تحقیق کادوسرااصول آپ نے صداقت کی راہ پر چلنااور مبالغے سے اجتناب کرنا بتایا۔ آپ فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی ایسے موضوعات بھی سامنے آتے ہیں جن پر غیر جانبدارانہ انداز سے لکھنا محقق کے لئے مضرت رساں ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت حال میں اس کے لئے صرف دوراستے نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ راست گفتاری کادامن ہاتھ سے چھوڑدے اور غلط بیانی کی راہ پر گامزن ہو جائے یا پھر دوسرا راستہ یہ ہے کہ وہ اس موضوع پر کام کرنے کاارادہ ترک کردے۔ قاضی صاحب ایسی صورت میں اُسے دوسری راہ اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس لئے کہ بقول قاضی صاحب "کسی محقق کے لئے یہ نہایت نازیبابات ہے کہ اُسے خوف راست گفتاری سے بازرکھے"۔

تیسرا اصول موضوع کے ساتھ انصاف کرنا مقرر کیا گیا۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں زیر تحقیق موضوع کے مختلف اجزا ہو سکتے ہیں اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ یہ سب یکساں اہمیت کے حامل ہوں۔ ان میں سے یقیناً کچھ کم اہم ہوں گے اور کچھ زیادہ۔ لہذا ایک سچے محقق کا فرض ہے کہ وہ ان میں امتیاز کرے اور دونوں قسم کے اجزا کے ساتھ پوراپورا انصاف کرے۔ اور جو کم اہم اجزاء ہیں اُن پر بھی مناسب توجہ دے اس لئے کہ کبھی کبھی غیر اہم بات بھی اپنے سیاق و سباق کے لحاظ سے اہم ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جونسن کے قول کا سہارا لیا ہے کہ معاملہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ اس کی تفصیلات کے بیان میں جزوی انحراف بھی روا نہیں۔

قاضی صاحب نے چوتھا اصول یہ بتایا کہ تحقیقی عبارت لکھتے وات سیدھی اور رواں زبان کا استعمال کرنا چاہیے۔ خطیبانہ انداز سے یکسر اجتناب کرنا چاہئے۔ تشبیہات و استعارات کا استعمال صرف اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے کرنا چاہئے، عبارت کی آرائش کے لئے نہیں۔ اسی طرح عبارت میں غیر ضروری طوالت سے بھی احتراز کرنا چاہیے۔ کم سے کم الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرنا چاہئے بات واضح اور غیر مبہم کہنی چاہئے اور اسلوب بیان ایسا اختیار کرنا چاہئے کہ ہر قسم کے شک وشبہ کی گنجائش ختم ہو جائے۔ اس کے بعد انھوں نے علامہ شبلی، محمد حسین آزاد، پروفیسر مختار الدین وغیرہ کی عبارتوں سے اقتباس بطور مثال پیش کئے ہیں جن میں تناقص بھی ہے، تضاد بھی اور ابہام بھی۔

پانچواں اصول کتاب کی مختلف اشاعتوں کے سلسلے میں ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر ایک

Marfat.com

کتاب مصنف کی حیات میں متعدد بار شائع ہوئی ہے اور ان کی عبارت میں اختلاف پایا جاتا ہے تو سب سے زیادہ مستند وہ ایڈیشن ہے جو سب سے آخر میں طبع ہوا۔ بشرطیکہ خود مصنف نے اس میں حک و اصلاح اور تغیر و تبدل نہ کیا ہو۔

چھٹا اصول قلمی نسخوں سے متعلق ہے۔ ایک ہی تصنیف کے مختلف مخطوطات میں اختلاف قرأت بہت پایا جاتا ہے۔ یہ کبھی تو اس سبب سے ہوتا ہے کہ مصنف خود اس میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں کرتا رہتا ہے اور کبھی کتابت میں غلطیاں در آتی ہیں۔ ایسی صورت میں مستند قلمی نسخہ اسے قرار دیا جانا چاہئے جس میں مصنف نے آخری بار اصلاح کی ہو۔ یا اگر ایسا نہیں ہے تو اس قلمی نسخے کو بنیاد بنانا چاہیے جس میں الحاقی کلام کی گنجائش بہت ہی کم ہو۔

کسی دوسرے مصنف کی عبارت یا کوئی شعر نقل کرتے وقت صحتِ متن کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ عام طور پر لوگ اس بات کا خیال نہیں رکھتے۔ اس کی وجہ سے ان کی عبارت یا رائے کی ثقاہت مشکوک اور مجروح ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ہی کتاب میں کسی دوسری تصنیف کی ایک ہی عبارت کئی جگہ نقل ہوئی ہے اور ہر جگہ اختلافِ قرأت موجود ہے۔ ایسی صورت میں پوری کتاب بد نما ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔

جو بات کہی جائے وہ مستند حوالوں کے ساتھ کہی جائے۔ بغیر حوالے کے کوئی بات کہنا معیوب و ناپسندیدہ فعل ہے۔ لیکن اس میں بھی کچھ امتیاز کرنا ہوگا۔ کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کا ذکر کرتے وقت حوالہ دینا غیر ضروری اور بعض اوقات ناپسندیدہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر ہم ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند اور تخلیق پاکستان کی بات کریں تو اس کے لئے کسی تاریخی کتاب کے حوالے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اگر کہا جا رہا ہے کہ لندن برطانیہ کا دارالخلافہ ہے اور چین برصغیر ایشا کا ملک ہے، تو ایسے امور کے لئے جغرافیہ کی کتاب یا اٹلس کا حوالہ دینا ضروری نہیں۔ البتہ ایسے امور جو اختلافی ہو جائیں، ان میں سے کسی ایک رائے یا نظریہ کو ترجیح دینے کے لئے اسناد اور حوالوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔

تحقیق میں معاصرانہ شواہد بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں لیکن ان پر کلی طور پر اعتماد

Marfat.com

نہیں کیا جا سکتا۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت سی باتیں محض عقیدت کی بناء پر لکھ دی جاتی ہیں۔ اسی طرح یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ لکھنے والے کا اگر کسی شخص سے نظریاتی یا کسی اور قسم کا اختلاف ہے تو محض اس کی شخصیت کو مجروح کرنے کی خاطر وہ ایسی باتیں اس سے منسوب کر دیتا ہے جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لہٰذا عصری شہادتوں کو بھی جب تک جرح و تعدیل کی کسوٹی پر نہ پرکھ لیا جائے اس وقت تک اُن پر بھروسہ کرنا تحقیق کے مزاج کے منافی ہوگا۔

ایک محقق، ادبی اور دانشور کے لئے ادبی اصطلاحات سے واقفیت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں قاضی صاحب نے مرزا غالبؔ کی ایک غلطی کی نشاندہی کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ غالبؔ تمام عمر یہ سمجھتے رہے کہ 'تقریظ' خاتمۂ کتاب کو کہتے ہیں، خواہ وہ خود مصنف کے قلم سے ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ "قاطع برہان" طبع اول کے خاتمے کو جو خود ان کا لکھا ہوا ہے، انھوں نے تقریظ کہا ہے اور 'باغ دودر' میں بھی اسی نام سے یاد کیا ہے اس کے علاوہ انہوں نے کسی خط میں بھی تقریظ کو خاتمۂ کتاب کہا ہے۔

اس موقع پر ایک بات کھٹکتی ہے اور وہ یہ کہ قاضی صاحب نے یہ تو فرمادیا کہ مرزا غالبؔ تقریظ کا مفہوم غلط سمجھے، لیکن اس کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کی وضاحت نہیں فرمائی۔ محض غلطی کی نشاندہی کافی نہیں ہوتی، اس کی اصلاح بھی ضروری ہوتی ہے۔

قاضی صاحب ایک محقق کے لئے فنِ تاریخ گوئی کے قواعد سے واقفیت کو بھی لازمی قرار دیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ اس کو جدید و قدیم املاء میں امتیاز بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ مثلاً اردوئے قدیم میں 'اس' کو 'واو' کے ساتھ اوس لکھا جاتا تھا۔ اُسی اُن، وغیرہ الفاظ کے لئے بھی اظہار ضمہ کے لئے الف کے بعد 'واو' کا اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ اسی طرح قدیم فارسی میں امید کو امیذ (ذال معجمہ کے ساتھ) لکھا جاتا تھا۔ لہٰذا ایک محقق کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تمام باریکیوں کو ذہن میں رکھے۔ اسی طرح اگر مادۂ تاریخ کے ساتھ سنہ مطلوب درج بھی ہو تب بھی محقق کو چاہئے کہ خود حساب لگا کر اطمینان کر لے۔ دوسرے شخص کے دیے ہوئے سنہ مطلوب پر اعتبار کرنا احتیاط کے منافی ہے۔

Marfat.com

قاضی صاحب بحیثیت محقق

قاضی عبدالودود ہمارے دور کے عظیم محقق ہیں۔ان کے تحقیقی کارنامے فقید المثال اور عدیم النظیر ہیں اور بلاشبہ اس قابل ہیں کہ آب زر سے لکھے جائیں۔ یہ اردو ادب کی تاریخ کا ایسا باب ہیں جس کے بغیر تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

جو شخص جتنا بڑا اور جتنا عظیم ماہر فن ہوتا ہے، اس کی شخصیت اور کمالِ فن اتنا ہی مختلف فیہ اور متنازعہ فیہ بن جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جس کا کوئی استثنا نہیں۔ قاضی صاحب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ جہاں ان کے تحقیقی فتوحات کو سراہا جاتا ہے، انھیں بے مثال کارنامہ قرار دیا جاتا ہے اور جہاں ان کو عظیم محقق، تحقیق کا معلم ثانی[1] اور بت شکن محقق جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے، وہیں کچھ حضرات ان کے تحقیقی کارناموں کو منفی تحقیق، نکتہ چینی اور عیب جوئی پر محمول کرتے ہیں اور اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ قاضی صاحب کو تحقیق سے کم اور دوسروں کی غلطیاں پکڑنے سے زیادہ دلچسپی رہتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے کوئی مستقل تصنیف بطور یادگار نہیں چھوڑی۔ انھیں دوسروں پر تنقید کرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی جو کوئی تعمیری کام کریں۔

اگر ہم قاضی صاحب کی جملہ تحریروں کا بغور مطالعہ کریں تو معترضین کی بہت سی باتیں خود بخود غلط ثابت ہو جائیں گی۔ دراصل ان سے ناراضگی کا عام سبب یہ ہے کہ انھوں نے معاصرین پر بھی تنقید کی ہے اور ان کے تحقیقی کاموں کو ناقص قرار دیا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قاضی صاحب جو گرفت کرتے ہیں وہ اتنی مضبوط، مدلل اور مستحکم ہوتی ہے کہ اُس کی تردید مشکل اور کبھی کبھی ناممکن ہو جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے یہاں سخت گیری بہت ہے۔ وہ معمولی سے معمولی فروگذاشت کو بھی ہمالیائی غلطی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں کسی قسم کی رعایت، درگذر یا معافی کا کوئی خانہ نہیں۔ اسی لئے ان کے مخالفین نے انھیں سخت گیر، عیب بیں اور رائی کا پہاڑ بنا کر پیش کرنے والا محقق بتانا شروع کر دیا اور ان کی تمام تحقیقات کو منفی اور تخریبی کارروائی بتا کر ان کی اہمیت کو کم کرنا چاہا۔ لیکن حقیقت پوشیدہ نہیں رہتی۔ وہ اپنی

---

(۱) معلم اوّل حافظ محمود شیرازی کو قرار دیا جاتا ہے۔

Marfat.com

اہمیت اور افادیت مسلّم ہے۔ وہ حضرات جو ان کی تحقیقات کے منکر اور طریق کار پر معترض تھے، ان کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور ان کے معتقدین و معترفین کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی تحریریں منفی نہیں بلکہ تعمیری اور مثبت تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ موجودہ عہد کے سربرآوردہ محقق اور ناقد جناب رشید حسن خاں نے قاضی صاحب کے متعلق صحیح فرمایا ہے:

"قاضی عبدالودود صاحب کو اردو میں تحقیق کا معلم ثانی کہنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ نئی نسل تحقیق کے آداب اور انداز سے قاضی صاحب کے توسط سے آشنا ہوئی ہے، پچھلے پچیس تیس برسوں میں احتیاط پسندی کا جو رجحان بڑھا ہے، شک کرنے، یا یوں کہیے کہ مضبوط دلیلوں کے بغیر دعووں کو قبول نہ کرنے کا انداز جس طرح فروغ پذیر ہوا ہے اور منطقی استدلال نے جس طرح اہمیت حاصل کی ہے، یا دوسرے لفظوں میں زود یقینی اور خوش اعتقادی نے جس طرح کم اعتباری کی سند پائی ہے؛ اس میں قاضی صاحب کی تحریروں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان کی بے لچک شخصیت، ان کے بے جھجک اندازِ گفتگو اور ان کے سخت گیر احتساب نے، اس زمانے میں، تحقیق کے طالب علموں کی ذہنی ترتیب کی ہے اور ان کی تحریروں نے یہ بتایا ہے کہ تحقیق کی زبان اور پیرائی اظہار میں انشاء پردازی، مرصع کاری اور الفاظ کے بے محابا استعمال کی مطلق گنجائش نہیں"۔ (۱)

اس تمہید کے پس منظر میں قاضی صاحب کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لینا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں ان کی تحقیقات ور طریق کار دونوں کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اصلاً یہ دکھانا مقصود ہے کہ قاضی صاحب نے تحقیق کے جو اصول وضع کیے اور جن پر گزشتہ باب میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، خود قاضی صاحب نے کہاں تک ان کی پاسداری کی اور وہ خود اپنے ہی بتائے ہوئے راستے پر چلنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے۔

قاضی صاحب نے عملِ تحقیق میں صداقت اور راست بازی پر بہت زور دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"کسی محقق کے لئے یہ نہایت نازیبا بات ہے کہ اُسے خوف راست گفتاری سے باز رکھے"۔

قاضی صاحب نے اپنی تمام تحریروں میں اس اصول کی سختی سے پابندی کی ہے۔ وہ خواہ پیش رو پر قلم اٹھا رہے ہوں، خواہ کسی معاصر پر، بات ہمیشہ وہی کہیں گے جسے وہ صحیح سمجھتے ہیں۔

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر، ۱۹۷۶) ص ۱۲۰

Marfat.com

ان کی تنقید کا گرز ہر ایک پر یکساں چلتا ہے۔ ان کا فرمانا تھا کہ انصاف ہو تو سب کے ساتھ ہو۔ اس میں امتیاز من و تو کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک کو تو سر دار چڑھا دیا جائے اور دوسرے کی جان بخشی کر دی جائے۔ چنانچہ ان کے معاصرین میں چاہے مولانا ابو الکلام آزاد ہوں، یا بابائے اردو مولوی عبد الحق، شاد عظیم آبادی ہوں یا اُن کے مخلص اور بہترین دوست فخر الدین علی احمد یا بیرسٹر نور الدین احمد، خواہ معاصر محققین میں پروفیسر مسعود حسن رضوی ہوں، خواجہ احمد فاروقی ہوں، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ہوں یا ڈاکٹر گیان چند جین، ان سب کے تعلق سے قاضی صاحب کا جو رویہ ہے، اُس پر مرزا سودا کا یہ مصرع یاد آتا ہے ؂

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

کہا جاتا ہے کہ ایک صاحب جن کو قاضی صاحب بے حد عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ایک بار ان سے ملنے ان کے گھر آئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے قاضی صاحب سے عرض کیا کہ آپ اپنی تنقید سے مولانا ابو الکلام آزاد کو بھی نہیں بخشتے اگر مولانا جیسے عظماء کو بھی نہیں چھوڑیں گے تو پھر ہندوستانی مسلمانوں کے پاس بچے گا ہی کیا۔ اغیار ویسے ہی ہمارے اوپر حاوی ہوتے جا رہے ہیں۔ قاضی صاحب کو یہ بات پسند نہ آئی۔ ان کی جانب نگاہ بھر کر دیکھا اور خاموش ہو گئے، صرف اس لئے کہ وہ صاحب اس وقت ان کے مہمان تھے۔ بقول ڈاکٹر عابد رضا بیدار :

> "منصف مزاجی جب اس انتہا کو پہنچ جائے تو ہو یہ جاتا ہے کہ پھر زبان اور قلم دونوں اپنے بس میں نہیں رہتے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے انصاف پسندی کے فرشتہ نے اپنے شہپر پھیلا کر زبان و قلم دونوں کو ان کے مالک کے قبضہ سے الگ کھینچ کر اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ ایک بار بڑی بے کسی سے کہنے لگے "کبھی کبھی تو اپنی اس عادت سے بڑی تکلیف محسوس ہوتی ہے مگر ایسی بُری عادت پڑ چکی ہے کہ زبان سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں۔ سننے والے اس شخص سے جا کر کہہ دیتے ہیں۔ جاننے والا ہوتا ہے اور اسے دکھ ہوتا ہے تو اس سے مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ مگر میں کیا کروں" (۱)

جناب سید حسن نے ان کی سخت گیری کا ایک بڑا دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ اپنے تاثراتی مضمون بعنوان قاضی صاحب میں وہ لکھتے ہیں :

---

(۱) معاصر (قاضی عبد الودود نمبر، ۱۹۷۶) ص ۳۰۳۔۳۰۴

Marfat.com

"قاضی صاحب تحقیقی کام میں بے راہ روی وبد عنوانی، بے پروائی وغلط نگاری برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ بے پروا محقق کی سختی سے تنقید کرتے ہیں اور اس معاملے میں وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہیں۔ موافق ہو یا مخالف ان کی نگاہ میں شخص کوئی چیز نہیں، اصل میں اس کا کارنامہ ہے۔ تقریباً پندرہ سال پہلے وہ لاہور تشریف لے گئے تھے۔ وہاں ڈاکٹر وحید قریشی سے ان کی شناسائی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت میر حسن کے متعلق تحقیقی کام کر رہے تھے۔ قاضی صاحب کی شناسائی سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے جب اپنا مقالہ ڈی لٹ کے لئے پنجاب یونیورسٹی میں داخل کیا تو اس کا ایک اکزامنر قاضی صاحب کو بھی مقرر کر دیا۔ چنانچہ جب وہ مقالہ قاضی صاحب کے پاس آزمائش کے لئے پہنچا تو قاضی صاحب نے اس میں بہت سی خامیاں دیکھیں۔ مایوس ہو کر اسے رکھ چھوڑا اور کئی مہینوں تک اس پر کوئی کارروائی نہیں کی۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے اس کے بارے میں تذکرہ کیا اور اسے واپس کر دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے عرض کیا کہ اگر واپس کر دینے کا خیال تھا تو فوراً واپس کر دینا بہتر تھا۔ اب جب کہ اتنی تاخیر ہو گئی ہے تو قرین مصلحت یہی ہے کہ آپ اس پر رپورٹ لکھ دیں۔ چنانچہ انھوں نے اس مقالے کی کمزوریوں اور غلطیوں کی ایک طویل فہرست تیار کی اور یونیورسٹی کو یہ لکھ کر بھیج دی کہ پہلے ان غلطیوں کی اصلاح کر لی جائے تب ڈگری دینے کی سفارش کی جائے گی۔ یونیورسٹی نے قاضی صاحب کے بدلے ایک دوسرا اکزامنر مقرر کر دیا اور وحید قریشی کو ڈی۔ لٹ کی ڈگری مل گئی"۔(۱)

اس سے قاضی صاحب کی اصول پرستی اور بے لوچ شخصیت کا پتہ چلتا ہے وہ بڑے سے بڑے مصنف، ادیب اور شاعر پر سخت سے سخت الفاظ میں تنقید کرنے میں ذرا سی بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ وہ مصنف کو کاذب، غیر محتاط اور ضعیف الحافظہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) اپنے ایک مضمون بعنوان 'میر کے حالاتِ زندگی' مطبوعہ دلی کالج میگزین (میر نمبر ۱۹۶۲ء) میں میر کے متعلق لکھتے ہیں:

---

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر، ۱۹۷۶) ص ۲۷۷۔۲۷۸

Marfat.com

"میرؔ نہ منصف ہیں، نہ راست گفتار اور ان کا حافظہ بھی زیادہ مضبوط نہیں ہے" (ص ۷۲)

(۲) "انھوں (میرؔ) نے اپنی ذات، اپنے بزرگوں اور اپنے مخالفین کی نسبت جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ لازماً قابل قبول نہیں"۔ (ص ۷۲)

دلی کالج میگزین کے مذکورہ میرؔ نمبر میں قاضی صاحب کا ایک اور مضمون ہے جس کا عنوان ہے "کلیات میر کی اولین اشاعت" اس کا پہلا ہی جملہ آپ کے مخصوص طنز کے تیر و نشتر سے لبریز ہے۔ ملاحظہ ہو:

"۱۲۲۶ھ کے بعد کلیات میرؔ کا کوئی نسخہ شائع ہوا ہے تو تجارتی اغراض سے۔ ہندوستان و پاکستان کے کسی ادارے کو اس کی طرف توجہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ یہ جس قدر شرم کی بات ہے اُسی قدر یہ امر قابل ستائش ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل و عقد کو آج سے کم و بیش ڈیڑھ سو برس قبل کلیات کی اشاعت کا خیال آیا۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس کی تصحیح و ترتیب کے لئے جو لوگ منتخب ہوئے انھوں نے یہ کام اس طرح انجام نہیں دیا کہ اس سے کافی طور پر اطمینان ہو سکے"۔ (ص ۳۹۱)

اسی طرح میر تقی میرؔ کی خود نوشت ذکر میرؔ کے متعلق صاحب فتویٰ صادر فرماتے ہیں کہ:

"آپ بیتی کی حیثیت سے یہ قطعاً ناکامیاب ہے اور یہ بدترین آپ بیتیوں میں ہے جو میری نظر سے گزری ہیں"۔(۱)

'تذکرۂ گلشن ہند مؤلفہ مرزا علی لطفؔ کو سب سے پہلے علامہ شبلیؔ نے مرتب کر کے شائع کرا لیا تھا۔ اس پر بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ایک مبسوط مقدمہ سپردِ قلم کیا جو پہلی بار مولانا حسرت موہانی کے رسالہ اردو معلّیٰ (نومبر ۱۹۰۶ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۳۴ء میں مولوی صاحب نے اس تذکرے کو انجمن ترقی اردو سے از سر نو شائع کیا۔ لیکن اس میں مقدمہ انھوں نے وہی شامل کر دیا جو اردو معلّیٰ نومبر ۱۹۰۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے اس پر اعتراض کیا اور اپنے مضمون عبدالحق بحیثیت محقق کے تیسری قسط میں لکھا:

"انھیں اس کے سوا کہ اشتیاقؔ کے بارے میں دو سطروں کا حاشیہ بڑھا دیں ۲۸ برس

---

(۱) معاصر۔ پٹنہ۔ ح ۱۳۔ ص ۱۳۸

Marfat.com

گزر جانے پر بھی کہیں کچھ گھٹانے بڑھانے یا بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی"۔(۱)

عمدہ منتخبہ یعنی تذکرۂ سرور، مرتبہ خواجہ احمد فاروقی پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں :

"سرورق میں 'تالیف نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر سرور" اور اس کے بعد ان کے والد کا نام مع خطابات ہے۔ مصنف کا خطاب دینے کی ضرورت نہ تھی، اور دیا تھا تو دوسرے خطاب معظم جنگ کا اندراج بھی ضروری تھا۔ سرورق میں باپ کا ذکر بالکل فضول ہے"۔(۲)

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی تالیف 'میر تقی میر' حیات اور شاعری، پر اپنے طویل تبصرے میں ایک جگہ قاضی صاحب فرماتے ہیں :

"آرزو سے قواعد اردو سیکھنا محتاجِ ثبوت ہے۔ قواعد میر کا میر سے کچھ سروکار نہیں۔ خواجہ عشرت راوی کی حیثیت سے بالکل ساقط الاعتبار ہیں"(۳)

اسی طرح عبدالحق بحیثیت محقق، کے آغاز ہی میں اس کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے قاضی صاحب فرماتے ہیں :

"اس مقالے کی علت غائی محقق کی حیثیت سے ان کے مرتبے کی تعین ہے...... ڈاکٹر عبدالحق کی غلطیوں اور فروگذاشتوں کا استقصائے کامل مد نظر نہیں"۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے اسلوبِ نگارش پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"مصنف کی نثر میں رنگ و آہنگ کی کمی نہیں۔ لیکن ان کے یہاں تناقص، تضاد، ضعفِ استدلال اور مبالغہ موجود ہے۔ وہ کلیات قائم کرتے ہیں تو مستثنیات کو اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں یا ان کا ذکر کرتے ہیں تو کسی اور جگہ ....ان کے بہت سے حسین فقرے اردو فارسی کے اشعار سے لئے گئے ہیں یا انگریزی کا ترجمہ ہیں۔ اس میں برائی نہیں لیکن قابلِ اعتراض ان کے بے محل استعمال کا شوق ہے"۔(۴)

---

(۱) معاصر۔ پٹنہ حصہ ۱۵۔ ص ۳۰
(۲) اشتر و سوزن۔ ص ۹
(۳)..................ص ۱۴۶
(۴) عیارستان۔ ص ۲۷۔۲۸

Marfat.com

قاضی صاحب کا دوسرا وصف یہ ہے کہ وہ ہر بات مدلل کہتے ہیں۔ وہ جب کسی کے دعویٰ کو باطل قرار دیتے ہیں، یا کسی بات پر تنقید کرتے ہیں تو وہ اتنے مضبوط دلائل سے کام لیتے ہیں کہ ان کی بات کی تردید ناممکن ہو جاتی ہے۔ کسی کی بات کو غلط کہنا آسان ہے، لیکن اُسے غلط ثابت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ قاضی صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ جس بات کو غلط کہتے ہیں اس کو غلط ثابت بھی کرتے ہیں۔

قاضی صاحب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ محقق کو تحقیق کا حق ادا کرنا چاہئے اور کوئی بات بغیر مستند ثبوت کے نہیں کہنی چاہئے۔ قاضی صاحب خود جب کسی موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں تو محقق کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ اور تحقیق کا یہ سلسلہ ان کا جاری رہتا ہے۔ وہ جب کسی کی تحقیق کو ناقص اور نامکمل بتاتے ہیں تو عملی طور پر یہ بھی بتاتے ہیں کہ تحقیق کس طرح کی جاتی ہے اور مکمل معلومات حاصل کرنے کے لئے راست اور بلا واسطہ مآخذ کا استعمال کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک ایک بات کے لئے غیر معمولی محنت کرتے ہیں اور تلاش و جستجو کا حق ادا کرتے ہیں اور جب تک خود مطمئن نہیں ہو جاتے اس وقت تک حتمی طور پر کوئی بات نہیں کہتے۔ صرف ایک بار اُن سے چوک ہوئی۔ اور یہ ان کی عظمت ہے کہ اس کا اعتراف بھی انھوں نے بڑے کھلے دل سے کیا ہے۔ اپنے مضمون 'اصول تحقیق' میں وہ فرماتے ہیں :

"میں نے 'معیار پٹنہ' میں جس کا خود مدیر تھا، ادارۂ معیار کی طرف سے کسی شخص کے اس قول پر اعتراض کیا تھا کہ محمد عابد، دلؔ عظیم آبادی، برادر محمد روشن جوششؔ کے باپ جسونت رائے ناگر تھے۔ اس وقت جو امور میرے پیش نظر تھے وہ یہ تھے کہ تذکرۂ میر حسنؔ میں ولدیت کا مطلقاً ذکر نہیں۔ علی ابراہیم خاں خلیلؔ کی گلزار ابراہیم میں دونوں بھائیوں کے نام سے قبل لفظ شیخ مرقوم ہے اور ولدیت یا دونوں کے نو مسلم ہونے کی طرف اشارہ بھی نہیں۔ خلیلؔ عظیم آبادی تو نہ تھے، لیکن بہاری تھے اور عظیم آباد سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ عشقیؔ عظیم آبادی کے تذکرے میں بھی ولدیت اور تبدیلِ مذہب کے متعلق کچھ مرقوم نہیں اور دونوں بھائیوں یا ان میں سے ایک کے نام سے پہلے لفظ 'شیخ' لکھا ہے۔ لطفؔ نے وہی کہا ہے جو علی ابراہیم خاں خلیلؔ نے کہا ہے۔ یہ بات کہ جوششؔ جسونت رائے ناگر کے بیٹے تھے، اس وقت تک کی معلومات کے مطابق

Marfat.com

مصحفی کے "تذکرۂ ہندی" کے سوا کہیں اور نہ تھی اور مصحفی کی واقفیت کا یہ حال ہے کہ اس نے جوشش کا نام محمد روشن کے بجائے محمد عابد بتایا ہے۔ گلشن سخن، مؤلفہ مبتلا کے اقتباسات ایک ماہنامہ میں نظر سے گزرے اور ان میں یہ عبارت جوشش کے متعلق ملی کہ "احوالِ ایشاں مفصل از بھگونت رائے خلف جسونت رائے کہ فی مابین خصوصیتہاو دوستیہاست، معلوم نمود" تو یہ خیال ہوا کہ مصحفی نے جوشش کا ترجمہ اس تذکرے میں دیکھا ہوگا۔ کچھ زمانے کے بعد لکھنے لگے۔ تو حافظے نے دھوکا دیا اور خود جوشش کو جسونت رائے کا بیٹا بنادیا۔ میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں مصحفی کی شہادت قطعاً ناقابلِ قبول ہے۔ اور نام سے پہلے لفظ شیخ کا ہونا، اور ولدیت اور تبدیل مذہب کا خلیل وغیرہ کے یہاں ذکر نہ ہونا جا طور پر اس کے ماننے سے مانع ہو سکتا ہے کہ دل جسونت، رائے ناگر کا بیٹا تھا۔ لیکن مجھے شورش و ابو الحسن امر اللہ کے تذکروں کی طرف رجوع کیے بغیر قطعی طور پر اس کی تردید نہ کرنی تھی۔ ان دونوں تذکروں سے دونوں بھائیوں کی ولدیت جسونت رائے ہونا ثابت ہے اور لطف یہ ہے کہ خود مبتلا کے تذکرے میں یہ عبارت ہے جو اپنی اہمیت کے باوجود اقتباسات مذکور میں قلم انداز ہوگئی تھی از فرزندان جسونت رائے ناگرست۔ چوں بحد تمیز رسید، بشرف دین احمدی مشرف گشت"۔ کل اہم مآخذ کی طرف رجوع کیے بغیر قطعی طور پر رائے قائم نہ کرنی چاہیے"۔(۱)

قاضی صاحب نے انتہائی فراخ دلی سے اپنی فرو گذاشت کا اعتراف کیا ہے۔ یہ محض اعتراف یا اظہارِ حقیقت نہیں ہے، بلکہ ایک مثال ہے دوسرے محققوں کے لئے اور جب قاضی صاحب دوسرے مصنفین اور محققین کو اس معیار پر پورا اترتے ہوئے نہیں پاتے تو انھیں مایوسی ہوتی ہے اور وہ بے اختیار ان کی گرفت کرنے لگتے ہیں۔ اس مقام پر دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کیا قاضی صاحب کے اعتراضات محض برائے اعتراض ہیں یا ان میں کچھ جان بھی ہے اور وہ برائے اصلاح کئے گئے ہیں۔ اگر ہم ان اعتراضات کا بغور اور جانبدارانہ جائزہ لیں تو ہمیں اس نتیجے پر پہنچنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا۔ کہ ان اعتراضات کے پیچھے اصولِ تحقیق کی پاسداری، معلومات کی وسعت،

(۱) غالب نامہ (قاضی عبدالودود نمبر، ۱۹۸۷) ص ۱۷۸۔۱۷۹

Marfat.com

مطالعہ کی گہرائی، موضوع سے غیر معمولی واقفیت اور نگاہِ دوررس سبھی کی جلوہ گری ہے۔ قاضی صاحب کے اعتراضات کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

۱۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اپنی تالیف 'میر تقی میرؔ' حیات اور شاعری' کے صفحہ ۴۸۵ پر لکھا ہے :

"انھوں (میرؔ) نے زبان کی صفائی کے شوق میں ناسخؔ کی طرح ہندوستانیت سے بالکل قطع تعلق نہیں کیا"۔

قاضی صاحب کو خواجہ صاحب کی یہ بات پسند نہ آئی۔ انھوں نے اس دعوے کی تردید کی اور بہ دلائل ثابت کیا کہ جہاں تک ہندوستانیت کا تعلق ہے میر تقی میرؔ کسی طرح ناسخؔ سے مختلف نہیں۔ ملاحظہ ہو قاضی صاحب فرماتے ہیں :

"یہ اتہام محض ہے کہ ناسخؔ نے خواہ کسی وجہ سے کیوں نہ ہو، ہندوستانیت سے بالکل علاحدگی اختیار کر لی تھی۔ مصنف نے "میرؔ کی شاعری میں ہندوستانی عناصر کے زیرِ عنوان جو مثالیں دی ہیں، ویسی ناسخؔ کے کلیات میں بھی بہت ملتی ہیں۔ ناسخؔ کے یہاں ہندوستانی عناصر ممکن ہے کہ میرؔ کے مقابلے میں کم ہوں مگر یہ کمی بہت نمایاں نہیں ؛ میرؔ و ناسخؔ جہاں تک ہندوستانیت کا تعلق ہے، ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں۔ ذیل میں دواوینِ ناسخؔ کے سرسری مطالعے سے نتائج پیش کیے جاتے ہیں"۔

اس کے بعد انھوں نے ناسخؔ کے کلام سے ۲۹۵ ایسے الفاظ تلاش کر کے منتخب کیے جو خالص ہندوستانی نژاد ہیں۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل اشعار بھی انھوں نے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے ۔

دیکھ لے جوڑا بسنتی وہ جو جسم یار میں
پھولے کیوں سرسوں نہ چشم نرگس بیمار میں

گاو خواری، سود خواری، ایک سی دونوں کی ہے
کچھ تفاوت ان دنوں ہندو مسلماں میں نہیں

خطِ شبرنگ یہ گالوں پہ نہیں دھیان کرو
ہے اجی چاند گہن ، بوسہ کوئی دان کرو

شعار اپنا ہوا ہے مت پرستی ان دنوں زاہد
اثر یہ ہوگیا شاید ہمیں گنگا کے پانی کا

برسات ہے پلا دے گلرنگ ساقیا
ہندوستان میں ہے یہی موسم بہار کا

Marfat.com

ایک جانب گومتی ہے ایک جانب سیل اشک
لکھنؤ بھی میرے رہنے سے دوآبہ ہو گیا

اشنان کشن جی نے کیا ہے جو مدتوں
اب تک اسی اثر سے ہے رنگِ جمن کبود

ہوئے ہیں عکس فگن میرے داغ گنگا میں
کہاں بہاتے ہیں ہندو چراغ گنگا میں

یہ نوچ کھاتے ہیں زندوں کو کانپور کے لوگ
کہ جیسے کھاتے ہیں مردوں کو زاغ گنگا میں

یہ کانپور میں روؤ کہ اے مری آنکھو!
نہ فاصلہ رہے گنگا میں اور جمنا میں

تین تربینی تو دو آنکھیں مری
اب الٰہ آباد بھی پنجاب ہے

رو رہا ہوں کیا الٰہ آباد میں
دائرہ جو ہے یہاں گرداب ہے میں

۲۔ خواجہ احمد فاروقی نے اپنی مذکورہ کتاب کے صفحہ ۱۰۵ پر شاہ مبارک آبرو کے حسب ذیل شعر کو ان کی ایہام گوئی کی مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔

سیج اوپر غیر کی رہتا ہے اب لوٹا ہوا
زر کے لالچ اس قدر وہ سیم تن کھوٹا ہوا

اور اس رائے کا اظہار کیا ہے:

"آبرو نے اسے (ایہام گوئی کو) مستقل فن بنالیا۔ ان کے کلام میں جو ابتذال اور سوقیت ہے وہ اسی وجہ سے ہے"۔

اس پر قاضی صاحب نے گرفت کی اور فرمایا:

"ابتذال بارہویں صدی میں پامال مضمون کے باندھنے کو کہتے تھے۔ مصنف نے ظاہراً رکاکتِ مضمون کے لئے استعمال کیا ہے۔ اور یہ عیب آبرو کے شعر میں موجود ہے۔ مگر شعر کی سوقیت کا ذمہ دار ایہام نہیں، مضمون کی رکاکت ہے جس سے میر کا کلام بھی خالی نہیں"(۱)

اس کے بعد اپنے دعوے کے ثبوت میں انھوں نے میر کے چودہ اشعار نقل کئے۔

۳۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے 'دیوانِ فائز' مرتب کیا۔ اس پر تمہید کے طور پر آپ نے جو مقدمہ تحریر فرمایا ہے وہ انتہائی جانفشانی اور عمیق تلاش و تحقیق کا نتیجہ ہے اور بادی النظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ فائز کے سلسلے میں یہ حرفِ آخر ہے اور اس میں کسی اضافے یا حک و اصلاح کی گنجائش نہیں۔ لیکن قاضی صاحب کی عقابی نظر نے اس میں بھی خامیاں اور

(۱) عیار ستان۔ ص ۹۹

Marfat.com

تسامحات تلاش کر لئے۔

اس پر انھوں نے ایک طویل تبصرہ لکھا جو ان کے مجموعۂ مضامین 'عیار ستان' میں شامل ہے۔ اس میں انھوں نے مسعود صاحب کی بہت سی تحقیقات سے نہ صرف اختلاف کیا اور ان کی اغلاط کی نشاندہی کی، بلکہ آپ کی فراہم کردہ معلومات میں قابلِ قدر اضافے بھی کئے۔ ذیل میں آپ کے اعتراضات کی صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

"مقدمے میں فائز کا سال ولادت و وفات درج نہیں ہے اور یہ کیا گیا ہے کہ کلیات پر نظر ثانی کے وقت (۱۱۴۲ھ) ان کی عمر پینتالیس، پچاس برس کی ہو گی۔ تاریخ محمدی میں ۱۱۵۱ھ کے تحت یہ عبارت موجود ہے "صدر الدین محمد خاں بن زبردست خاں، بن ابراہیم خاں، بن علی مردان خاں...... یکے از امرائے ہند در ماہِ صفر در شاہجہاں آباد فوت شد۔ عمرش "گمان تھا کہ سیتامؤ یا لندن کے نسخے میں 'عمرش' کے بعد کی عبارت ہو گی، مگر مہاراج کمار ڈاکٹر رگھوبیر اور ڈاکٹر عندلیب شادانی نے براہِ کرم علی الترتیب ان نسخوں کے متعلق اطلاع دی کہ ان میں عبارت 'شد' ہی پر ختم ہو جاتی ہے۔ مقدمے میں عمر کا جو اندازہ کیا گیا ہے اس سے اتفاق مشکل ہے۔ ترتیب کے وقت بقولِ فائز شباب کی ابتدا تھی اور اس بناء پر کہ نظر ثانی کا زمانہ ۱۵ / سال بعد ہے۔ یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس وقت ۱۱۲۷ھ تھا۔ یہ ٹھیک ہے لیکن فائز انتخابِ الفاظ میں غیر محتاط نہیں تو 'ابتدائے سن شباب'، سے ۲۵ برس سے زیادہ کی عمر مراد نہیں ہو سکتی۔ اس لحاظ سے سالِ ولادت ۱۱۰۲ھ کے لگ بھگ قرار پاتا ہے"۔ (۱)

(۲) دیوان فائز مرتبہ مسعود حسن رضوی پر تبصرے کے دوران مسعود صاحب کی تحقیقی گرفت کرتے ہوئے ایک اور مقام پر قاضی صاحب فرماتے ہیں:

مقدمے میں ہے کہ رقعات شیخ علی حزیں (نامِ مرتب مقدمۂ دیوان میں نہیں) میں اشرف الدولہ حسن علی خاں پسر فائز کے نام چار خط ہیں۔ ان کے مطالب کے متعلق ص ۱۳۱ میں جو کچھ مرقوم ہے، وہ اس پر مشعر ہے کہ یہ وہی خطوط ہیں جو اشرف علی خاں گستاخ کے مجموعۂ مکاتیب حزیں میں ہیں۔ تین خطوں کی بعض عبارات درج ذیل ہیں:

Marfat.com

"باکمال ...... کوشند ...... خواہش نگارش بہ ...... حکیم الممالک ...... شدہ بود۔ دریں خصوص بتاکید ہاباایشاں وجمع کثیر ازاعزہ مرقوم شدہ" "والدہ مکرمہ ومیر شہاب الدین احمد ہریک شرح نوشتہ اند وخواہش ...... روانہ شدن نمودہ ......" "عزت حاجی محمد جعفر بیگ رفتہ درباب حرکت باایشاں مشورت وبوساطت دوستاں ازپادشاہ رخصت حاصل نمودہ ...... باتفاق اخوند حرکت باید فرمود۔ چوں شادی ہمشیر در پیش است، ہمگی منتظر قدوم می باشند"۔ بعبد المجید خاں ہم پیغام کردہ خواہد شد"۔ والدہ سے والدۂ مکتوب الیہ اور ہمشیرہ سے ان کی بہن مراد ہیں۔ مقدمے میں ہے کہ حزیں کی بہن کی شادی در پیش تھی۔ یہ کسی طرح قابل قبول نہیں۔ مجھے اس سے بھی اتفاق نہیں کہ اس زمانے میں اشرف الدولہ شاہی منصب دار تھے اور ان میں اور حزیں میں قلبی ارتباط تھا۔ میرا قیاس ہے کہ یہ اس زمانے میں کم سن تھے اور تعلیم پارہے تھے۔ بعض اوقات کم عمروں کو بھی شاہی منصب مل جاتا ہے۔ مگر یہ بات بے ثبوت تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ حزیں فائز کے دوست تھے اور اشرف الدولہ و حزیں میں خردانہ و بزرگانہ تعلقات تھے۔"(۱)

قاضی صاحب نے مولانا محمد حسین آزاد کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس سلسلے میں "آزاد بحیثیت محقق" کے عنوان سے تین قسطوں میں ایک طویل مضمون 'نوائے ادب' بمبئی (اپریل، جولائی، اکتوبر ۱۹۵۶ء) میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ آبِ حیات اور طبقات الشعراء (معاصر۔ ح ۴) اور آبِ حیات کے دو مآخذ (معاصر۔ ح ۱) بھی اس سلسلے کی دو اہم کڑیاں ہیں۔ ان سب میں انھوں نے محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور مؤلف کے تسامحات کی نشاندہی کی ہے۔ اس میں بھی حسبِ معمول انھوں نے اپنی تحقیقی بصیرت اور مطالعہ کی وسعت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ان مضامین کے بالاستیعاب اور بغور مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ آزاد کے پاس تحقیقی شعور تھا نہ تنقیدی بصیرت۔ اس کے باوجود وہ 'آبِ حیات' کی اہمیت اور افادیت کے قائل نظر آتے ہیں۔ قاضی صاحب کے اعتراضات کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) آزاد نے 'آبِ حیات' کے صفحہ ۲۱۹ پر میر تقی میر کی تنک مزاجی کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے۔ قاضی صاحب نے اس پورے واقعے پر شبہ کا اظہار کیا اور بدلائل اس کو غلط ثابت کیا۔ اپنی

(۱) عیارستان۔ ص ۲۔ ۳

Marfat.com

بات کو واضح کرنے کے لئے قاضی صاحب نے پہلے آزاد کے بیان کئے ہوئے واقعہ کا خلاص پیش کیا اور اس کے بعد اس کو غلط ثابت کرنے کے لئے اپنے دلائل پیش کئے۔ پہلے خلاصہ ملاحظہ ہوں :

"لکھنؤ کے چند عمائد اور اراکین "ایک دن میر سے ملنے آئے" دروازے پر آواز دی۔ لونڈی یا ماما نکلی۔ حال پوچھ کر اندر گئی۔ ایک بوریا لا کر ڈیوڑھی میں بچھایا، انھیں بٹھایا اور ایک پرانا سا حقہ تازہ کر کے سامنے رکھ گئی۔ میر...... اندر سے تشریف لائے۔ مزاج پرسی وغیرہ کے بعد انھوں نے فرمائش اشعار کی...... میر نے اول کچھ ٹالا، پھر صاف جواب دیا کہ ...... میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے۔ اگرچہ ناگوار ہوا مگر بہ نظر آداب و اخلاق انھوں نے نارسائی طبع کا اقرار کیا اور پھر درخواست کی۔ انھوں نے پھر انکار کیا۔ آخر ان لوگوں نے گراں خاطر ہو کر کہا کہ ...... انوری و خاقانی کا کلام سمجھتے ہیں آپ کا ارشاد کیوں نہ سمجھیں گے ؟ میر...... نے کہا یہ درست ہے مگر ان کی شرحیں، مصطلحات اور فرہنگیں موجود ہیں اور میرے کلام کے لئے فقط محاورہ اہل اردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں اور اس سے آپ محروم۔ یہ کہہ کر شعر پڑھا :

عشق بُرے ہی خیال پڑا ہے چین گیا، آرام گیا
دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

اور کہا آپ بموجب اپنی کتابوں کے کہیں گے کہ خیال کی 'ی' ظاہر کرو، پھر کہیں گے کہ 'ی' تقطیع میں گرتی ہے۔ مگر...... یہاں اس کے سوا جواب نہیں کہ محاورہ یہی ہے"۔

اس پر قاضی صاحب نے ان الفاظ میں تنقید کی :

اس سلسلے میں امورِ ذیل توجہ طلب ہیں :

(الف) حیات کی کوئی سند موجود نہیں۔ تفصیلات کا انبوہ بجائے خود اسے مشتبہ بناتا ہے۔

(ب) میر اتنے کج خلق اور مصلحت نااندیش نہ تھے جتنے اس حکایت سے ظاہر ہوتے ہیں۔

(ج) میر کے عہد کا لکھنؤ اہل دہلی اور ان کے اخلاف سے مملو تھا۔ وہاں کے خواص یقیناً دہلی کے محاورات سے بے خبر نہ تھے اور اس عہد میں دونوں مقاموں کی زبان میں اتنا فرق بھی نہ تھا جتنا بعد کو ہوا۔

(د) میر کے کلام میں محاورات و مصطلحات ملتے ہیں لیکن ان کی عظمت کا مدار ان کے

Marfat.com

استعمال پر نہیں۔

(ہ) میرؔ کے کلام کا بہت بڑا حصہ اب بھی معمولی اردو جاننے والے سمجھ سکتے ہیں۔ میرؔ کو ہرگز اس کے متعلق یہ غلط فہمی نہیں ہو سکتی تھی کہ اہلِ دہلی کے سوا کوئی اور اسے سمجھ ہی نہیں سکتا۔

(و) خیال کی 'ی' کا گرنا یا نہ گرنا زبان نہیں، عروض کا سوال ہے۔

(ز) عشق برے ہی الخ جس وزن میں ہے وہ ہند کا ایجاد ہے۔ فارسی عروض کی کتابوں میں یہ نہیں ملے گا اور اس وزن کے شعر فارسی میں نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے زحافات بھی وہی ہوں گے جنھیں اہلِ ہند روا رکھتے ہیں۔

(ح) میرؔ کا کلام جن لوگوں نے بالاستیعاب دیکھا ہے وہ کبھی اسے تسلیم نہیں کر سکتے کہ میرؔ اپنی زبان کو جامع کی سیڑھیوں کی زبان سمجھتے تھے۔ وہ تو اس کے بھی روادار نہیں کہ "اجلاف شعر کہیں"۔

(ط) میرؔ کے زمانے میں لفظ خیال بروزن 'فال' زبانوں پر تھا، اس کا ثبوت موجود نہیں۔ نظم میں اس طرح بہت کم آیا ہے اور عموماً بوزن 'نہال' موزوں ہوا ہے۔ میرؔ کے کلیات میں بروزن "بال" "صرف دو جگہ آیا ہے اور بروزن 'نہال' کم از کم ۲۶ جگہ"۔

اس کے بعد انھوں نے دیوان اور صفحہ نمبر کے حوالوں کے ساتھ ان تمام اشعار کے مصرعہائے اولیٰ بھی دیدیے ہیں۔ ان سے ان کے مطالعے کی وسعت کے ساتھ ان کے طریق کار کا بھی پتہ چلتا ہے۔

قاضی صاحب کی تحقیق اور تنقید کا ایک اور نادر نمونہ ملاحظہ ہو۔ محمد حسین آزاد نے 'آبِ حیات' میں راسخؔ عظیم آبادی کے سوداؔ کی خدمت میں بغرضِ تلمذ حاضر ہونے کا واقعہ اس انداز سے لکھا ہے کہ:

راسخؔ عظیم آبادی کا دیوان میں نے دیکھا ہے۔ پرانے مشاق تھے۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ کے پاس شاگرد ہونے کو آئے۔ مرزا نے کہا کوئی شعر سنایئے۔ راسخؔ نے یہ شعر پڑھ کر سنایا۔

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے
پلک پر اپنی آنسو صبحِ پیری کا ستارا ہے

سوداؔ نے اٹھ کر گلے لگا لیا۔ (آبِ حیات ص ۱۷۰)

Marfat.com

اس پر قاضی صاحب نے ان الفاظ میں تنقید کی :

(الف) نوائے وطن، مصنفہ شاد عظیم آبادی میں راسخ کا سال ولادت ۱۱۶۲ھ مرقوم ہے۔ لیکن اس کی سند مصنف کے پاس نہیں۔ عبرتی عظیم آبادی جو ماۃ سیزدہم کے عشرۂ دوم کے اواخر میں پیدا ہوئے تھے اور جنھوں نے راسخ کا زمانہ پایا ہے۔ ان کی عمر ۶۰ سال اور سالِ وفات ۱۲۳۶ھ بتاتے ہیں (ریاض الافکار)۔ عبرتی سے سال وفات میں میں غلطی ہوئی ہے۔ صحیح ۱۲۳۸ ہے۔ مصنفِ تذکرۂ مسرت افزا ۱۱۹۳ھ میں پٹنہ آیا تھا۔ اور دورانِ تصنیف تذکرہ میں اس کے بعد بھی یہاں پہنچا تھا۔ (سال اختتام ۱۱۹۵ھ) وہ لکھتا ہے کہ فدوی کا یہ نوجوان شاگرد پٹنہ میں مجھ سے اکثر ملتا رہتا تھا۔ رائے یہ ہے کہ "غنیمت است و چیزے شدنی معلوم می شود" کل متعلق امور پر غور کرنے کے بعد میرا قیاس ہے کہ راسخ ۱۱۷۱ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔

(ب) م میں خود راسخ کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان ہے۔ اس کے ایک شعر سے جو دیوان کے کسی اور نسخے میں نہیں ہے۔ تلمذِ فدوی ثابت ہے :

شاگرد ہیں گے حضرتِ فدوی کے بے شمار راسخ ہوں ایک میں بھی و لے کس شمار میں

تذکرۂ عشقی عظیم آبادی ہم عصر راسخ (نسخۂ راقم میں) شاگردی فدوی کے ذکر کے بعد یہ عبارت ملتی ہے : وقتیکہ شناسائے پایۂ سخن گردید، طریقۂ پیروی کلام میر پیش نہادِ ہمت ساخت۔ آخر بہ یمن رسوخیکہ مکنونِ خاطر ارادت، مآثر داشت بہ باریابی صحبتِ میر ...... فائز شدۂ حلقۂ انقیادِ شاگردی بگوشِ جاں انداخت" قطعی طور پر تو نہیں کہا جا سکتا لیکن قرینہ یہ ہے کہ عشقی نے ۱۲۱۵ھ کے لگ بھگ ان کا ترجمہ حوالۂ قلم کیا ہے۔ دیوان راسخ مکتوبۂ مصنف میں ایک شعر اس زمانے کا ہے جب انھیں میر سے عقیدت تو تھی، لیکن ان کی زیارت نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس کا مصرع آخر یہ ہے : اوسیہ عقیدت ہے جنابِ میر سے مجھ کو، (یہ شعر دیوان کے اور نسخوں میں نہیں ہے) دیوان کے کل نسخوں میں ایسے متعدد اشعار ملتے ہیں جن میں صریحاً تلمذ میر کا اقرار کیا ہے۔ ان میں سے یہ دو شعر دیوان مطبوعہ سے نقل کیے جاتے ہیں :

راسخ کو ہے میر سے تلمذ
یہ فیض ہے ان کی تربیت کا

Marfat.com

شاگرد ہیں ہم میرؔ سے استاد کے راسخؔ

استادوں کا استاد ہے ، استاد ہمارا

(ج) سوداؔ نے اواسطِ ۱۱۹۵ھ میں رحلت کی اور میرؔ ۱۱۹۶ھ کے ربیع اوّل میں دہلی سے لکھنؤ پہنچے ہیں۔

(د) آزاد کی بیان کردہ حکایت بے سند ہے، دیوان راسخؔ مطبوعہ میں سوداؔ کا کہیں نام تک نہیں آیا۔ نسخۂ مکتوبہ راسخؔ میں شعر ذیل البتہ ملتا ہے:

راسخؔ ہے اپنی طبع کو سوداؔ سے احتراز

شاگرد میرؔ ہوں مجھے سوداؔ سے کیا غرض

(ہ) راسخ کا شعر دیوان مطبوعہ ص ۳۹ اور متعدد خطی نسخوں میں اس طرح سے ہے کہ: 'پر یم' 'ہم ضعیف' کی جگہ آیا ہے۔ خدا جانے اس کی وہ شکل جو آبِ حیات میں ہے آزاد کو کہاں ملی۔

(و) ہوئے ہیں پیر الخ نسخۂ مکتوبہ مصنف سے غیر حاضر ہے۔ اس میں ۱۲۱۷ھ یا اس کے کچھ بعد تک کا کلام ہے، کچھ تعجب نہیں اگر یہ واقعہ زمانۂ پیری کا لکھا ہوا ہے

(ز) "حکایت اختراعی ہے"۔

یوں تو اس قسم کی لا تعداد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن غیر ضروری طوالت کی خاطر ان سے احتراز کیا جاتا ہے۔ البتہ جو مثالیں پیش کی گئی ہیں ان سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ قاضی صاحب نے ہر مرحلے پر تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ اور اپنے پیش کردہ اس اصول کی بھرپور پاسداری کی ہے کہ محقق کو تحقیق کا حق ادا کرنا چاہیے۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ قاضی صاحب پر نکتہ چینی اور عیب جوئی کے الزامات بھی لگائے جاتے رہے ہیں۔ ان کے بارے میں ایک عام رائے یہ ہے کہ انھیں دوسروں کی غلطیاں پکڑنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے کوئی مستقل کام نہیں کیا۔ صرف دوسروں کی کتابوں پر تبصرے لکھتے رہے اور تحقیقی غلطیاں پکڑتے رہے۔ اور معمولی سی فروگذاشت کو عظیم غلطی بنا کر پیش کرتے رہے۔ اس طرح ان کی سخت گیری کی شکایت ہر

Marfat.com

خاص و عام کو ہے۔ لیکن اگر ہم غیر جانبدارانہ انداز سے دیکھیں تو محسوس ہو گا کہ قاضی صاحب نے جو کچھ سپردِ قلم کیا ہے، وہ ایک عظیم علمی خزانے سے کم نہیں ہے اور یہ اردو تحقیق اور اردو ادب کے مطالعے کے لئے نعمتِ عظمیٰ ہے۔ انھوں نے تحقیق کے خارزار میں انتہائی احتیاط سے اور غور و فکر کے بعد قدم رکھنے کا مشورہ دیا اور خود اس پر عمل کر کے بھی دکھایا۔ انھوں نے ہر اہل قلم کو زیادہ محتاط رہنے کا مشورہ دیا اور علمی دیانتداری کی ضرورت کا احساس دلایا۔ اور غیر محتاط بیانات، بے بنیاد دعووں اور غیر سائنسی طرزِ استدلال سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

جو حضرات قاضی صاحب کی تنقید کو تنقیص اور منفی تنقید کے زمرے میں رکھتے ہیں، وہ دراصل ایسے حضرات ہیں جو قاضی صاحب کی تنقید کی تاب نہیں لا سکتے۔ عام طور پر ہمارے مصنفین اور محققین سہل نگاری اور غیر محتاط طرز نگارش اور طریق تحقیق کے عادی ہو چکے تھے۔ اور اس روش کے بدلنے کو تیار بھی نہیں تھے۔ قاضی صاحب نے لوگوں کو اس روش کے خلاف متنبہ کیا۔ اور بتایا کہ تحقیق کا کام اتنا آسان نہیں۔ یہ بڑی ریاضت، محنت اور لگن کا کام ہے اور اسے انتہائی سائنٹیفک طریقہ پر کرنا چاہئے۔ انھوں نے اپنی تنقید کے بارے میں یہ بھی باور کرایا کہ دیکھنا یہ چاہئے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ تحقیق کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے یا نہیں، وہ تحقیق کے نقطۂ نظر سے قابلِ قبول ہے یا نہیں اور یہ سوچنا فضول ہے کہ اس کے پیچھے نیک نیتی کار فرما ہے، یا بد نیتی۔ کسی کی تحقیق یا تنقید کو پرکھنے کے لئے نیت کو بنیاد نہ بنانا چاہیے، نہ اسے بیچ میں لانا چاہیے۔ یہ ان لوگوں کا کام ہے جو سہل انگاری، کم علمی اور غلط بیانی کی ہر حال میں پردہ پوشی کر کے ادب کے نام پر بے ادبی کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔

یہ نظریۂ خیال بھی درست نہیں کہ قاضی صاحب ہمیشہ تنقید ہی کرتے ہیں، کسی کی تعریف کے لئے ان کا قلم کبھی نہیں چلتا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ بے جا تعریف و توصیف کے قائل نہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ کبھی کسی کی تعریف ہی نہ کرتے ہوں۔ مثال کے طور پر فائز دہلوی اور اس کا دیوان، مرتبہ سید مسعود حسن رضوی پر قاضی صاحب کے تبصرے کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ابتدا ہی تعریف سے ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"جناب سید مسعود حسن رضوی نے فائز کا دیوان پیش نامہ و مقدمہ و فرہنگ کے ساتھ

Marfat.com

حسبِ ذیل نام سے پیش کیا ہے :"شمالی ہند میں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر۔ نواب صدر الدین محمد خاں، فائز دہلوی اور اس کا دیوان" یہ بات بے خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ اس قسم کی دوسری کتابیں جو انجمن ترقی اردو نے شائع کی ہیں، ان میں بہت کم ایسی ہیں، جن کے مرتبین نے اتنی تلاش و تحقیق سے کام لیا ہے۔ ان کا ہر دعویٰ قابلِ قبول نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے بعض بیانات پر اضافہ کیا جا سکے۔ مگر کتاب کی ترتیب میں جو جانفشانی انھوں نے کی ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے"۔(۱)

دراصل قاضی صاحب بے جا تعریف کے قائل نہیں۔ وہ اسی بات کو پسند کرتے ہیں جو واقعتاً قابل پسند ہوتی ہے۔ وہ اس بات کی کبھی ستائش نہیں کرتے جو ان کے معیار پر پوری نہیں اترتی، چاہے وہ بات کتنی ہی عظیم شخصیت یا کتنے ہی قریبی عزیز کی کیوں نہ ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ قاضی صاحب کا معیار اتنا بلند تھا کہ کم تر درجہ کی کوئی چیز انھیں پسند نہیں آسکتی تھی۔

پھر قاضی صاحب کی تنقید میں اور دوسرے حضرات کی تنقید میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اور وہ یہ کہ قاضی صاحب محض تنقید ہی نہیں کرتے بلکہ ان غلطیوں کی اصلاح بھی کرتے ہیں اور یہ عملی طور پر بتاتے ہیں کہ بات کس طرح کہنی چاہئے اور تحقیق کا حق کس طرح ادا کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ معلومات کا جو خزانہ وہ پیش کرتے ہیں اس کی قدر و منزلت کا صرف اہل علم ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔

جناب رشید حسن خاں نے قاضی صاحب کے تحقیقی اور تنقیدی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے درست ہی لکھا ہے :-

"اسی طرح یار لوگوں نے مثبت اور منفی یا تعمیری و تخریبی کی اصطلاحیں بھی استعمال کرنا شروع کی تھیں۔ اعتراضات کو یہ کہہ کر مسترد کرنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ یہ تو تخریبی انداز ہے یا یہ کہ یہ تو منفی اندازِ نظر ہے"۔

مقصد اس سے بھی وہی ہوتا ہے کہ سہل انگاری، کم علمی اور غلط نگاری کی پردہ پوشی کی جائے اور اس اندازِ احتساب کو کم رتبہ قرار دیا جائے۔ اس کو یوں بھی کہا جاتا تھا کہ دیکھیے فلاں صاحب کس قدر شریف آدمی ہیں، بس اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ نہ کسی پر اعتراض کرتے ہیں

(۱) معیارستان۔ ص۔۱

Marfat.com

اور نہ کسی کے عیب نکالتے ہیں۔ یہ ہے تعمیری انداز۔ یہ بے حد خطرناک تعلیم تھی اگر اس اندازِ فکر کو پھلنے پھولنے کا موقع مل جاتا تو تحقیق تباہ ہو جاتی اور کم علمانہ خفیف الحرکاتی کو منزلت حاصل ہو جاتی۔ ہمارے بعض شرفائے ادب نے بالواسطہ اس انداز کی اس طرح ہمت افزائی کی کہ مفصل تبصرہ نگاری سے امکان بھر احتراز کیا۔ یہ خاموش تائید تھی اور بہت خطرناک۔ بعض حضرات جو مزاجاً سچے دنیادار ہیں اور بوالہوسی جن کا پیشہ ہے اور دنیاوی کاروبار کی طرح، تحقیق کو بھی من جملۂ ذرائع حصول شہرت ودولت سمجھتے ہیں، وہ خاص طور پر اس جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کیا کرتے ہیں اور زبانی گفتگو میں اس کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ قاضی صاحب نے اس زمانے میں احتساب کی اس روایت کی حرمت کو باقی رکھا اور زبانی گفتگو میں عملی طور پر اپنے مفصل اور نہایت درجہ عالمانہ تبصروں کے ذریعہ، اس انداز کو فروغ دیا اور تعمیری و غیر تعمیری کی ان غیر علمی اصطلاحوں کی حقیقت کو بے نقاب کیا۔ قاضی صاحب جیسی دیو قامت شخصیت نہ ہوتی تو اس زمانے میں احتساب کی روایت شاید ختم ہو کر رہ جاتی۔ اور اس طرح تحقیق کو بے طرح نقصان پہنچتا۔ قاضی صاحب نے اپنے طرزِ عمل سے اس بات کو اصول کا درجہ بخش دیا کہ تحقیق اور ذاتی تعلقات میں کچھ نسبت نہیں۔ اگر کوئی شخص احتساب کی بنا پر برا مانتا ہے تو وہ تحقیق سے واقف نہیں اور جو شخص خیال خاطر احباب کا لحاظ رکھتا ہے اس کے مزاج کو تحقیق کے مزاج سے مناسبت نہیں۔ ایسا شخص شاعر ہو سکتا ہے، پالیٹیشین ہو سکتا ہے، اسمگلر بھی ہو سکتا ہے، محقق نہیں ہو سکتا۔ خوش اخلاقی کے اس انفعالی تصور میں اور تحقیق کی صداقت آئی میں کچھ رابطہ نہیں"۔ (۱)

قاضی صاحب کا یہ کارنامہ کچھ اہم نہیں ہے کہ انھوں نے بہت سے نئے مآخذ کا پتا لگایا اور ان کی افادیت، اہمیت اور ان کے مشتملات سے علمی دنیا کو روشناس کرایا۔ اب یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ شاید ہی کوئی مآخذ ہو جو ان کی عقابی نظر سے بچ رہا ہو۔ وہ ایک ایک غلطی کی اصلاح کرنے کے لئے تذکروں اور دیگر متعلقہ کتب کے بے شمار حوالے دیتے چلتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے نقطۂ نظر کو واضح سے واضح ترین کرتے چلتے ہیں اور دوسری جانب وہ قاری کو نئے نئے مآخذ سے روشناس کراتے چلتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر گیان چند:

(۱) معاصر۔ (قاضی عبدالودود ۔ ۱۹۷۶ء) ص ۱۲۵۔۱۲۶

Marfat.com

"وہ تلاشِ مواد میں ادبی مآخذ کے علاوہ غیر ادبی مآخذ کو بھی کھنگالتے ہیں اور کہاں کہاں سے اپنے کام کی بات معلوم کر کے لاتے ہیں۔ مثلاً ولی کے مصرع:

حسن کی دلی کا صوبہ ہے محمد یار خاں

کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ۴۴ھ عالمگیری میں واقعی دہلی کا صوبہ دار محمد یار خاں تھا۔ فائز دہلوی کا نام تذکرۃ السلاطین چغتا سے اور فائز کے والد کا نام نیز فائز کی تاریخ وفات تاریخ محمدی سے معلوم کی۔ یہ سب قاضی صاحب ہی کر سکتے تھے"۔(۱)

لیکن آگے چل کر وہ اسی بات پر معترض ہوتے ہیں کہ:

"ثبوت فراہم کرنے میں وہ جس غیر معتدل محنت کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ بعض اوقات غیر ضروری حد تک پہنچ جاتا ہے۔ مثلاً ناسخ کی ہندوستانیت ثابت کرنے کے لئے دونوں دیوانوں کو اچھی طرح چھان لینا یا طپاں کی ناقص زبان کے ثبوت کے لئے ۴۶ مثالیں دینا۔ غالب کا خیال تھا کہ کافِ تصغیر زائد کا استعمال مناسب نہیں۔ قاضی صاحب نے غالب بحیثیت محقق میں ایرانیوں کے یہاں سے کئی سو اسناد پیش کر دیں۔ غالب کا یہ بھی خیال تھا کہ جس لفظ کے آخر میں جمع کا عربی لاحقہ ات ہو وہ لفظ لازماً عربی ہے۔ قاضی صاحب نے اس کی تردید میں کم از کم سو مثالیں پیش کر دیں۔

ان تمام صورتوں میں چند مثالیں اور اسناد کافی تھیں۔ غیر متوازن محنت اپنے وقت اور صلاحیتوں کا غلط استعمال ہے"۔(۲)

اس تنقید سے پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر گیان چند نہ قاضی صاحب کے مزاج سے واقف ہیں، نہ ان کے طریقہ کار سے کما حقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ قاضی صاحب کا مزاج دراصل یہ ہے کہ وہ معمولی سی معمولی بات کے لئے زیادہ سے زیادہ دلائل اور شواہد پیش کرتے ہیں اور وہ سب کچھ فراہم کر دیتے ہیں جو اس موضوع سے متعلق دستیاب ہوتا ہے۔ اس سے ایک طرف تو بات زیادہ واضح اور امثال سے لبریز ہو جاتی ہے، اور دوسری جانب قاری اس سے متعلق تمام مآخذ اور تمام ممکنہ ابعاد سے آگاہ ہو جاتا ہے اور اسے مزید مآخذ کو تلاش کرنے کی ضرورت باقی

---

(۱) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۹۳

(۲) معاصر (قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء) ص ۹۴۔۹۵

Marfat.com

نہیں رہتی۔

قاضی صاحب ایک ایک بات کی چھان بین اور تلاش و تحقیق کتنی ژرف نگاہی اور باریک بینی سے کرتے ہیں اس کی سیکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہاں بطور نمونہ صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے :

مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات '(مطبوعہ ۱۹۱۷ء) کے صفحہ ۳۶۹ پر خواجہ حیدر علی آتش کا ایک مطلع اس انداز سے نقل کیا ہے ۔

سرمہ منظورِ نظر ٹھہرا ہے چشم یار میں
نیلگوں گنڈا پنھایا مردمِ بیمار میں

اس کے بعد حسب ذیل الفاظ میں اس پر تنقید کی :

"آزاد کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بیمار میں گنڈا کیوں کر پہناتے ہیں، بیمار کو پہنایا کرتے ہیں۔ اور اس سے زیادہ تعجب شیخ صاحب کے مطلع کا ہے۔ فرماتے ہیں ۔

یوں نزاکت سے گراں ہے سُرمہ چشم یار میں
جس طرح ہو رات بھاری مردم بیمار میں

بعد کے ناقدین نے محمد حسین آزاد کی بات کو صحیح مان لیا اور اصل صورت حال جاننے کی کوشش نہیں کی۔ قاضی صاحب نے اس طرف بھی توجہ کی اور دونوں بزرگ شاعروں کے دیوانوں کو کھنگال ڈالا اور ان کے مستند ایڈیشنوں کے حوالے سے ثابت کیا کہ ان دونوں شاعروں نے 'میں' نہیں کو ہی نظم کیا ہے۔ ان دونوں مطلعوں کی صحیح قرأت اس طرح ہے ۔

آتش:

سرمہ منظورِ نظر ٹھہرا جو ہے چشم یار کو
نیلگوں گنڈا پنھایا مردمِ بیمار کو

ناسخ:

یوں نزاکت سے گراں ہے سرمہ چشم یار کو
جس طرح ہو رات بھاری مردمِ بیمار کو

Marfat.com

اس طرح قاضی صاحب نے جہاں محمد حسین آزاد کے افترا کی قلعی کھولی وہیں ان اشعار کا صحیح متن پیش کر کے بہت بڑی ادبی اور لسانی خدمت انجام دی۔

قاضی صاحب مشورہ دیتے ہیں کہ "محقق کو خطاب سے احتراز واجب ہے۔ اور استعارہ و تشبیہ کا استعمال صرف توضیح کے لئے کرنا چاہیے"۔ قاضی صاحب عبارت آرائی کے سخت مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک عبارت میں رنگینی پیدا کرنے اور تزئین کاری سے تحقیق کی روح مجروح ہوتی ہے۔ اسی لئے خود قاضی صاحب کی تحریروں میں نہ سابقہ ہوتا ہے، نہ لاحقہ۔ ان کی ہر تحریر ہر قسم کے حسن سے عاری ہوتی ہے۔ وہ تمہید کے طور پر بھی عبارت آرائی کے قائل نہیں۔ وہ براہِ راست حرف مطلب پر آجاتے ہیں اور جب بات ختم ہو جاتی ہے تو بغیر اختتامی کلمات کے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح ان کی تحریروں سے تحقیق کو جو طاقتور عناصر ملے ہیں ان کی بدولت ظاہری حسن اور تزئین کاری جنسِ کاسد کی طرح چلن سے باہر ہو گئی۔ اس میں سب سے زیادہ اہم وہ مخصوص اسلوب ہے جو معنویت سے معمور اور مقصدیت سے بھرپور لیکن ہر طرح کی رنگینی سے محفوظ ہے جس میں بڑی حد تک کھردرے پن کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے سکھایا کہ کم سے کم اور صرف بقدر ضرورت الفاظ کا استعمال کرنا چاہئے اور بلا ضرورت الفاظ کی تراش خراش یا صفائی کی تحقیق میں قطعاً گنجائش نہیں۔ قاضی صاحب کی تحریریں اس اسلوب نگارش کا بہترین نمونہ ہیں۔ وہ اس طرز کے خود ہی موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن:

"قاضی صاحب اندازِ بیان کی وضاحت، صراحت، ربط اور سادگی کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک نثر کا حسن شفاف پن میں ہے۔ اگر اس میں شاعرانہ آراستگی کو دخل دیا جائے اور خیالی طوطا مینا بنائے جائیں تو یہ نثر کے آئین و آداب کے خلاف ورزی ہے۔ اسی لئے وہ محمد حسین آزاد کے نثری اسلوب کے قائل ہیں، نہ ابوالکلام آزاد کے اسلوب کے۔ قاضی صاحب کے نزدیک نثر کا حسن سادگی اور وضاحت میں مضمر ہے جس قدر صفائی، صراحت اور مدلل طریقے پر نثر اپنے مضمون کو ادا کر سکے گی اسی قدر اچھی اور معیاری نثر کہلانے کی مستحق ہو گی۔ اس کے لئے لفظ اور معنی کی قطعیت اور استدلال کے منطقی ربط پر وہ برابر زور دیتے ہیں۔ وہ تمام نثری تحریریں

Marfat.com

جن میں شعروں کے ٹکڑے کھپائے گئے ہوں اور ان کی مدد سے ایک طلسمی شاعرانہ فضا پیدا کر کے ابہام کا سہارا لیا گیا ہو، قاضی صاحب کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں۔ لفظوں کے استعمال سے قبل ان کے مفہوم کے تعین اور ان کی جامع ومانع تعریف کی صراحت ان کے نزدیک ضروری ہے۔ لفظ پارے کی طرح بے قرار ہوتے ہیں اور سیاق و سباق کی ذرا سی تبدیلی سے یا برتنے والے کی ذرا سی غفلت سے یا ذہنی کاہلی اور تساہلی کے بدولت مختلف معنی دینے لگتے ہیں۔ اس کا تدارک یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو لفظ کو معنی کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ قطعیت سے برتا جائے۔ اردو نثر ابھی تک سن بلوغ کو نہیں پہنچی ہے جس قطعیت، منطقی استدلال، صراحت اور واقعیت کا مطالبہ قاضی صاحب اردو نثر سے کرتے ہیں۔ اس کے لئے اردو نثر کو صنعتی انقلاب اور سائنسی تہذیب کی منزلوں سے گزرنا ضروری ہے جس کے بغیر سائنسی مزاج اور منطقی کردار نصیب ہونا مشکل ہے۔ اتنا ضرور ہوا کہ آج تک اردو تنقید جس باغ و بہار، نیم شاعرانہ اسلوب سے آزاد نہیں ہو سکی۔ قاضی عبدالودود کے زیر اثر اردو تحقیق اس آرائشی پیرایۂ اظہار سے آزاد ہو گئی"۔(۱)

اس پس منظر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کی تحریروں کے چند نمونے پیش کر دیئے جائیں:

(۱) فرہنگ آصفیہ مطبوعہ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی پر انھوں نے طویل تبصرہ کیا۔ جو بعد میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے ۱۹۸۴ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس میں تمہیدی کلمات بالکل نہیں ہیں، نہ یہ بتایا گیا کہ فرہنگ کے مؤلف کون ہیں، کہاں سے شائع ہوئی، کتنی جلدوں میں ہے اور دیگر خصوصیات کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے چند باتیں تبصرے کے اندر سے از خود نکلتی ہیں بشرطیکہ از اول تا آخر اس کو بالاستیعاب پڑھا جائے۔ اس کا ابتدائی حصہ ملاحظہ ہو:

فرہنگ آصفیہ (=آصفہ) جلد ۳ کے آغاز میں ترقی اردو بورڈ کی طرف سے اطلاع دی گئی ہے کہ آصفہ کی کمیابی "افادیت اور اہمیت کے پیش نظر فیصلہ ہوا کہ اسے فوراً آفسیٹ کے ذریعہ" شائع کیا جائے۔ غلط نامہ جو ہر جلد کے آخر میں ہے، حذف ہو، اور اس کے مطابق متن درست کیا جائے۔ بورڈ نے جن ۴ جلدوں کا عکس شائع کیا ہے، ان کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ:

---

(۱) معاصر۔ (قاضی عبدالودود نمبر۔ ۷۶-۱۹۷۷ء) ص ۵۲۔ ۵۳

Marfat.com

"جلد سوم ۱۸۹۸ء میں، جلد چہارم ۱۹۰۱ء میں اور جلد دوم ۱۹۰۸ء میں صرف ایک ایک بار چھپی، جلد اوّل ۱۹۱۸ء میں کچھ اضافوں کے ساتھ دوبارہ بھی چھپی تھی"۔

اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ جلد اوّل پہلی بار کب چھپی تھی۔ جلد ۱: دیباچہ اور رموز ۱۷ صفحات (= ص)، لغات الف تا ت ص ۲۷ تا ص ۶۵۶ (ص = صفحہ)۔ جلد ۲ = لغات ٹ تا ژ ۴۲۲ ص، جلد ۳: لغات س تا ک ۶۶۴ ص۔ جلد ۴: لغات گ تا ی ۷۹۳ ص، خاتمہ وغیرہ ص"۔

اور اب اس تبصرہ کا اختتامی حصہ ملاحظہ ہو:

"۳۴ بریدہ "حلق بریدہ" ص ۱۸۵ ۳۵ بے اختیار ص ۱۸۷ ۳۶ باز پسیں "دم باز پسیں" ص ۱۹۳ ۳۷ چشم آصفہ میں صرف مؤنث، سودا کے یہاں مذکر بھی "یہ چشم چھوٹی چھوٹی تالاب بھر رہیں گے" ص ۲۲۴ ۳۸ تفاوت کرنا کسی کو کسی سے "چمن میں جب نہ کر سکے تفاوت گل کو ڈالی سے ص ۲۲۴ ۳۹ تعلیم بر ص ۲۲۵ ۴۰ خانہ بر انداز ص ۲۴۸ ۴۱ ادھر ۲۳۱ + ۲۴۲ ۴۲ افلاکی ۲۴۴"۔

اسی طرح "آزاد بحیثیت محقق" کے ابتدائی کلمات ملاحظہ ہوں:

" خالق باری کو امیر خسرو سے منسوب کیا ہے اور بی چمو (ساقن) کی زبان سے کیا ہے: بھٹیاری کے لڑکے کے لئے خالق باری لکھ دی، ذرا لونڈے کے نام پر بھی کچھ لکھ دوگے تو کیا ہوگا؟" الف ص ۷۶ خالق باری، جیسا کہ شیرانی کی تحقیقات نے قطعی طور پر ثابت کردیا ہے، امیر خسرو سے کچھ تعلق نہیں رکھتی۔ آزاد کے زمانے میں یہ بات کہ امیر و خسرو اس کے مصنف ہیں، شہرت عام رکھتی تھی، اس لئے آزاد اسے باور کرنے کے لئے زیادہ قابلِ الزام نہیں۔ لیکن بھٹیاری والی حکایت خود ان کی بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہے" اور اسی مضمون کے آخری کلمات ملاحظہ ہوں:

"اب اشاعت ا میں نشاط کا قطعہ نہیں۔ ص ۲۸۱ کے حاشیے میں سطور ہے کہ معلم دتاسی ایک تذکرہ نویس فرانس کے ہیں۔ ان کی تصنیف سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۴۷ھ میں فوت ہوئے۔ دتاسی کی تاریخ ادبیات جلد ۲ ص ۳۸ میں یہ ہے کہ انشا کی وفات شورش ۱۸۵۷ء سے پیشتر

Marfat.com

ہوئی۔(۱۶۴)دساتیر پر میرا مضمون جلد شائع ہوگا۔ خود دساتیر کے مطابق آبادیوں کی سلطنت کب تک رہے گی۔اس کا صحیح حال اس سے معلوم ہوگا۔اس کے مطابق جو زمانہ سفرنگ میں ہے، وہ کم ہے۔(۱۷۰) مرتب فرہنگ اسدی طبع ایران نے کتاب کے کل نسخوں کے (جو انھیں ملے) مندرجات کہیں کہیں درج کرنے کا التزام کیا ہے۔ لیکن "آمد آں رگزن الخ" جو فرہنگ اسدی طبع یورپ میں موجود ہے، مقدم الذکر سے غیر حاضر ہے۔ دیوان مسعود سعد سلمان طبع جدید ص ۷۶۳ میں بھی یہ قطعہ ہے۔(۱۷۳)دیوان ظہیر کی اشاعت کلکتہ صرف ایک بار چھپی۔ اشاعت ایران کے متعلق میں قطعی طور پر کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ اشاعت لکھنؤ ایک سے زیادہ بار طبع ہوئی۔(۱۹۴) میرا مدعا ہے کہ آزاد ۱۱۹۳ھ کو صحیح سال وفات سمجھے اور صورت میں یہ کہنے میں کہ ان کی ملاقات ایسے لوگوں سے ہوئی جو بیدلؔ کے قریبی زمانے میں نہ تھے، انھیں قباحت محسوس نہ ہوئی۔ وہ ۱۱۳۳ھ کو صحیح سمجھتے تو یہ کہنے کی جرأت نہ کرتے۔(۱۹۶ڈاکٹر انورؔ کی نظر سے محاکمات الشعرا کے چند ابتدائی اوراق گزرے تھے اور ان کا بیان انھیں پر مبنی ہے (معاصر ا ص ۳۹) دیباچے کے بعض حصص کی نقل انھوں نے براہ کرم مجھے بھی بھیجی تھی"۔

مندرجہ بالا مثالوں میں ہم نے یہ دیکھا کہ ان میں نہ ابتدائی کلمات ہیں جن سے زیر تبصرہ کتاب کا تعارف ہو سکے اور نہ ہی اختتامی کلمات ہیں جن سے پوری بحث کا خلاصہ معلوم ہو سکے۔ پھر اصل عبارت بھی اتنی خود کفیل یا واضح اور مشروح نہیں کہ اس کو پڑھ کر پوری بات سمجھ میں آسکے۔ قاضی صاحب کی تحریروں کا انداز یکسر حوالہ جاتی ہے۔ اور جب تک اصل کتاب کو نہ دیکھا جائے اس وقت تک نہ قاضی صاحب کی بات واضح ہوتی ہے اور نہ ان کا اعتراض سمجھ میں آتا ہے۔ ان کے اس اندازِ تحریر پر سنجیدہ طبقوں کی جانب سے تنقید بھی ہوئی ہے۔ ان معترضین میں سب سے زیادہ نمایاں نام ڈاکٹر گیان چند کا ہے۔ اپنے طویل مضمون، بت شکن محقق" میں جہاں انھوں نے قاضی صاحب کو شاندار الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، وہیں ان کے طریق تحقیق اور طرزِ تحریر پر چند اعتراضات بھی کئے ہیں۔ ان میں سے ایک اعتراض ان کے اس طرزِ نگارش پر بھی ہے جس میں نہ ابتدائیہ ہوتا ہے، نہ اختتامیہ۔ وہ لکھتے ہیں :

Marfat.com

''مضمون کی ابتدا اور خاتمے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ابتدا اس طرح ہونی چاہئے کہ موضوع کا تعارف کرائے یا پڑھنے والے کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلے۔ خاتمے میں بحث کو سمیٹ لینا چاہیے یا ایسا جملہ لکھا جائے جو پڑھنے والے کے ذہن میں گونجتا رہے۔ لیکن قاضی صاحب کے بہت سے مضامین ایسے یک لخت طریقے سے شروع ہوجاتے ہیں جیسے ہم کسی مضمون (یا فہرست) کو بیچ سے پڑھنے لگے ہیں''۔(۱)

قاضی صاحب مشورہ دیتے ہیں کہ: ''محقق کا مطمح نظر یہ ہونا چاہیے کہ کم سے کم الفاظ میں پڑھنے والے پر مافی الضمیر ظاہر کردے''۔

قاضی صاحب کی تحریریں مختصر نویسی کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان کی تنقیدیں مسلسل عبارت کی شکل میں نہیں ہوتیں، بلکہ آپ زیر تنقید عبارت کے ضروری اجزا کو نقل کرکے اس پر اعتراض وارد کرتے ہیں۔ اور پھر اس سے متعلق اپنی تحقیق کرتے ہیں اور ہر اعتراض پر سلسلہ نمبر ضرور ڈالتے ہیں۔ اس کا ذیلی نمبر بھی باانتظام ڈالتے ہیں۔ آپ اختصار یا کفایتِ الفاظ کا اس درجہ پاس کرتے ہیں کہ ان کی عبارت' مختصر نویسی بن جاتی ہے۔ آپ کی تحریروں میں مخففات بھی بہت ہوتے ہیں۔ آپ کسی لفظ کی تکرار کے بھی قائل نہیں۔ حتیٰ کہ اگر کسی مصنف کا نام یا کتاب کا نام ایک سے زائد اجزا سے مرکب ہے تو پہلی بار تو ضرور مکمل لکھیں گے، لیکن بعد میں جتنی بار بھی لکھنا ہوگا، اس کا صرف ایک ہی جزو لکھیں گے۔ اس کی وضاحت وہ کبھی تو تمہیدی نوٹ میں کردیتے ہیں اور کبھی عبارت کے درمیان میں۔ ایسے مواقع پر ان کی تحریر قانونی عبارت کی مانند ہوجاتی ہے۔ یہ انداز ان کی قانونی تعلیم کی دین ہے۔ چند دلچسپ مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ میر تقی میر: حیات اور شاعری (= میر) کے مصنف خواجہ احمد فاروقی ...... ''یہاں (= میر) سے قاضی صاحب کی مراد یہ ہے کہ اس تبصرے میں جہاں کتاب کا نام لکھنا ضروری ہوگا وہاں بجائے مکمل نام لکھنے کے صرف لفظ 'میر' ہی کا استعمال کیا جائے گا۔

۲۔ شمس ولی اللہ، آبِ حیات (= آب)...... ''یعنی اس مضمون میں آئندہ جب بھی آب حیات کا تذکرہ کیا جائے گا تو بجائے پورا نام لکھنے کے صرف ''آب'' کے لکھنے پر ہی اکتفا کیا جائے گا۔

(۱) معاصر۔ (قاضی عبدالودود نمبر۔ ۷۶ ۱۹ء) ص ۱۱۳

Marfat.com

۴۔ فرہنگ آصفیہ (=اصفہ) جلد ۳ کے آغاز میں...... "یہاں آصفہ کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس تبصرے میں جہاں کہیں بھی فرہنگ آصفیہ، مؤلفہ سید احمد دہلوی کا نام لکھنا ہو گا وہاں مکمل نام لکھنے کے بجائے صرف 'آصفہ' لکھ کر کام چلایا جائے گا۔اسی اندازِ تحریر کے چند دلچسپ جملے ملاحظہ ہوں:

۔ایک دوست نما دشمن نے $۳\frac{۱}{۲}$ ہزار روپے غصب کر لئے۔

۔"مؤلف نے یہ دکھانے کے لئے آصفہ میں کیا نہیں ہے صرف $\frac{۱}{۴}$ سطر لی ہے"۔

۔"مرکبات مزاجی کے مختلف اجزا اس طرح لکھنے چاہئیں کہ ایک لفظ دکھائی دے"

۔مط میں بے (ف) دل ۹۷۷، بے (ف) چارہ ۱۳۴، بے (ف) جا ۸۷۶،

۔چناں (ف) چہ ۲۸۶، ہم (ف) سر ۳۱۶ وغیرہ

اس کی وضاحت خود انھوں نے کچھ اس طرح کی ہے:

س =	تذکرہ سرور۔
مط =	نسخۂ مطبوعہ۔
ح =	حاشیہ
مط ذ =	تذکرہ ذکا
ف =	فاصلہ

آپ نے عبارت کو مختصر کرنے کی غرض سے علامات بکثرت استعمال کی ہیں۔ جس کی وجہ سے آپ کی عبارت میں ادب سے زیادہ ریاضی کی شان پیدا ہو گئی ہے۔اس انداز کی تحریر کو پڑھنے میں قاری کو بڑی الجھن ہوتی ہے اور عبارت کا مفہوم سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے۔بقول ڈاکٹر گیان چند:

"قاضی صاحب تحقیق کو سائنس کا درجہ دیتے ہیں اور اسی سائنسی نقطۂ نظر سے اپنی تحقیقات میں رموز و علامات استعمال کرتے ہیں،ان کی تحریروں میں ان علامات کی بھر مار ہوتی ہے بعض لوگوں کو ان کی ایسی تحریروں سے بہت الجھن ہوتی ہے اور وہ ان کے پڑھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو ان کی تحریروں سے استفادہ کرنا ہوتا ہے وہ محنت کرکے انھیں ضرورت پڑھتے ہیں۔ قاضی صاحب تحقیقی مضامین میں عبارت آرائی کے سخت مخالف ہیں۔ حشو و زواید کی تحقیق میں گنجائش نہیں ہے۔

Marfat.com

علامتوں کا استعمال صفائی اور اختصار کے لئے ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں "خواص کے لئے ہیں، عوام کے لئے نہیں"۔(۱)

آپ نے عبارت کو مختصر کرنے کے لئے جو علامات استعمال کی ہیں ان کی ایک دلچسپ مثال ملاحظہ ہو۔ شاد کی کہانی، شاد کی زبانی، مؤلفہ محمد مسلم عظیم آبادی پر طویل تبصرے کے آخر میں 'تصحیحات' کے ذیلی عنوانات کے تحت قاضی صاحب لکھتے ہیں:

(۱)۔ کے اوپر صفحے، اور نیچے سطر کا شمار (۲) عبارات لازماً مکمل نقل نہیں ہوئے، حذف شدہ الفاظ کی جگہ نقطے (۳) ++ سے یہ مراد ہے کہ زیر بحث غلطی یا اس قبیل کے دوسرے اغلاط اور جگہ بھی ہیں۔ (۴) = سے یہ مراد کہ اس قبیل کے الفاظ کی جگہ وہ درکار ہیں جو اس کے بعد ہیں۔ (۵) حف = اس قبیل کے الفاظ حذف (٦) ض۔ آخر سطر میں اضافہ۔ علامت وقت ہر صورت میں بدلی جائے۔ (۷) غ صفحے کا شمار جو کتاب میں ہے غلط ہے، وقتی طور پر صحیح شمار معلوم نہ ہو سکا، مگر جو لفظ جس طرح بتایا گیا ہے، اسی طرح واقعی اس میں موجود ہے۔ (۸) صرف صحیح الفاظ بھی دیئے گئے ہیں (۹) تصحیح بعض اغلاط ص ۵۷ و ص ۵۸ ۳/۴ متنبہ ++ = متنبہ ۵ یہ ++ = یہ ۴/٦ جگہ ٦ توجہ ۱۲/۱ رائے ++ = رائے ۵/۹ ۱۰ ۱ کیوریو سینٹر ۷/۱۵ کہتے ۹/۱۹ صف ۱۷۰ = ص ۱۰۰ ۱۲ ابتاشے ۱۰/۱۲ ابتدا ۱۹ بھی۔

۲/۲۱ قول.. نہیں حذف ۱۱/۴ لکھا ض ۱۸ ـــہ ۱۹۶ ۱۷ ۱۳ = ۱۴۲۷ ۱۲/۳ شاعراں ++ = شاعراں ۱۳/۱ ہے ۱۹ ۱۷ ۱۳ اسے بھی ۱۴/۸ ہے ض ۱۱ کو اختتام ۵/۱۴۸ حف ۱۲ ۷ مرتب نے ۲۱ توجیہ ++ = توجیہ ۱٦/۱۰ ـــہ ۶ ۷/۵ ا مشعر ۴ قرینہ ہے کہ ۱۹ اسد (غالب) ۱۸/۱۵ قول سے غیر حاضر ۱۹/۱۷ ہیں۔ ۲۰/۱۸ اس میں دو حیا، ایک (ص ۲۲٦) صریحاً مرد، دوسرے کا نام درج۔ مگر قرینہ ہے کہ یہ بھی مرد ہو ض ۲۱/۷ ماۃ ۱۲ ہے۔ محض ۲۲/۱۰ کیا ہوا ہم ہی ۱۷ س وذ ۲۳ نہ ہوں گی ۱۵ عمدہ ۱۹ اگر ۲۴/۴ نے ان سے متعلق ۲٦/۴ میکفت "۲۷/۷ وانشا ۱۷ سنجید گی ۲۹/۱ پہ کیا ۱۱ زمانہ فردوس آرام گاہ یعنی محمد شاہ ۱۱۳۱ھ تا ۱۱٦۱ھ ۲۰/۴ ذیل ۱۹ تا ۲۱ عبارت حاشیہ

---

(۱) معاصر۔ (قاضی عبدالودود نمبر۔ ۷٦-۱۹۷۷ء) ص ۲۷٦

(۲) نشتر و سوزن۔ ص ۱۳۰-۱۳۱

Marfat.com

کا تعلق اس صفحے سے نہیں، صفحہ آئندہ (بحث احوال مصنف) سے ہے"۔ (۲)

قاضی صاحب اشخاص کے نام بھی مکمل لکھنے کے قائل نہیں۔ یہ نام خواہ مصنف اور مؤلف کے ہوں یا ایسے اشخاص کے جن کے احوال بیان کئے گئے ہوں یا تذکرہ نگاروں نے کسی بھی حیثیت سے ان کا ذکر کیا ہو۔ اگر یہ نام قاضی صاحب کی عبارت میں ایک سے زائد بار آئیں گے تو قاضی صاحب پہلی بار کے علاوہ باقی تمام مقامات پر بالالتزام ان کے نام کا صرف ایک ہی جزو لکھیں گے اور مکمل نام سمجھنے کی ذمہ داری قاری پر چھوڑ دیں گے۔ مثلاً:

۱۔ میر ص ۲۴۵ لکھنؤ میں میر کا مشاہرہ ۳۰۰ روپے۔ یہ بات لطف کے حوالہ سے لکھی ہے۔

۲۔ میر ص ۸۸ حاتم نے میر کی غزل پر ۱۱۵۴ھ میں غزل کہی۔ ڈاکٹر زور کی سرگذشت حاتم میں ہے کہ آشناوالی غزل صائب کی زمین میں ہے۔

۳۔ فصل ۱۲ امیر ص ۳۹ از حالِ مسکیں، الخ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے شیرانی نے جعفر کے نام لکھی ہے، امیر خسرو کی یقیناً نہیں۔

۴۔ مصنف کا یہ قول کہ مظہر کی طرح ایہام کی مخالفت میں حاتم بھی پیش پیش تھے ص ۵۰۲، صحیح نہیں۔

۵۔ شعر ذیل تذکرۂ شوق (یکے از مآخذ مصنف) میں امیر شاگردِ قائم کے نام سے ہے اور اسی کا ہے:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے امیر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

یہ شعر قاسم و شیفتہ و کریم الدین (مآخذِ مصنف) کے تذکروں میں حضور کے نام سے ہے اور اس انتساب کو غلط سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ مقدمۂ کلیات میر ص ۴۳ میں اس کا ہونا اسے میر کی ملک نہیں بنا سکتا۔"

قاضی صاحب محقق کو مشورہ دیتے ہیں کہ تحقیق کی عبارت بالکل واضح اور غیر مبہم ہونی چاہئے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکے گا جب اس موضوع پر لکھنے والے کی معلومات مکمل اور ہمہ

Marfat.com

جہت ہو اور نقطۂ نظر انتہائی واضح ہو۔ اس سلسلے میں وہ سب سے پہلے علامہ شبلی کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان کی کتاب 'اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر' کے ابتدائی حصے کو بطور نمونہ کسوٹی پر پرکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"شبلی کی جو کتاب عالمگیر پر ہے اس کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے: فلسفۂ تاریخ کا ایک راز ہے کہ جو بات جتنی مشہور ہوتی ہے، اتنی ہی غلط ہوتی ہے" یہ صریحاً غلط ہے او شبلی یہ کہنا چاہتے ہوں گے کہ شہرت صحت کی ضامن نہیں"۔(۱)

دوسری مثال میں محمد حسین آزاد کی آب حیات کے ایک حصے پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

محمد حسین آزاد آب حیات کے ترجمۂ مظہر میں اردو لکھتے لکھتے یکایک فارسی پر اتر آتے ہیں جس سے پڑھنے والے کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ فارسی عبارت کہیں سے نقل ہوئی ہے۔ حالانکہ وہ خود انھی کی زائیدہ ہے۔ اس سے قطع نظر فرماتے ہیں کہ قاتل صبیح و ملیح بود۔ کوئی شخص بیک وقت صبیح و ملیح نہیں ہو سکتا اور یہ اس کا محل نہیں کہ ملیح خوبصورت کے معنی میں آسکے"۔

یہی بزرگ دبیر کے حال میں ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ "خاندان کے بارے میں نہ یقین ہے، نہ شک "اگر یقین نہیں تو شک ہونا لازم ہے"۔ اسی طرح ایک اور مقام پر مرزا غالب کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے فرماتے ہیں:

"بحث یہ ہے کہ اسدی نے لغت لکھی تھی یا نہیں۔ غالب فرماتے ہیں:
"اگر اسدی طوسی نے فرہنگ لکھی ہوتی تو محمود غزنوی کے عصر سے آج تک سب فرہنگ نگاروں کا ماخذ وہی ہوتا اور اختلاف لفظ و معنی کسی لغت میں راہ نہ پاتا۔ لیس فلیس (تیغ تیز۔ طبع ۲ ص ۲۶۸)۔ اس سے قطع نظر کہ فرہنگ مذکور محمود غزنوی کے بعد کی تالیف ہے وہ ایک مختصر سی کتاب ہے جس میں خاص خاص لغات درج ہیں اور عموماً حرکات و سکنات سے بحث نہیں ہوئی۔ اگر جامع فرہنگ بھی ہوتی اور اس میں نہج جدید کے مطابق فرہنگ نگاری کا حق ادا کیا گیا ہوتا جب بھی الفاظ کی شکل و معنی میں اختلاف بعد کو پیدا ہو سکتے تھے"۔

---

(۱) غالب نامہ (قاضی عبدالودود نمبر۔ ۱۹۸۷ء) ص ۱۷۴

Marfat.com

قاضی صاحب اپنی تمام تحریروں میں اس اصول کی پاسداری بڑی شدومد سے کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں بڑی قطعیت ہوتی ہے، اس میں کسی بھی حالت میں گومگو کی کیفیت نہیں ہوتی۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ آپ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس کے متعلق پہلے مکمل معلومات حاصل کرتے ہیں اور جب تک اس کے تمام پہلوؤں پر غور نہیں کر لیتے اس وقت تک اس کے بارے میں کوئی نظریہ قائم نہیں کرتے۔ اسی لئے آپ کی تحریروں میں بڑی وضاحت ہوتی ہے اور جو نظریہ آپ پیش کرتے ہیں اس سے اختلاف کرنا مشکل ہوتا ہے۔

قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ تحقیق کا "اسلوب بیان ایسا ہو کہ شبہے کی گنجائش نہ رہے"۔ دراصل وہ تحقیق میں صحت اور قطعیت پر بہت زور دیتے ہیں۔ ان کے یہاں غیر یقینی صورتِ حال کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان کے نزدیک جب تک بات قطعی طور پر طے نہ ہو جائے اس وقت تک اس کا اظہار کرنا مناسب نہیں۔ اسی کے ساتھ وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ عبارت اس انداز سے لکھنی چاہئے کہ قاری کا ذہن خود بخود اس مفہوم کی جانب منتقل ہو جائے جو مضمون نگار ادا کرنا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے ایسے متعدد مصنفین کی نشاندہی کی ہے جو اپنے مافی الضمیر کو واضح اور مؤثر طریقے پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اور ایسے بہت سے اقتباسات پیش کئے ہیں جن میں مصنف کے اصل مفہوم اور قاری کی تفہیم میں بنیادی اختلاف کا احتمال موجود ہے۔ اس مرحلے پر انھوں نے سب سے پہلے پروفیسر مختار الدین احمد کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ فرماتے ہیں:

"امیرؔ تخلص نام کا محمد یار خاں بن محمد علی خاں روہیلہ"۔ یہ عبارت گلشن ہند مؤلفہ حیدریؔ کی ہے۔ اس کے مرتب ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اس پر حاشیہ لکھا ہے "ص ۶ صحیح نام علی محمد خاں ہے۔ سال وفات بعد ۱۱۸۸ھ"۔ پڑھنے والا اگر اس نتیجے پر پہنچے کہ مرتب نے علی محمد خاں کا سالِ وفات دیا ہے، تو وہ بالکل حق بجانب ہوگا۔ مگر یقین ہے کہ مرتب نے امیرؔ کا سنہ رحلت بتایا ہے۔ باپ کا انتقال کم و بیش تیس سال قبل ہوا تھا۔ خود امیرؔ کا بھی سالِ وفات یہ ہے یا اس سے کسی قدر مختلف اس کے متعلق کتابوں کی طرف رجوع کئے بغیر کچھ کہنے سے قاصر ہوں"۔(۱)

---

(۱) غالب نامہ (قاضی عبدالودود نمبر۔ ۱۹۸۷ء) ص ۱۷۵

Marfat.com

قاضی صاحب کسی بھی طرح مبالغہ آمیز گفتگو کو پسند نہیں کرتے۔اسی طرح وہ نہ تو غیر ضروری اسمائے صفت کو برداشت کرتے ہیں، نہ افراط و تفریط کے قائل ہیں۔ چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں :

۱۔ سہ ماہی تحریر (دہلی) کے پہلے شمارے میں 'ساحر کاکوروی' پر جناب امیر حسن عابدی کا طویل مضمون شائع ہوا۔ اس کی ابتدا انھوں نے ان الفاظ سے کی تھی :

"لکھنؤ سے چند میل کے فاصلے پر علماء و فضلاء کا بہت بڑا مرکز کاکوری رہا ہے"۔

اس پر قاضی صاحب نے حسب ذیل اعتراض کیا :

"بہت بڑا، محض برائے آرائش ہے۔ صرف مرکز لکھنا تھا"

۲۔اسی مضمون میں عابدی صاحب نے "ساحر کے مشہور اور قابل" شاگردوں کے نام گنائے ہیں ان میں مومن علی خاں مفتوںؔ، محی الدین خاں ذوقؔ اور حیدر بیگ کاکوروی کے نام خاص طور پر دیے ہیں۔ اس پر قاضی صاحب نے ان الفاظ میں تنقید کی :

"یہ مسلم کہ بعض عبارتوں میں ان کے نام آئے ہیں مگر اس بنا پر انھیں "مشہور" کہنا اس لفظ کا سوءِ استعمال ہے"۔

۳۔بابائے اردو مولوی عبدالحق نے انتخابِ کلامِ میرؔ کے دیباچے میں لکھا ہے کہ :

دلی کے اُجڑنے کے بعد لکھنؤ آباد نظر آتا تھا......جو اٹھا وہیں پہنچا اور پہنچ کر وہیں کا ہو رہا"۔

قاضی صاحب نے اس پر ان الفاظ میں گرفت کی :

یہ صحیح نہیں کہ جس نے دہلی چھوڑی، لکھنؤ ہی پہنچا یا وہاں پہنچا تو لازماً وہیں کا ہو گیا۔ بیانؔ دہلی چھوڑ کر دکن گئے اور کئی شعراء دلی سے لکھنؤ جانے کے بعد دوسرے مقامات پر چلے گئے۔

۴۔اردو کے مشہور شاعر غلام ہمدانی مصحفیؔ نے اپنے تذکرہ ریاض الفصحا میں اپنی عمر لگ بھگ اسی سال (قریب ہشتاد) لکھی۔ اس کی بنیاد پر مولوی عبدالحق نے لکھ دیا کہ مصحفیؔ نے اپنی عمر ۸۰ سال بتائی ہے۔ قاضی صاحب کو ان کا یہ غیر محتاط انداز پسند نہ آیا۔ چنانچہ اس پر گرفت کرتے ہوئے لکھا :

"ظاہر ا ہشتاد اور قریب ہشتاد میں ان کے نزدیک کچھ فرق نہیں"۔

Marfat.com

۵۔ پروفیسر ممتاز احمد نے اپنی مرتبہ مثنویات راسخ، کے مقدمے میں ایک جگہ لکھا ہے:

"اس زمانے کی سوسائٹی کی حالت ناگفتہ بہ تھی ہر شخص کا سینہ کینہ سے بھرا ہوا تھا"۔

قاضی صاحب نے اس پر تبصرہ فرمایا:

"عظیم آباد میں کوئی زمانہ ایسا نہیں رہا جس پر یہ قول صادق آسکے کہ ہر شخص کا سینہ کینہ سے بھرا ہوا تھا"۔

قاضی صاحب تحقیق میں بڑی احتیاط اور مکمل جانچ پرکھ پر بہت زور دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تمام ممکنہ مآخذ کے بغیر کوئی نظریہ قائم نہیں کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں وہ معاصر شہادتوں کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ متنبہ بھی کرتے ہیں کہ "چھانے پھٹکے بغیر آنکھیں بند کر کے ان پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ وہ معاصرین بھی غلطی کر سکتے ہیں"۔ اپنے اس موقف کی توضیح کرتے ہوئے انھوں نے معاصر شہادتوں کی غلطیوں کی متعدد مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ ایک مثال میں انھوں نے مرزا غالبؔ اور شادؔ عظیم آبادی دونوں کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ فرماتے ہیں:

"کہا جاتا ہے کہ گھر والے گھر کا حال بہتر جانتے ہیں۔ مگر کچھ ضروری نہیں کہ وہ اپنے یا اپنے بزرگوں کے متعلق جو کچھ لکھیں، وہ صحیح ہو۔ غالبؔ اپنے کو ترک ایبک کہتے ہیں۔ لیکن ایبک ترکوں کی کوئی قسم ہی نہیں۔ شادؔ عظیم آبادی نے اپنا سلسلۂ نسب حسین فیروزی شاہ شیراز معاصر حافظ سے ملایا۔ اس نام کا کوئی بادشاہ نہیں گزرا۔ وہ ذاتی اور خاندانی آوازہ گری میں کس حد تک جا سکتے تھے، اس کا اندازہ ان اصحاب کو ہو گا جنھوں نے میری کتاب 'اشتر و سوزن' دیکھی ہے۔ ایک بزرگ کے متعلق ان کے بیٹے نے لکھا ہے کہ انھوں نے پانچ جلدوں میں ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کی بدولت عالم اسلام میں مشہور ہو گئے۔ شہرت اگر اس کا نام ہے کہ بیٹا اس سے واقف ہو تو اور بات ہے، ورنہ یہ کتاب کسی اور نے نہ دیکھی ہے اور نہ کسی شخص نے، جو ناقل شخص نہیں، اس کا ذکر کیا ہے"۔

قاضی صاحب ایک ایک بات کے تعین میں کتنی چھان بین کرتے تھے اور کتنے مآخذوں کو کام میں لاتے تھے، اس کا اندازہ ان کے مختصر سے مضمون 'سالِ وفاتِ حاتمؔ' سے لگایا جا سکتا

---

(۱) غالب نامہ (قاضی عبدالودود نمبر۔ ۱۹۸۷ء) ص ۱۸۴

Marfat.com

ہے۔ آپ نے حاتم کی صحیح تاریخِ وفات کے تعین میں جس دقتِ نظر سے کام لیا ہے اور معاصر و مابعد کے ماخذ جس طرح استفادہ کیا ہے۔ اور جس انداز سے نتیجہ اخذ کیا ہے وہ لائق تحسین بھی ہے اور قابلِ رشک بھی۔ آپ نے معاصر مآخذ کی شہادت کو بھی جرح و تعدیل کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور اس پر بھی مکمل طور پر محاکمہ کیا ہے۔ اس کو ہم قاضی صاحب کی تحقیق کا شاہکار قرار دے سکتے ہیں۔ اس کے ضروری اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں:

"شاہ حاتم کے سال وفات کے متعلق حسبِ ذیل اقوال ہماری نظر سے گزرے ہیں:

۱۔ آب حیات، از طبع نہم ص ۱۱۹ "۹۶ برس کی عمر پا کر ماہ رمضان ۱۲۰۷ھ میں دہلی میں فوت ہوئے،...... مگر مصحفی نے لکھا ہے کہ ۱۱۹۶ھ میں فوت ہوئے اور ۸۳ برس کی عمر پائی"

۲۔ تذکرۂ ہندی مصحفی ص ۸۱ "عمرش قریب بہ صدر سیدہ بود و ۳ سال ہست کہ در شاہ جہاں آباد ودیعت حیات سپرد"۔

۳۔ عقدِ ثریا مصحفی ص ۲۳ و ۲۴ "بقولش تاریخ تولدش صرف ظہور باشد ہشتاد و سہ سال عمر دارد در یک ہزار و یک صد و نود و ہفت در ماہ رمضان رحلت کردہ۔ (قطعۂ تاریخ وفات کے آخری دو شعر یہ ہیں):

سال تاریخ از خرد جستم ناگہ این مصرعے بگوشم خورد
کہ بگو مصحفی چو پرسیدت آہ صد حیف شاہ حاتم مرد

۴۔ تاریخ شعرائے اردو مؤلفہ فیلن و کریم الدین ص ۱۳۳ "وہ درمیان ۱۱۹۷ھ دہلی میں فوت ہوا"۔

۵۔ تذکرہ بیجر قلمی دفتر ہند لندن، فارسی عبارت کا ترجمہ "سو سال کے قریب عمر پائی۔ ۱۲۱۰ھ میں مرے۔ رنگین نے تاریخ کہی"۔

میں نے 'آہ حاتم برفت از دنیا' سے تاریخ نکالی۔ لیکن لالہ مکند سنگھ فارغ بریلوی کے دیوان میں جو خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ایک قطعہ ملا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاتم کی وفات ۱۱۹۷ھ میں ہوئی۔

فارغ چو بہ جستجوے تاریخ گشتم بہ تلاش و فکر ہمدم

Marfat.com

با نالہ و آہ ہاتف از غیب گفتا زجہاں برفت حاتم

۱۱۹۶ھ :آزاد نے محض سہو سے ۱۱۹۶(کذا) لکھ دیا ہے۔ مصحفی کے تذکرۂ فارسی عقد ثریا کے دو نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ دونوں میں ۱۱۹۷ھ ہے اور قطعہ تاریخ کے مصرعہ آخر سے بھی یہی نکلتا ہے۔

۱۲۰۷ھ : کریم الدین نے سالِ وفات ۱۷۹۱ء لکھا ہے جو ۱۲۰۶ھ کے مطابق پڑتا ہے۔ ۱۲۰۷ھ کی سند چونکہ کہیں اور نہیں ملتی، خیال ہوتا ہے کہ آزاد نے اسے تذکرۂ کریم ہی سے لیا ہے، لیکن حساب کرنے میں ایک سال کی غلطی ہو گئی، آزاد نے کریم کا حوالہ نہیں دیا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، آزاد نے بہ کثرت ایسا کیا ہے۔

۱۷۹۱ء مطابق ۱۲۰۶ھ : تذکرۂ کریم بڑی حد تک دتاسی کی تاریخ ادبیات سے ماخوذ ہے، اور ہمیں یقین ہے کہ کریم نے حاتم کا سال وفات اسی کتاب سے نقل کیا ہے۔ دتاسی کا ماخذ تذکرۂ مصحفی ہے جس میں لکھا ہے "سہ سال است کہ ودیعت حیات سپرد" اوروں کی طرح دتاسی بھی تذکرۂ ہندی کے متعلق اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ پورا تذکرہ ایک سال (۱۲۰۹ھ) میں لکھا گیا ہے، حالانکہ اس تذکرے کا آغاز ۱۲۰۰ھ میں ہوا ہے، ۱۲۰۹ھ سال تکمیل ہے۔ مصحفی نے حاتم کا حال ۱۲۰۰ھ میں لکھا۔ اس حساب سے سالِ وفات ۱۱۹۷ھ ٹھہرتا ہے اور عقد ثریا اور تذکرہ ہندی کے بیانات کا ظاہری اختلاف ختم ہو جاتا ہے۔

۱۱۹۷ھ : اس کی تین سندیں ہیں : عقد ثریا، تذکرۂ ہندی اور قطعۂ فارغ۔ مصحفی ۱۱۹۸ھ میں لکھنؤ گئے ہیں۔ ۱۱۹۷ھ میں دہلی ہی میں موجود تھے۔ حاتم سے ان کے تعلقات عقیدتمندانہ تھے۔ مصحفی کا سالِ وفات میں غلطی کرنا بالکل خلاف قیاس ہے۔ فارغ بھی حاتم کے شاگرد تھے اور اس معاملے میں ان کی شہادت بھی کافی وزن رکھتی ہے۔ رہا رنگین کا قطعۂ تاریخ، اگر وہ صحیح بھی نقل ہوا ہے تو مصحفی اور فارغ کی شہادتوں پر رنگین کی شہادت کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اور جب تک رنگین کی تصدیق اور ذرائع سے نہ ہو، ۱۱۹۷ء ہی کو حاتم کا سالِ وفات سمجھنا چاہئے"۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قلمی نسخوں سے مستند متن تیار کرنا بڑا مشکل اور دقت طلب کام

Marfat.com

ہے۔اس مہم میں کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلا مرحلہ تو مستند ترین نسخے کی تلاش اور تعیین ہوتا ہے۔اصل میں متنی تنقید بنیادی اہمیت ہوتی ہے۔اس کے علاوہ تخریج اور تعلیقات کا مرحلہ بھی خاصا دشوار ہوتا ہے۔ قاضی صاحب کی نظر میں اردو میں اس نوع کا جتنا کام ہوا ہے وہ معیار اور مقدار دونوں اعتبار سے غیر اطمینان بخش ہے۔ مخطوطات کی ترتیب و تدوین میں تخریج اور تعلیق کی معرفت کتاب کی افادیت اور وقعت میں اضافہ ہوتا ہے۔اور ان کے ذریعہ صحت متن کے امکانات بھی مزید روشن ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب اس کا مرتب انتقادِ متن میں مہارت رکھتا ہو اور اس کی افادیت کا قائل بھی ہو۔عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ متن کی بنیاد قلمی نسخوں پر ہوتی ہے اور یہ بات بھی تسلیم شدہ ہے کہ گذشتہ صدی کے اواخر تک فن طباعت عام نہیں ہوا تھا، کتابیں زیادہ تر ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔اس میں وقت بھی زیادہ لگتا تھا اور سہو و خطا کے امکانات بھی زیادہ ہوتے تھے۔ پھر ایک وقت میں صرف ایک ہی نسخہ تیار ہوتا تھا۔ مزید نسخوں کی ضرورت پڑنے پر اسی نسخے سے نقل کر کے دوسرے نسخے تیار کر لئے جاتے تھے۔اس طرح نقل در نقل کا سلسلہ جاری رہتا۔ یہ تمام کام انسانی ہاتھوں سے ہوتا۔اس لئے متن میں غلطیوں کا در آنا عام بات تھی۔ یہ غلطیاں کبھی تو محض سہوِ کتابت کا نتیجہ ہوتیں اور کبھی کاتب کی کم علمی کا۔اس طرح ایک مخطوطہ جتنی بار نقل ہوتا، اتنی ہی اس میں غلطیاں بڑھتی جاتیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ محققین کو قدیم متون کی ترتیب و تدوین میں مختلف النوع مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔اس میں سب سے زیادہ اہم اور بنیادی مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ کون سے نسخے کو مستند مانا جائے۔اس کے لئے قاضی صاحب مشورہ دیتے ہیں کہ ایسے نسخوں کو بنیاد بنایا جائے جو مصنف کے عہد میں لکھے گئے ہوں۔یا اس کے قریب العصر ہوں اس لئے کہ اگر اس کی کتاب مصنف کی کتابت مصنف کی حیات میں ہوئی ہے تو اس پر مصنف کی نظر ضرور پڑے گی اور قدرتی طور پر وہ غلطیوں کی اصلاح کر دے گا۔ لیکن اگر کوئی نسخہ مصنف کی حیات کا دستیاب نہ ہو تو پھر اس کے قریب العصر مخطوطے کو بنیاد بنایا جائے۔اس لئے کہ اول تو قریبی زمانے کا ہونے کے باعث اس پر زمانے کی تبدیلی کا اثر نہیں پڑے گا اور دوم یہ کہ کاتب کے لئے بھی اس کی تحریر اور اس زمانے کی زبان اور محاورے نامانوس نہیں ہوں گے۔ زمانۂ مابعد

Marfat.com

کے کاتبوں سے غلطیاں عام طور پر اس عہد کی اصطلاحات اور تصحیحات کی تفہیم میں ہی ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ ایک زمانے کے مخصوص مصطلحات، امثال اور محاورے بعد کے زمانے میں رفتہ رفتہ خارج از استعمال ہو جاتے ہیں، ان پر زمانے کی تہہ جم جاتی ہے لہذا ان کی صحیح قرأت اور مفاہیم کا تعین اسی وقت کما حقہ' ہو سکے گا جب اس عہد کی لسانی ادبی خصوصیات سے مکمل طور پر واقفیت حاصل کر لی جائے۔ ظاہر ہے کہ ایک عام آدمی کے لئے یہ سب کچھ ممکن نہیں۔ اور کاتب کی بھی علمی سطح کچھ زیادہ بلند نہیں ہوتی۔ لہذا بعد کے زمانے کے کاتبوں سے غلطیاں سرزد ہو جانا عین قرین قیاس ہے۔ اسی لئے قاضی صاحب کا یہ مشورہ کہ مصنف کے عہد یا قریب العصر قلمی نسخے کو بنیاد بنا کر متن کی صحت کی جائے، انتہائی صائب اور قابلِ عمل ہے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ محقق میں تحقیقی ذوق، متن کو ترتیب دینے کی صلاحیت اور انتقادی شعور کی پختگی اور بالغ نظری ہونا ضروری ہے، نیز اسے تصحیحات، تعلیقات اور حواشی کی اہمیت و افادیت کا احساس بھی ہونا چاہئے۔ قاضی صاحب نے خود قدیم متون پر بہت کام کیا ہے۔ اس میں انھوں نے صحت متن کا خاص خیال رکھا ہے اور حواشی و تعلیقات لکھ کر ان کی افادیت میں کثیر جہاتی اضافہ کیا ہے۔ اس کی تفصیل آئندہ باب میں اردو شعرا کے تذکروں کے ذیل میں پیش کی جائے گی۔

Marfat.com

قاضی صاحب اور اردو شعرا کے تذکرے

جیسا کہ گزشتہ باب کے آخر میں عرض کیا گیا، قاضی صاحب نے قدیم متون پر بہت کام کیا ہے اور یہ کام بنیادی طور پر اردو شعرا کے تذکروں کے ضمن میں کیا گیا ہے۔ کچھ تذکروں کو تو آپ نے ایڈٹ کر کے شائع کیا اور کچھ پر تعارفی مضامین لکھ کر رسائل میں شائع کئے۔

قاضی صاحب محض محقق ہی نہیں، ادب کے ناقد اور مؤرخ بھی ہیں۔ انھیں ادب کے ساتھ تاریخ سے بھی کافی دلچسپی رہی ہے۔ اسی لئے انھیں شعرا کے تذکروں سے لگاؤ پیدا ہوا اس کے نتیجے میں انھوں نے ان کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے اہم کارنامہ ابن امین اللہ طوفان کے تذکرۂ شعرا کی تدوین ہے۔ اس کی صحیح قرأت اور متن کی تفہیم میں قاضی صاحب نے بڑی دقت نظر اور باریک بینی سے کام لیا ہے۔ صحتِ متن کے ساتھ ساتھ آپ نے تعلیقات اور حواشی کا بھی خاص اہتمام کیا ہے۔ اس کی ترتیب آپ نے اس طرح رکھی ہے:

فہرست مندرجات مقدمہ متن حواشی ملحقات حواشی

ملحقات ۲ مفردات و مرکبات و طرق استعمال غلط نامہ

اس میں قاضی صاحب نے جو حواشی لکھے ہیں وہ بے حد پر از معلومات ہیں اور ان سے قاضی صاحب کے مطالعے کی وسعت اور معلومات کی گیرائی وہمہ جہتی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قاضی صاحب معمولی سی معمولی بات کو بھی اہمیت دیتے ہیں اور اس پر بھی اتنی ہی توجہ دیتے ہیں جتنی کہ غیر معمولی اور اہم بات پر دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ قاضی صاحب نے دوسرے اہم تذکروں کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ ان میں سے کچھ پر آپ نے تعارفی مضامین تحریر کئے اور کچھ کے محض اہم اقتباسات نقل کر کے رسائل میں شائع کرا دیے ہیں۔ بظاہر یہ کوئی اہم کام نہیں، لیکن اس کا ایک مفید پہلو یہ ہے کہ محققین کے لئے یہ اقتباسات حوالے کا کام انجام دیتے ہیں اور مفید معلومات فراہم کرتے ہیں۔ یہ اقتباسات زیادہ تر ایسے تذکروں سے ماخوذ ہیں جو اس وقت تک شائع ہو کر منظر عام پر نہیں آئے تھے۔ اور اسی لئے معدودے چند کے علاوہ عام لوگوں کی دست رس سے باہر تھے۔ اس لیں

Marfat.com

منظر میں اس اقتباسات کی اہمیت اور افادیت اور بڑھ جاتی ہے۔

جن تذکروں پر قاضی صاحب نے جزوی یا کلی طور پر کام کیا، ان کی فہرست حسب ذیل ہے:

۱۔ آبِ حیات اور طبقات الشعرا	معاصر	پٹنہ	ح ۲	۱۹۵۲ء
۲۔ آبِ حیات کے دو ماخذ	"	"	ح ۱	۱۹۵۱ء
۳۔ اقتباس سفینۂ خوش گو	نوائے ادب	بمبئی	جون	۱۹۵۷ء
۴۔ بیدلؔ اور تذکرۂ خوشگو	معارف	اعظم گڈھ	مئی و جولائی	۱۹۴۲ء
۵۔ تاریخ ادبیات اردو مصنفہ محمد صادق	نوائے ادب	بمبئی	اکتوبر	۱۹۶۷ء
۶۔ تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی	صحیفہ	لاہور	دسمبر	۱۹۵۷ء
۷۔ " "	معاصر	پٹنہ	ح ۱۱	
۸۔ تذکرۂ الابرار (خلاصہ)	"	"	ح ۱۸	
۹۔ تذکرۂ روزِ روشن	بہار کی خبریں	(آزادی نمبر)		۱۹۶۲ء
۱۰۔ تذکرۂ شورشؔ	"	"		"
۱۱۔ تذکرہ مسرت افزا	معاصر	پٹنہ	ح ۶، ۷، ۸، ۱۴	
۱۲۔ تذکرہ یوسف علی خاں	نوائے ادب	بمبئی	اپریل	۱۹۵۱ء
۱۳۔ سفینۂ ہندی	"	"	اکتوبر	۱۹۵۷ء
۱۴۔ طبقات الشعرائے ہند	معاصر	"		حصہ ۹
۱۵۔ عمدۂ منتخبہ	اشتر و سوزن			
۱۶۔ فارسی تذکرے اور ریختہ گو شعرا	نوائے ادب	بمبئی	اپریل	۱۹۵۷ء
۱۷۔ گلستان سخن	دلی کالج میگزین	کالج نمبر		۱۹۵۳ء
۱۸۔ گلشن بےخار	نوائے ادب	بمبئی		
۱۹۔ کریم الدین اور گارساں دتاسی	دلی کالج میگزین	کالج نمبر		۱۹۵۳ء
۲۰۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری	ساغر		جولائی	۱۹۴۴ء

ان میں تذکرۂ مسرت افزا مؤلفہ ابوالحسن امیر الدین احمد عرف امیر اللہ الہ آبادی کو ترتیب

Marfat.com

دے کر معاصر پٹنہ میں چار قسطوں میں شائع کرایا۔ افسوس کہ باوجود خواہش کے قاضی صاحب اسے علیحدہ کتابی شکل میں شائع نہ کرا سکے۔ معاصر کے پرچے اب معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی لئے یہ تذکرہ بھی اب عوام کی نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی قلمی نسخہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں محفوظ تھا۔ قاضی صاحب نے اسے کیمبرج میں تعلیم کے دوران دریافت کیا تھا۔ بعد انھوں نے اس کی نقل حاصل کی اور معاصر قسط وار شائع کیا۔ اس کے علاوہ سہ ماہی 'اردو' کراچی (اپریل ۱۹۶۸ء) اس سے متعلق آپنے ایک طویل تعارفی مضمون بھی شائع کیا۔ اور اس کے ذریعہ اس کی اہمیت اور افادیت سے علمی دنیا کو روشناس کرایا۔

ان تذکروں کے سلسلہ قاضی صاحب کا ایک مضمون 'بیدل اور خوشگو' ہے۔ جو ماہنامہ 'معارف' اعظم گڈھ کی دو اشاعتوں (مئی و جولائی ۱۹۴۲ء) شائع ہوا۔ اس کی ابتدا مؤلف تذکرہ 'بندرابن خوشگو' کے حالاتِ زندگی تحریر کئے ہیں۔ اس سلسلے قاضی صاحب نے یہ اعتراف کیا ہے کہ ان حالات کو جمع کرنے وہ زیادہ تحقیق سے کام نہیں لے سکے ہیں اور جتنے حالات بآسانی دستیاب ہو سکے ان کو ہی سپرد قلم کر دینے پر اکتفا کیا ہے، زیادہ چھان بین اور تلاش و جستجو سے کام نہیں لیا ہے۔ لیکن جتنے حالات بھی لکھے ہیں ان سے مؤلف کے بارے ضروری معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس آپ کا سارا زور ان واقعات کی صحت اور عدم صحت کا پتا لگانے پر ہے اور اس کوئی لغہ نہیں کہ اس مرحلے پر انھوں نے صحت اور مثبت تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس کی تمہید قاضی صاحب نے وضاحت فرمائی ہے کہ :

اس مضمون کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے سفینۂ خوشگو بیدلؔ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بجنسہ نقل کر دیا گیا ہے۔ اور دوسرے حصہ اس پر ناقدانہ نگاہ ڈالی گئی ہے اور خوشگو کے ماخذوں کا سراغ لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس غرض سے نے بیدلؔ کی تصانیف کا لعہ کیا ہے اور ہم عصر و قریب العصر مصنفوں نے بیدلؔ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کے معتدبہ حصہ کو پیش نظر رکھا ہے"۔

قاضی صاحب نے ان بیانات کو جو خوشگو نے بیدل کے متعلق قلم بند کئے ہیں، نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھنے کتنی محنت کی ہے اور کیسی دقتِ نظر سے کام لیا ہے اس کا اندازہ کچھ خود

Marfat.com

قاضی صاحب کے اس بیان سے ہی ہو جاتا ہے کہ ''اس غرض سے نے بیدل کی تصانیف کا لعہ کیا ہے'' اس کے علاوہ آپ نے صرف اس پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ خوشگو کے ایک ایک بیان کا محمد افضل سرخوش کے کلمات الشعرا، میر تقی میر کے نکات الشعرا لکشمی نرائن شفیق کے گل رعنا اور سفینۂ عشرت جیسے اہم اور بنیادی مآخذ سے بھی موازنہ کیا ہے اور ان کی صداقت و اصلیت کا پتا لگایا ہے۔ اور آخر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ :

''خوشگو نے بیدل کے حالات بڑی تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ ابتدائی زمانے کے حالات زیادہ تر خود بیدل کی تصانیف سے لئے ہیں۔ آخری زمانے کے حالات چشم دید ہیں۔ خوشگو کا بیان ہے کہ اسے ہزار بار سے زیادہ بیدل کی خدمت حاضر ہونے کا موقع ملا تھا۔ سفینۂ خوشگو سے بیدل کے متعلق بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور بہت سی پرانی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں۔ اس کا بیان قابلِ اعتبار ہے لیکن ایک دو جگہ اس سے بھی غلطی ہو گئی ہے''۔

کہا جاتا ہے کہ تحقیق کی ابتدا شک سے ہوتی ہے۔ قاضی صاحب اس مقولہ پر بڑی سختی سے عمل کرتے ہیں۔ آپ کسی بھی بیان کو قابلِ اعتبار تصور نہیں کرتے، چاہے وہ کتنے ہی معتبر و مستند شخص سے کیوں نہ منسوب ہو۔ اسی لئے آپ نے تحقیق کا ایک زرّیں اصول یہ بھی بتایا ہے کہ ''معاصرانہ شہادت کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن معاصرین بھی غلطیاں کر سکتے ہیں'' وجہ ہے کہ بیدل کے بارے خوشگو نے جو کچھ لکھا ہے قاضی صاحب نے اسے من و عن قبول نہیں کیا بلکہ اس کے ایک ایک بیان کو نقد و جرح کی آگ پر تپایا اور کھرا کھوٹا الگ کر دکھایا۔ اور نہ صرف دیگر تذکروں بلکہ خود بیدل کی متعدد تصانیف کی مدد سے خوشگو کے کچھ بیانات کو لغہ پر مبنی بتایا۔ حالانکہ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ ''اسے ایک ہزار بار سے زیادہ بیدل کی خدمت حاضر ہونے کا موقع ملا تھا'' قاضی صاحب نے اس کے بعض بیانات کو دوسرے مآخذ کی مدد سے غلط ثابت کیا اور ان کی اصلاح کی۔

قاضی صاحب نے اردو کے کلاسیکی شعراء پر بہت کام کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ان کا اصل موضوع ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں، اس پر اتنی محنت اور جانفشانی سے کام لیتے ہیں اور اتنی باریکی سے تحقیق کرتے ہیں کہ وہی

Marfat.com

آپ کا مرکزی موضوع محسوس ہونے لگتا ہے۔آپ نے جن شعرائے متقدمین پر کام کیا ہے ان میں مرزا محمد رفیع سوؔدا بھی شامل ہیں۔آپ نے معاصر پٹنہ (حصہ دوم) میں 'کچھ سوؔدا کے بارے میں' کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا۔اس میں تذکرۂ باغِ معانی میں سوؔدا کے متعلق جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، ان پر محاکمہ کیا گیا ہے اور مؤلف کے اکثر بیانات کی تردید کی گئی ہے۔ مضمون کی ابتدا انھوں نے 'باغ معانی' کے تعارف سے کی ہے۔اس میں بھی حسب معمول آپ نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔اس کا تعارفی حصہ ملاحظہ ہو۔فرماتے ہیں:

"اشپرنگر نے اپنی فہرست میں لکھا ہے کہ "باغ معانی جو غالباً تاریخی نام ہے (=۱۱۷۴) ظاہراً تین، چار ضخیم جلدوں میں ہے، جن میں سے صرف دوسری میری نظر سے گزری ہے۔ مصنف نے اپنا نام نہیں بتایا مگر یہ ممکن ہے کہ یہ تذکرہ علی ابراہیم خاں کا لکھا ہوا ہو۔ جلد ۲ تیسرے، چوتھے اور پانچویں چمنوں پر مشتمل ہے۔ پہلے اور دوسرے چمن ممکن ہے کہ کسی بالکل مختلف موضوع سے سروکار رکھتے ہوں۔ تیسرے چمن میں کم وبیش ۷۵ اشاعروں کا بہ ترتیب حروف تہجی مختصر اذکر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں شاعری میں امتیاز حاصل ہے اور ان میں سب سے آخر شاہ عالم ہیں۔ چمن ۴ میں کم وبیش ۲۲۶ امراو وزرا کے تراجم ہیں جنھوں نے شعر کہے ہیں۔ چمن ۵ میں کم وبیش ۳۲۲ شاعری پیشہ اصحاب کا ذکر ہے۔ یہ نسخہ موتی محل لکھنؤ میں تھا اور اس کے صفحات کی تعداد ۸۳۷ تھی۔ اس کتاب کی جلد ۳ کا ایک حصہ کتب خانۂ مشرقیہ پٹنہ میں ہے جس کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا نام نقش علی تھا۔ یہ شاعر تھا اور دیباچہ میں اس کے اشعار بھی ہیں۔ دیباچے میں مرقوم ہے کہ مصنف جب تذکرہ باغ معانی کے ۵ چمن لکھنے سے فارغ ہوا تو چھٹے اور ساتویں چمن اور خاتمے کے لکھنے کی طرف متوجہ ہوا۔ نسخۂ پٹنہ کا پہلا شاعر امیر الدین اور آخری محمد ظریف، ظریف ہے۔ اس کی ترتیب میں بھی حروف تہجی کا لحاظ رکھا گیا ہے اس کے شعرا اور چمن ۵ کے شعرا میں مابہ الامتیاز کیا ہے، اس کا پتا نہیں چلتا۔ موتی محل کا نسخہ ناپید ہے اور اس کے متعلق اشپرنگر کا بیان ناکافی اور کہیں کہیں غلط ہے۔ باغ معانی

Marfat.com

کے چھٹے چمن کا بقیہ، اس کا ساتواں چمن اور خاتمہ بھی ناپید ہے نسخہ پٹنہ اس کی صراحت نہیں کہ 'باغ معانی' سے سال تصنیف مستخرج ہوتا ہے یا نہیں اور نہ مصنف نے بتایا ہے کہ سال آغاز وانجام کیا ہے۔ لیکن ۱۱۷۴ھ سے پہلے اور ۱۱۹۶ھ کے بعد کے کسی واقعے کا اس ذکر نہیں۔ مختلف شعراء کے تراجم مختلف زمانوں قلم بند ہوئے ہیں۔ مثلاً مصنف کی صراحت کے بموجب زین الدین علی، رسائی اور محمد جعفر خاں راغب کے تراجم علی الترتیب ۱۱۷۴ھ اور ۱۱۹۶ھ لکھے گئے ہیں۔ مصنف کے سودا سے ذاتی تعلقات تھے"۔

اس تعارفی تمہید کے بعد 'باغ معانی' سودا کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، قاضی صاحب نے اسے من وعن نقل کر دیا ہے اور پھر اس پر محاکمہ کیا ہے۔ اور ہر بیان کی دوسرے مآخذ و شواہد سے تصدیق کی ہے اور جہاں اختلاف پایا جاتا ہے اس کو بھی ظاہر کیا ہے اس سلسلے اہم بحث سودا کی والدہ سے متعلق بھی ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سودا نعمت خان عالی کے بھانجے تھے۔ مشہور مستشرق گارسین دتاسی نے تاریخ ادبیات ہندی و ہندوی ان کی والدہ کو عالی کی ہمشیرہ لکھا ہے۔ اسی بنیاد پر شیخ چاند نے اپنے تحقیقی لے 'سودا' نعمت خاں کی بہن ہی کو سودا کی والدہ لکھ دیا ہے۔ ان کا ذریعۂ معلومات تذکرۂ شاہ کمال ہے۔ سعادت خان ناصر نے اپنے تذکرہ خوش کۂ زیبا انھیں نعمت خان عالی کے خاندان سے لکھا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

"مرزا محمد رفیع، متخلص بہ سودا خلف الصدق مرزا محمد شفیع اصفہانی کہ اعزہ روزگار سے تھے اور مادر گرامی ان کی دختر خجستہ اختر خاندان نعمت خانِ عالی سے"۔

لیکن قاضی صاحب اس بات سے متفق نہیں ہیں۔ وہ انھیں مرشد قلی خاں کے خاندان سے مانتے ہیں۔ تقریباً بات مظہر بن مظفر روشن الدولہ رستم جنگ نے اپنی تالیف خلاصۃ العیش عالم شاہی، لکھی ہے۔ قاضی صاحب نے اس سلسلہ جو بحث کی ہے اس کا خلاصہ ذیل پیش کیا جاتا ہے۔

'مادرِ سودا کے ذیلی عنوان کے تحت قاضی صاحب فرماتے ہیں:

Marfat.com

"ظاہرا سب سے پرانا تذکرہ جس سوداؔ کی والدہ کا ذکر ہے، کمالؔ کا مجمع الانتخاب ہے جو تیرہویں صدی (ہجری) کے ربع اوّل مصحفیؔ کے تذکرۂ ہندی کے بعد وجود آیا ہے۔ دتاسی (جلد ۳ ص ۷۶) کمالؔ لکھتا ہے کہ سوداؔ کی ماں نعمت کی بہن تھی لیکن اس کے حوالے سے شیخ چاند مرحوم نے یہ تحریر کیا ہے کہ "نعمت خان عالیؔ کی دختر سے ان کی (محمد شفیع پدر سوداؔ کی) شادی ہوئی جن کے بطن سے سوداؔ پیدا ہوا"۔ تذکرۂ کمالؔ کی طرف رجوع اس وقت ممکن نہیں اس لئے قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے کیا لکھا تھا لیکن قرینہ یہ ہے کہ مصنف "سوداؔ" کا بیان تذکرۂ کمال کے بق ہے اور دتاسی سے سہو ہوا ہے۔ ناصر نے خوش کۂ زیبا لکھا ہے کہ سوداؔ کی ماں "دختر خجستہ اختر خاندان نعمت خاں عالی سے ہے" اگر اس کے ذہن بیٹی یا حقیقی بہن ہوتی تو شاید ہی ان لفظوں اس کی طرف اشارہ کرتا۔ اور تذکرے نگار اس باب خاموش ہیں"۔

عنایت خاں راسخ خلف لطف اللہ خاں صادقؔ سوداؔ کے ہم عصر اور امرائے د سے تھے۔ انھوں نے ایک رسالہ "ذکر مغنیانِ ہندوستانِ بہشت نشاں" لکھا ہے جس ضمناً یہ بتایا ہے کہ سوداؔ کس کے نواسے تھے"۔

اس کے بعد سوداؔ سے متعلق اس کتاب سے ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے۔ جس کا آخری جملہ یہ ہے:

"اسمٰعیل قلی خاں صاحب کہ لغایت ۱۱۷۷ھ در عظیم آباد اقامت دارند نبیرہ و مرزا محمد رفیع سوداؔ نبیسۂ مغفور اند"۔

اس کے متعلق قاضی صاحب نے حسب ذیل توضیح فرمائی:

"نبیرہ سے پوتا اور نبیسہ سے نواسہ مراد ہے"۔

اس کے بعد مآثر الامرا جلد دوم سے مرشد قلی خاں کے سوانح نقل کئے ہیں اور آخر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

"مرشد قلی خاں کے زمانۂ وفات کو دیکھتے ہوئے یہ بات کسی قدر مستبعد ہے کہ سوداؔ جو

Marfat.com

۱۱۱۸ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہیں ان کی بیٹی کے بیٹے ہوں۔ مآثر الامرا ان کے دو بیٹوں اہتمام خاں اور فضل علی خاں کا ذکر ہے۔ ممکن ہے سودا ان دونوں سے کسی کے پوتے یا نواسے ہوں۔ نعمت خان عالی سے تعلق میرے خیال صرف اس بنا پر پیدا کر دیا گیا ہے کہ یہ بات موزوں معلوم ہوتی ہے کہ ایک ظریف دوسرے کا عزیز ہو"۔

اردو شعرا کے تذکروں کے سلسلے قاضی صاحب نے جتنا کام کیا ہے، اس سب سے زیادہ اہم اور تفصیلی کام نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر سرور کے تذکرے عمدۂ منتخبہ ؛مرتبہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی پر طویل تبصرہ ہے۔ یہ ان کے مجموعۂ مضا 'اشتر و سوزن' شامل ہے۔ اس کی شرح وبسط کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب کے ساٹھ صفحات پر محیط ہے۔ اس طویل تبصرے قاضی صاحب نے غیر معمولی کاوش سے کام لیا ہے۔ اس آپ نے مؤلف اور مرتب دونوں کے تسامحات اور غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ یہ غلطیاں کئی قسم کی ہیں۔ ان کچھ تو تاریخی نوعیت کی ہیں، کچھ مؤلف کی بے احتیاطی کے سبب در آئی ہیں، کہیں اشعار کا انتساب غلط ہے اور کہیں مؤلف ایک ہی تخلص کے مختلف شعرا امتیاز کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اور اکثر مات پر یکسانیت بھی برقرار نہیں رہ سکی ہے۔ قاضی صاحب نے اس ضخیم تذکرے کا ایک ایک لفظ بغور پڑھا ہے اور بعض مات پر تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کئی کئی بار پڑھا ہے۔ اسی لئے آپ نے مؤلف کی بے شمار غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اور اسی کے ساتھ مرتب کو بھی ہدفِ تنقید بنایا ہے کہ جو تسامحات مؤلف سے سرزد ہو گئے تھے، مرتب نے بھی ان کی اصلاح نہیں کی اور اس طرح وہ ایک پختہ کار مرتب کی خدمات انجام دینے سے قاصر ہے مثلاً اعظم الدولہ نے رجہ ذیل شعر ۔

روشنی جو رخ ہے ماہِ منور نہیں اور چمک الی ایسی ہے کہ اختر نہیں

کو "گویا لکھنوی۔ مجہول الاسم" کا بتایا ہے۔ یہ غلط ہے۔ لیکن مرتب نے اس کی اصلاح نہیں کی۔ قاضی صاحب نے اس کی اصلاح فرمائی۔ لکھتے ہیں :

اس ز کا ایک شعر (ص ۵۴۳)، یہ اور " فقیر محمد خاں گویا، (ص ۵۴۸) ایک ہیں۔ یہ اشعار مطبوعہ دیوان فقیر محمد خاں موجود ہیں"۔

Marfat.com

اس کے علاوہ صفحہ ۴۴ اور ۴۵ پر قاضی صاحب فرماتے ہیں :

"س بہت سے اشعار غلط منسوب ہیں یا ان کا انتساب مشتبہ ہے۔ بعض اشعار تضمین ہوئے ہیں۔ یہ خبر نہیں کہ سرور کے نزدیک یہ کس کے طبع زاد ہیں۔ حواشی ان امور کی طرف یا تو بالکل توجہ نہیں دیا ہے تو ناکافی ہے۔ لیں :

(۱) خواجہ آثر کے ۷ شعر بنام عبداللہ، آزاد حاشیہ تذکروں کے حوالے سے منسوب بہ آثر لیکن یہ ضروری بات نہیں کہ دیوان آثر ہوں اور واقعی آثر کے ہوں۔

(۲) یار گھر جاتا ہے یارو کیا کروں، امید، لیکن صنعت کا شعر (تذکرہ گردیزی)۔

(۳) اپنے ہاتھ کے گل کی کہوں اک کہانی "انشا، رنگین کا شعر ہے۔ آخر اضافہ ہے" ضروری ہے۔

(۴) نہیں حاجت ہے زیور کی جسے خوبی خدا دیوے، احسن اللہ، مگر شعر آبرو۔

(۵) نازک بدن پہ اپنے کرتے ہو تم جو غرہ۔ احسن اللہ، غالباً شعر آبرو ۔

(۶) ع ۲ "کناری آبدار اس شوخ کی منصور خانی ہے" احسن اللہ، تذکرۂ ذکا بنام کاشی ناتھ۔ خدا جانے کس کا ہے۔

(۷) کئی سو اشعار ص ۶۰ تا ص ۷۸ بنام میر غلام علی حیدر آبادی۔ حاشیہ شبہے سے خالی نہیں...... بعض...... حافظ عبدالرحمان احسان کے نام (تذکروں)...... بعض اشعار کچھ ایسے اشارات ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شعر حافظ احسان کے ہیں۔ نغز میر...... احسان کا صرف رجہ ذیل شعر "آگے چل کر حواشی صرف ۸ اشعار کے متعلق دوسرے تذکروں کے حوالہ سے انتساب بہ حافظ احسان، لیکن اس کے بارے بھی فیصلہ نہیں۔ احسان کا دیوان ہندوستان جا بجا ملتا ہے اور لندن بھی ہے۔ سوال حافظ کے دو چار اشعار کا نہیں، کئی سو اشعار کا تھا، دیوان کی طرف رجوع لازم تھا، مگر مرتب اس سے قاصر رہے۔ کمال یہ ہے کہ اشارات کیا ہیں یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اشعار ذیل جو اشارے ہیں وہ شاعر کے دہلوی ہونے پر مشعر ہیں :

ہوں شہ ہند کا استاد یہ ہے فخر مجھے شہرہ میرا تو شہا تا شہِ ایران گیا

Marfat.com

عالم ہے رسم عید جب تک یا رب شاہِ عالم ہی رہے شاہِ عالم
میرزا نیلی مقصود سپہر نیلی تجھ کو سر سبز رکھے خالقِ علام مدام
صبا تو کہیو آہنگ خدمت وف ادب سے کہیو کہ اے عندلیب خوش آہنگ
تورنج شورش زاغاں سے اس گلستاں نہ کیجیو ترکِ ترنم کا ایک شب آہنگ

کل اشعار جو صفحات مذکور ہیں حافظ احساؔن کے ہیں''۔

ان کے علاوہ سیکڑوں اشعار ایسے ہیں جن کے بارے اعظم الدولہ سرورؔ سے لغزش ہوئی ہے اور انھوں نے غلط شاعروں سے انھیں منسوب کر دیا ہے۔ قاضی صاحب نے ان سب کی اصلاح اور مستند حوالوں کے ساتھ اصل شاعروں کا تعین کیا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا قاضی صاحب کی تنقید کا نشانہ مؤلف سے زیادہ مرتب ہیں۔ اور بڑی حد تک یہ بات درست بھی ہے۔ مرتب کا کام کو من و عن پیش کر دینا نہیں ہوتا، بلکہ یہ بھی اس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اس جو خا ں اور کمیاں ہیں، یا اصل مصنف سے جو لغزشیں ہوئی ہیں، حواشی ان کی نشاندہی کرے اور صحیح صورتحال سے قاری کو مطلع کرے۔ اسی کے ساتھ مرتب کو تعلیقات وغیرہ کا بھی اضافہ کرنا چاہیے جس سے کتاب کی افادیت اور قدر و قیمت اضافہ ہو سکے۔ 'عمدۂ منتخبہ' کے مرتب ایسا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ قاضی صاحب نے اس سلسلے ان کی سخت گرفت کی ہے۔ قاضی صاحب کے چند اعتراضات ملاحظہ ہوں:

(۱) تذکرۂ سرور کے صرف ۴ خطی نسخوں کے موجود ہونے کا علم ہے۔ اور نسخۂ ہذا کی ترتیب کم از کم تین سے بآسانی کام لیا جا سکتا تھا۔ لیکن مرتب نے بقول خود نسخۂ لندن کی مائکرو فلم کے سیاہی زدہ مکبّر پر قناعت کی ہے۔ نے سنا ہے کہ ان مات کے پڑھنے کے لئے جو مکبّر خراب ہو گئے ہیں اور ان کی تعداد ۳۰۰ سے زیادہ ہے۔ مائکرو فلم کی طرف توجہ ضروری بھی محسوس نہیں ہوئی۔ نسخۂ لندن کا مستعار منگوانا تو بڑی بات ہے''۔

(۲) مقدمہ مرتب کے آخر ہے: ''احتیاط کے باوجود طباعت غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ان کو اردو طباعت کی روایت سمجھ کر گوارا کیا ہے''۔ یہ عذر اگر نول کشور کی طرف سے

Marfat.com

ہوتا، جو کتابیں بہت ارزاں بیچتے تھے اور سنگی مطبع چھپواتے تھے، تو سنا بھی جاتا۔ کتاب جلی ٹائپ چھپے (باستثنائے حواشی) اور قیمت بھی زیادہ ہو۔ تو قابل قبول نہیں مزید یہ کہ کتاب غلطنامہ شامل نہیں۔ یہ تو کسی مستشرق نے نہ کہا ہو گا کہ چھاپے کی غلطیاں رہ جائیں تو ان کی نشاندہی نہ کی جائے۔ ہاں، اس سے ایک فائدہ البتہ ہے ؛ وہ غلطیاں بھی جن کا ذمہ دار خود مرتب ہے، اہل مطبع کے نامۂ اعمال لکھی جا سکتی ہیں"۔

(۳) مرتب کا قول ہے کہ س ۹۹۶ شاعروں کا ذکر ہے۔ صحیح تعداد ۱۰۰۵ ہے جس وہ شعرا جن کا ترجمہ ایک سے زیادہ مرتبہ کسی نہ کسی وجہ سے شامل س ہے، داخل ہیں۔ مرتب نے یہ نہیں بتایا کہ نظم و نثر کا تناسب کیا ہے۔ تذکرے کم و بیش ۸۴۰۰ اشعار ہیں، جن سے تھوڑے کسی نہ کسی وجہ سے ایک سے زیادہ مات ملتے ہیں۔ ایسے شعرا جن کا صرف ایک شعر تذکرے ہے بہت ہیں۔ سب سے زیادہ اشعار مصحفی (۷۱۹) کے ہیں اور ان کے بعد میر کے (۴۷۹) چند شعرا کے اشعار کی تعداد ذیل دی جاتی ہے:

احسان دہلوی (۳۸۷) ان وہ اشعار بھی شامل ہیں جو کاتب یا جلد ساز کی غلطی سے احسان حیدرآبادی کے نام سے درج تذکرہ ہیں۔ وف ۲۹۸، انشا ۲۱۷، سودا ۱۹۱، جرأت ۱۷۵، قائم ۱۶۲، نصیر ۱۴۶، ناسخ ۱۳۷، فراق ۱۳۶، کوثر لکھنوی ۱۰۷، ذوق ۹۰، موزوں (استادِ سرور) ۸۸، عظیم ۸۲، ممنون ۷۵، درد ۷۵، غالب علی خاں، سید ۷۰، قاسم ۶۶، مصنف ۶۴۔ ہدایت ۵۹، بقا ۶۲، ذکا صاحب تذکرہ ۵۷، سوز ۵۴، جعفر علی حسرت ۵۲، نامی ۴۷، شاہ قدرت ۴۶، دلسوز ۴۵، اسد (غالب) ۴۵، سلیمان شکوہ ۴۳، ولی اللہ محب ۴۲، ظفر ۴۰، طپش ۴۰، حسین ۳۹، عزت اللہ عشق ۳۹، رنگین ۳۷، جوشش ۳۷، مسرور کاکوری ۳۶، رضا دہلوی ۳۶، حاتم و فغاں ۳۵، یقین و برکت ۳۴، بیدار و نثار ۳۲، خیال ۲۹، ولی ۲۸، کلیم و مول چند منشی ۲۳، اکبر و نظیر اکبرآبادی ۲۲، میر حسن ۲۰، ثابت دہلوی ۱۹، تجلی ۱۸، تاباں ۱۶، بیان ۱۵، آفتاب (شاہ عالم) ۱۴، افسوس ۱۳، آتش ۱۲، مومن ۹، اثر ۸۔ تذکرے اُن تمام اصناف سخن کے جو عام طور پر رائج ہیں، نمونے موجود ہیں مگر غزلوں کے بلے دوسرے اصناف کی مقدار بہت کم ہے۔ عربی فارسی کے اشعار بھی ہیں مگر برائے نام۔ ہزل و ہجو

Marfat.com

بھی غیر حاضر نہیں۔ صاحبقراں کے ۶ شعر مرتب نے نکال دیے ہیں اس نثر کی کم وبیش ۳۲۴۰ سطریں ہیں سب سے طویل ترجمہ انشا کا ہے جو ۲۹ سطروں ہے"۔

(۴) حواشی س کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے بہت کم ہیں۔ ان بہت سی نہایت ضروری باتیں نظر انداز ہوئی ہیں اور بہت سی بالکل فضول باتیں موجود ہیں۔ حواشی اگر ایسے اقوال پیش کیے گئے ہیں جو س کے مخالف پڑتے ہیں، اور اس کا امکان بھی ہے کہ فیصلہ کن بات کہی جاسکتی، تو اس سے عموماً احتراز کیا ہے حاشیہ کوئی غلط قول درج ہے اور اس کا غلط ہونا قلم انداز ہوا ہے تو یہ مفید ہونے کے بجائے مضر ہو سکتا ہے۔

(۵) املا، او قاف گذاری۔ مقدمہ ہے "تذکرۂ سرور کا تیار کرنے ہم نے ایسے الفاظ کا قدیم املا برقرار رکھا ہے جیسے تروار......یا کایت...... لیکن عام الفاظ کو موجود املا کے بق رکھا ہے، جیسے جہاڑ کے بجائے جھاڑ، اوس نے کے بجائے اس نے۔ یاے وف اور مجہول بھی فرق کیا ہے۔ نیز مرکب الفاظ کو موجودہ الفاظ کے بق علاحدہ علاحدہ (کذا) لکھا ہے۔ تلوار کو تروار اور کایستھ کو کایت لکھنا اختلاف املا نہیں۔ یہ لفظ کی دو شکلیں ہیں۔ س جس زمانے وجود آیا ہے، تلوار زیادہ مروج تھا، چنانچہ انشا نے دریائے لطافت تروار پر اعتراض کیا ہے۔

> "دانشگاہ دہلی کو چاہیے تھا کہ اشاعتِ مخطوطات کے انتظام کے ساتھ ساتھ املا وغیرہ کے قواعد مقرر کرتی۔ بیرونی لوگ ممکن ہے کہ کلاً انھیں نہ مانتے لیکن مط (نسخۂ مطبوعہ) میں شتر گربگی تو نظر نہ آتی کہ ایک ہی لفظ یا ایک قبیل کے الفاظ مختلف طور پر ملیں"۔

اس طرح قاضی صاحب نے 'تذکرہ سرور' اور س کے مرتب دونوں پر بے شمار اعتراضات کیے ہیں۔ ان سے کچھ تو سے متعلق ہیں کچھ تحقیقی نوعیت کے ہیں اور کچھ اصول ترتیب و تدوین سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تبصرہ قاضی صاحب نے جتنی محنت، جانفشانی اور دیدہ ریزی سے لکھا ہے، وہ اپنی ل آپ ہے۔ اس سے جہاں قاضی صاحب کے تبحر علمی اور وسعتِ لعہ، نیز باریک بینی کا پتا چلتا ہے، وہیں اردو شعرا کے تذکروں سے ان کی غیر معمولی دلچسپی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن عام طور پر ہمارے دانشوروں اور ادبی ناقدوں نے

Marfat.com

قاضی صاحب کی اس کاوش کو بہ نظر استحسان نہیں دیکھا اور اسے نکتہ چینی اور عیب جوئی پر محمول کیا۔ چنانچہ ڈاکٹر خلیق انجم 'اشتر و سوزن' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

محترمی قاضی عبدالودود صاحب جیسے محقق پر اردو ادب جتنا ناز کرے کم ہے۔ لیکن انتہائی افسوس کا م ہے کہ ان کی صلاحیتیں معمولی کاموں کی نذر ہو چکی ہیں۔ حال ہی قاضی صاحب قبلہ کی ایک نئی کتاب 'اشتر و سوزن' شائع ہوئی ہے جس دو مشہور کتابوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ قریب بہ یقین ہے کہ اس کی علت غائی صرف غلطیاں نکالنا ہے۔ قاضی صاحب کا یہ فعل اس وقت تو جائز تھا جب وہ خود غلطیوں کے مرتکب نہ ہوتے لیکن ایسی صورت جب کہ وہ خود بے احتیاطی سے کام لیتے ہیں، کیا انھیں کسی پر پتھر مارنے کا حق ہے ؟"(۱)

تعین زمانہ: قاضی صاحب ہمہ وقت حقائق کی تلاش رہتے تھے۔ انھیں ایسی کوئی بات پسند نہیں آتی تھی جو سرسری انداز پر کہی گئی ہو اور جس کو سپرد قلم کرنے سے قبل حقائق اور شواہد کی کسوٹی پر پوری طرح پرکھ نہ لیا گیا ہو۔ اسی عدم احتیاط کے نتیجے بہت سی باتیں غلط رواج پا گئی ہیں۔ ان شاعروں، ادیبوں اور دیگر مشاہیر کی تاریخ ہائے ولادت و وفات بھی شامل ہیں۔ ہمارے تذکرہ نگاروں، سوانح نگاروں اور ادبی تاریخ نگاروں کی سہل انگاری کے سبب سیکڑوں مشاہیر کی ولادت اور وفات کی تاریخوں اور سنین اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہمارے تذکرہ نگار اور سوانح نگار ان کی تاریخوں مختلف الرائے نظر آتے ہیں۔ اور بے شمار حضرات کی تاریخیں غلط مشہو ہو گئی ہیں۔ ان کے سبب کتنے ہی تاریخی واقعات غلط ثابت ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے مورخین اس جانب متوجہ نہیں ہوئے اور غیر درست تاریخوں کی تکرار اتنی کثرت سے کرتے رہے کہ وہی رواج پا گئیں اور عوام و خواص سب ہی بلا تحقیق ان کو درست سمجھنے لگے۔ لیکن قاضی صاحب کا مزاج ان سب سے مختلف ہے۔ وہ کوئی بات اس لئے نہیں مان لیتے کہ ایسے ہی مشہور ہے یا یہ کہ چونکہ فلاں شخص کے حوالے سے یہ بات کہی گئی ہے اس لئے یہ بات درست ہے لہذا مزید تحقیق کی ضرورت نہیں۔ قاضی صاحب نے اس سلسلے بہت محنت کی اور سیکڑوں ادبی شخصیتوں کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا بالتحقیق تعین کیا۔ اس کے لئے آپ نے تعین زمانہ کے عنوان سے مضا لکھے جو چھ

---

(۱) ہماری زبان۔ علی گڑھ (پندرہ روزہ) یکم ستمبر۔ ۱۹۶۵ ص ۳

Marfat.com

قسطوں 'معاصر' پٹنہ شائع ہوئے۔ (معاصر حصہ ۲، ۸، ۱۸، ۲۳)۔ اور چونکہ اس کام انھوں نے اردو شعرا کے تذکروں سے مدد لی ہے، اس لئے اس پر اظہار خیال بھی اسی ذیل کیا جارہا ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ ان تذکروں کے تنقیدی لعے کے دوران آپ کے اوپر یہ بات منکشف ہوئی کہ ان کے مؤلفین نے صاحبان سوانح کی تاریخوں کے تعین تحقیق سے کام نہیں لیا ہے اس لئے قدم قدم پر اختلافات کا شکار ہو گئے ہیں۔ کچھ تذکرہ نگاروں نے تو اس جانب قطعاً توجہ بھی نہیں کی ہے۔ ان اعظم الدولہ سرور بھی ہیں۔ قاضی صاحب کا فرمانا ہے کہ اوّل تو انھوں نے شعرا کے سنین لکھے ہی نہیں ہیں، اور اگر کہیں لکھے ہیں تو وہ لازماً غلط ہیں۔ تذکرۂ عمدۂ منتخبہ مرتبہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی پر تبصرے قاضی صاحب فرماتے ہیں:

"سرور نے شعرا کے زمانۂ ولادت سے مطلقاً بحث نہیں کی۔ متعدد تذکرہ نگاروں کی یہ روش ہے کہ وہ شعر کی عمر بتاتے ہیں۔ سرؔور نے یہ بھی نہیں کیا۔ دو چار شعرا کے سنین وفات اس کے یہاں ملتے ہیں جن سے دو قطعاً غلط ہیں: سال وفات مرزؔا، سال وفات مظہؔر۔ بعض امور کے متعلق انھوں نے لکھا ہے کہ اسے اتنے برس گزر گئے (ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے)۔ لیکن چونکہ تذکرہ کم و بیش ۳۰ سال کی مدت لکھا گیا ہے۔ ان امور سے زمانۂ وقوع کی تعین اس سے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ س ہے کہ شکوہ علی شکوہ ۲۵ سال قبل فوت ہوئے (ص ۳۶۷) کب سے ۲۵ سال قبل؟ س سے اس کا پتا نہیں ملتا۔ سرؔور تاریخی شعور سے بیگانہ نہیں تو پھر شاید ہی دنیا کا کوئی شخص ہو جو اس سے بیگانہ قرار دیا جاسکے۔"(۱)

تعین زمانہ کے سلسلے قاضی صاحب نے جو کاوشیں کی ہیں، ان کی چند لیں ملاحظہ ہوں لکھتے ہیں:

تنہا شاگرد مصحفی نے تذکرۂ ہندی لکھا ہے کہ "عمر ش قریب بیست و ہفت رسیدہ" یہ تذکر ۱۱۹۹ھ یا ۱۲۰۰ھ شروع ہوا۔ اور ۱۲۰۹ ھ مکمل ہوا ہے۔ قطعۂ تاریخ وفات دیوان ناسخ تو نہیں، لیکن تذکرۂ ناصر ناسخ کے نام رج ہے۔ مادہ یہ ہے کہ: آج تنہا گیا دنیا سے عدم کو تنہا، ناصر نے سال وفات نہیں لکھا اور نہ یہ بتایا کہ اس کے اعداد کیا ہیں،

(۱) نشتر و سوزن۔ ص ۲۹۔ ۳۰

لیکن اس سے ۱۲۲۲ مستخرج ہوتا ہے۔ مصحفی کے مجموعۂ اشعار فارسی (ڈھاکہ) بھی ایک قطعہ ہے جس کی بیت آخر یہ ہے ؎

از سر آہ این نوا بخشید گنج معنی خاک پنہاں شد

عدد آخر سے ۱۲۷۸ نکلتا ہے۔ نوا کے اعداد ۵۷ خارج اور سر آہ یعنی الف کا ایک بڑھایا جائے تو ۱۲۲۲ ہوتا ہے قرائن بھی ۱۲۲۲ھ کی صحت کے مؤید ہیں۔"

(۲) عیشی = مصحفی نے ریاض الفصحا لکھا ہے کہ عیشی کی عمر ۳۰ سے متجاوز ہوگی۔ اگر ان کر ترجمہ ۱۲۲۱ھ مرقوم ہوا ہے جو قرین قیاس ہے تو سال ولادت ۱۱۹۰ھ کے لگ بھگ ہوگا۔ تذکرۂ ناصر ہے کہ "عین موسم (کذا) چراغ اس کی زیست کا باد صرصر ہیضۂ وبائی سے بجھ گیا۔ ناسخ کا ایک قطعہ دیا ہے جس کی آخری بیت یہ ہے:

گفت سالِ وفات و ناسخ ہائے افسوس اے سخنورِ من = ۱۲۴۰ھ

ایک اور قطعہ بھی ہے جس کا مصنف نہ معلوم کون ہے۔ اس کا مادہ ہے: ہائے ہیہات طالب علی خاں:

(۳) میر ضمیر مرثیہ گو = مصحفی نے ریاض الفصحا لکھا ہے کہ ضمیر کی عمر ۳۰ برس کی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ ان کا ترجمہ ۱۲۲۷ھ کے لگ بھگ مرقوم ہوا ہے۔ اس سے سال ولادت قیاس کیا جا سکتا ہے۔ حاتم علی مہر کے دیوان قطعۂ تاریخ وفات رج ہے۔ بیت آخری یہ ہے:

ہجری و عیسوی لکھی تاریخ جا کے حیدر سے مل ضمیر اب تو

حیدر ۲۲۲ + ضمیر ۱۰۵۰ = ۱۲۷۲ھ پورے ہے کے اعداد = ۱۸۵۵ء

Marfat.com

قاضی صاحب اور مرزا غالبؔ

کہا جاتا ہے کہ قاضی صاحب نے اپنی زندگی صرف ایک ہی عشق کیا اور وہ بھی مرزا غالبؔ سے۔ اس طرح غالبؔ ان کا پہلا اور آخری عشق ہیں۔ انھوں نے غالبؔ کے ساتھ فی الواقع محبوب کا سابرتاؤ کیا۔ وہ ان کی محبوب او. عزیز ترین شخصیت ہیں۔ ان کے ہر پہلو پر انھوں نے نظر ڈالی ہے، ہر زاویے سے انھیں دیکھا ہے، ان کے فکر و فن کا عمیق لعہ، ان کی نوکِ قلم سے نکلے ہوئے ہر ہر لفظ کو بغور پڑھا ہے، ایک ایک بار نہیں بلکہ کئی کئی بار، ان کا اردو کلام تقریباً پورا ہی انھیں ازبر تھا۔ اور فارسی کلام پر بھی کلی طور پر عبور حاصل تھا۔

قاضی صاحب کی شخصیت بے لوث بھی تھی اور بے لوچ بھی۔ وہ ظاہر داری، تصنع، اور بناوٹ کو یکسر ناپسند کرتے تھے، دروغ گوئی سے انھیں نفرت تھی۔ خوشامد، مصلحت بینی اور زمانہ سازی کا ان کے یہاں گزر نہ تھا۔ یہ ہی صفات وہ دوسرے لوگوں بھی تلاش کرتے تھے اور جہاں انھیں ناکامی ہوتی تھی، اور انھوں نے اپنا معیار اتنا بلند کر لیا تھا کہ ہر جگہ انھیں ناکامی ہوتی تھی تو پھر ان کی مایوسی اور دل شکستگی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ اور یہ ان کی مو نہ شان تھی کہ وہ ان خامیوں اور کمزوریوں کا برملا اظہار بھی کرتے تھے چاہے وہ اپنے عہد کی کتنی ہی عظیم شخصیت کے متعلق کیوں نہ ہوں۔ وہ ترازو کے دونوں پلڑوں کا یکساں استعمال کرتے تھے۔ ایک حسن، دوسرے قبح۔ ایک اوصاف، دوسرے خا ل اور کمزوریاں۔ نہ کسی کی خوبیوں کو دبانا، نہ خامیوں کے بیان کرنے لغے سے کام لینا۔ غالبؔ ان کی محبوب ترین شخصیت، لیکن ان کے لئے بھی ترازو کے دونوں پلے قاضی صاحب نے ہمیشہ تیار رکھے۔ مرزا غالبؔ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ محبوب شخصیت ہونے کے باوجود قاضی صاحب نے انھیں بھی نہیں بخشا۔ انھوں نے جہاں غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا اور علم کی وسعت کو سراہا وہیں ان کی کوتاہیوں اور خامیوں کو بھی بتایا بقول ڈاکٹر عابد رضا بیدار:

اچھے شاعر کے لئے رشید احمد صدیقی کے برعکس (قاضی صاحب) قطعی ضروری نہیں سمجھتے کہ وہ اچھا آدمی بھی ہو۔ خسروؔ، غالبؔ اور اقبالؔ تینوں کے سلسلے اپنے اس نظریے کا اطلاق پوری وضاحت کے ساتھ کرتے ہیں اور خسروؔ کی درباری داری غالبؔ کی ناراست گفتاری،

Marfat.com

اقبالؔ کی خوشامد اور اخلاقی کمزوریاں دوسرے لوگ چھپاتے ہیں، تاویلیں کرتے ہیں، قاضی صاحب انھیں، جیسے کہ وہ ہیں اسی صورت دیکھتے ہیں اور پیش کر دیتے ہیں۔ خسروؔ قطعی صوفی آدمی نہیں، بلکہ خاصے دنیادار تھے، غالبؔ موقع و مصلحت شناس، جھوٹے بددیانت، مالی معاملات کمزور طبیعت، خود غرض، کینہ پرور اور مجموعی طور پر خاصے احمق آدمی تھے۔ علمی اعتبار سے خاصے کورے تھے، اتنے کہ تاریخ کو اساطیر سے ممیز نہیں کر سکتے تھے۔ لغت کے میدان دخل ضرور دے پڑے حالانکہ وہ اس فن سے نابلد تھے......... یا اس قسم کی باتیں خسروؔ، غالب اور اقبالؔ کے بارے کہہ دینے کے بعد کوئی توقع نہیں رکھتا کہ صحرا نخلستان بھی آئے گا۔ لیکن جب قاضی صاحب ان ہی لوگوں کے بارے کہنے لگتے ہیں کہ مگر خسروؔ کی شاعرانہ عظمت کو ماننا پڑتا ہے۔

مگر ان امور سے غالبؔ کی شعری عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ مگر اقبال کی شاعری جو شعری کشش ہے وہ اپنی جگہ پر ہے تو وہ جو صرف سیاہی یا صرف سپیدی کے قائل ہیں، یہ سب کچھ ان کی ذہنی گرفت آتے آتے پھسل پھسل جاتا ہے۔"۔(۱)

قاضی صاحب نے غالبؔ پر بہت کچھ لکھا اور اپنی عمر کا بیشتر حصہ غالبؔ کے لیے، ان کے بارے تحقیق اور تنقید صرف کیا۔ کہا جاتا ہے کہ مصحفی سے متعلق تحقیق اپنی عمر لگادی۔ یہ صحیح ہے، لیکن جب ان کی توجہ غالبؔ کی طرف منعطف ہوئی تو پھر وہ ادھر ہی کے ہو رہے۔ اور پھر ان کی تحقیق و تنقید کا اصل میدان مرزا غالبؔ ہو گئے۔ باقی تمام موضوعات نے ثانوی حیثیت اختیار کر لی۔ قاضی صاحب نے غالبؔ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کی فہرست حسبِ ذیل ہے:

۱۔ استر اور غالبؔ

۲۔ برہان قاطع اور ہندوستان	نوائے ادب	بمبئی	(اکتوبر)	۱۹۶۳ء
۳۔ "	"	"	(اپریل)	۱۹۶۵ء
۴۔ تیغ تیز	فکر و نظر	علی گڑھ	(جولائی)	۱۹۶۱ء
۵۔ جہان غالبؔ	معاصر	پٹنہ	(حصہ ۲)	۱۹۵۱ء

(۱) معاصر۔ (قاضی عبدالودود نمبر۔۷۷-۱۹۷۶ء) ص ۳۰۶۔۳۰۷

Marfat.com

۶۔ جہانِ غالب	معاصر	پٹنہ	(حصہ ۳)	۱۹۵۲ء
۷۔ تبصرۂ خطوطِ غالب	"	"	(اکتوبر)	۱۹۴۳ء
۸۔ "	"	"	(جولائی)	۱۹۴۴ء
۹۔ تبصرۂ لعہ غالب مؤلفہ اثر لکھنوی	"	"	(حصہ ۷)	۱۹۵۴ء
۱۰۔ جہانِ غالب	"	"	(حصہ ۴)	۱۹۵۳ء
"	"		(حصہ ۹)	۱۹۵۶ء
"	"		(حصہ ۲۳)	
	لعہ	پٹنہ	(مئی۔جون)	۱۹۶۹ء
"	"		(مارچ۔اپریل)	۱۹۷۱ء
۱۱۔ خاش و خماش اور غالب	معاصر	پٹنہ	(حصہ ۱۲)	۱۹۶۰ء
۱۲۔ دیوانِ غالب کے دو نسخے	"	"	(حصہ ۱۴)	۱۹۵۸ء
۱۳۔ " "	"	،	(حصہ ۱۳)	۱۹۵۸ء
۱۴۔ غالب : پنج آہنگ	معیار	"	(جولائی)	۱۹۳۶ء
غالب کے دو لطیفے	"	"	"	"
سراپا سخن اور غالب	"	"	"	"
تذکرۂ سرور اور غالب	"	"	"	"
۱۵۔ غالب اور بہار	لعہ	"	(جنوری)	۱۹۶۵ء
۱۶۔ غالب اور تپش				
۱۷۔ غالب بحیثیت محقق	علی گڑھ میگزین		(غالب نمبر)	۱۹۴۸ـ۴۹ء
۱۸۔ " "	نقدِ غالب، مرتبہ مختار الدین احمد			
۱۹۔ غالب کے اشعار فارسی کا ایک مجموعہ	فکر و نظر	علی گڑھ	(اپریل)	۱۹۶۰ء
۲۰۔ غالب کے بارے میں بعض وضاحتی امور	نقوش	لاہور	(غالب نمبر)	۱۹۶۹ء
۲۱۔ غالب کے فارسی خطوط (ایک نیا مجموعہ)	ماہِ نو	کراچی	(فروری)	۱۹۶۲ء

Marfat.com

۲۲۔ غالب کے کلیات نظم فارسی کا قدیم ترین موجودہ نسخہ	مجلہ علوم الاسلامیہ	علی گڑھ	(دسمبر)	۱۹۶۰ء
۲۳۔ غالب کی غزل گوئی کے پانچ دور	لعہ	پٹنہ	(جنوری)	۱۹۶۹ء
۲۴۔ غالب نے اردو خط و کتابت کب شروع کی	"	"	"	"
۲۵۔ مکاتیب غالب	معاصر	پٹنہ	(مارچ)	۱۹۴۳ء
"	"	"	(اپریل)	"
"	"	"	(مئی)	"
۲۶۔ مکتوباتِ غالب	"	"	(اپریل)	۱۹۴۲ء
۲۷۔ نادر خطوطِ غالب	"	"	(جنوری)	۱۹۴۳ء
۲۸۔ نادراتِ غالب (تبصرہ)	"	"	(حصہ۲)	۱۹۵۱ء
۲۹۔ نئے مطبوعات ذکرِ غالب اشاعت ۲ (تبصرہ)	"	"	"	"
۳۰۔ نئے مطبوعات احوال غالب (تبصرہ)	"	"	(حصہ۳)	۱۹۵۲ء
۳۱۔ غالب کے خطوط صفیر بلگرامی کے نام	آج کل	(نئی د)	(اگست)	۱۹۵۲ء
۳۲۔ عہد شاہجہاں کا ایک ادبی مناقشہ اور غالب	معاصر	پٹنہ	(حصہ۵)	۱۹۵۴ء
۳۳۔ مجموعۂ د اور غالب	اردو	کراچی	"	۱۹۶۹ء
۳۴۔ لۂ افتتاحیہ بین الاقوامی غالب سیمنار منعقدہ نئی د			۱۵ر فروری	۱۹۶۹ء
قاطع برہان و رسائل متعلقہ از مرزا غالب، مرتبہ قاضی عبدالودود				۱۹۶۹ء

یہ تمام تحریریں متفرق رسالوں منتشر ہیں۔ اگر ان سب کو یک جا کر دیا جائے تو سیکڑوں صفحات بن جائیں گے اور غالب سے متعلق کئی جلدوں دائرۃ المعارف (EN-CYCLOPEDIA) مرتب ہو جائیں گی جس کا خواب قاضی صاحب نے دیکھا تھا اور جس پر جہانِ غالب کے عنوان سے انھوں نے کام بھی شروع کیا تھا جو متعدد قسطوں 'معاصر' پٹنہ

Marfat.com

وغیرہ رسائل شائع بھی ہوا لیکن یہ کام اتنا بڑا اور طویل تھا کہ فرد واحد کے لئے اسے پایۂ تکمیل کو پہنچانا ممکن نہیں تھا اور پھر جس پیمانے پر قاضی صاحب اس کام کو انجام دینا چاہتے تھے اس کے لئے عمر خضر درکار تھی۔ لہذا یہ کام تشنۂ تکمیل ہی رہ گیا۔ قاضی صاحب نے غالب سے متعلق جتنے مضا بھی تحریر فرمائے ہیں ان اہمیت افادیت اور ضخامت غرض ہر اعتبار سے سرفہرست رکھا ان کا طویل مضمون، 'غالب بحیثیت محقق' نظر آتا ہے۔ یہ مضمون پہلے علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر (۴۹-۱۹۴۸ء) شائع ہوا تھا۔ یہ میگزین کے ۴۲ صفحات پر محیط تھا۔ اس کے بعد یہ نقدِ غالب؛ مرتبہ مختار الدین احمد مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۵۶ء بھی شامل اشاعت ہوا۔ اس پر قاضی صاحب نے نظر ثانی کی، ترمیم و تنسیخ کی اور ضروری اضافے کیے۔ یہ اضافے کس نوع کے ہیں اس کا کچھ اندازہ اس بات سے ہی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب کے دو سو ستائس (۲۲۷) صفحات آیا ہے۔ گویا پورے مضمون کو از سر نو لکھ ڈالا۔ اس ترمیم شدہ مضمون کے شروع ہی آپ نے یہ اعلان فرمادیا کہ اسی عنوان سے جو مضمون علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر شائع ہوا تھا اسے اب کالعدم تصور کیا جائے۔ اور اس جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے انھیں بری الذمہ قرار دیا جائے۔ قاضی صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

"غالب بحیثیت محقق کے عنوان سے جو میرا ایک لہ علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر اشاعت پذیر ہوا، بہت عجلت لکھا گیا تھا۔ اور اس اغلاطِ طباعت بھی بہ کثرت تھے۔ میری استدعا ہے کہ یہ کالعدم سمجھا جائے اور مجھے اس کے متعلق ہر قسم کی ذمہ داری سے بری قرار دیا جائے۔ لہٰذا کا عنوان وہی ہے، لیکن یہ از سر نو لکھا گیا ہے۔ اگر اس کوئی بات پہلے لے سے مختلف طور پر ملے تو یہ خیال کرنا چاہئے کہ راقم کے نزدیک اسی طرح صحیح ہے۔ لیکن کسی بات کا جو پہلے لے تھی، لہٰذا یک قلم نہ پایا جانا لازماً اس لئے نہیں کہ وہ غلط تھی۔ اس لے کی ضخامت پہلے سے تگنی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہو گئی۔ مگر اس پر بھی بہت سے سخنہائے گفتنی رہ گئے اور بہت سے مات جہاں تفصیل کی ضرورت تھی،

Marfat.com

اجمال سے کام لیناپڑا ہے۔ موضوع کا حق جب تک کم از کم تین سو صفحے اس کے لئے وقف نہ کئے جائیں ادا نہیں ہو سکتا"۔

اس طویل کتاب لے جو ضخامت کے اعتبار سے مکمل کتاب کا حکم رکھتا ہے۔ مرزا غالب کی ادبی اور لسانی تحقیقات کا جائزہ لیا گیا ہے لیکن حسب معمول قاضی صاحب نے تحسین کے بلے تنقید اور اعتراضات پر زیادہ زور دیا ہے اور کہیں کہیں تنقید لہجہ اتنا تلخ ہو گیا ہے کہ اس سے محسوس ہوتا ہے گویا یہ پورا لہ نکتہ چینی اور اعتراض کرنے کے لئے ہی لکھا گیا ہو۔ اس بنیادی طور پر 'غالب کی عبارات' اور طریق استدلال وغیرہ پر اعتراضات ہیں اس پورے لے کو قاضی صاحب نے اصلاً بارہ فصلوں تقسیم کیا ہے۔ اور موضوع کے اعتبار سے درجہ بندی کر کے غالب کی معلومات کا جائزہ لیا ہے۔ ان پہلی اور دوسری فصل ایرانِ قدیم کی زبان اور تاریخ سے متعلق ہے۔ تیسری اور چوتھی فصل غالب کی فارسی فرہنگوں سے واقفیت سے بحث ہے۔ اس قاضی صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ غالب کو اس نوع کی فرہنگوں سے قطعاً واقفیت نہیں تھی۔ پانچویں فصل خاصی طویل ہے۔ اس یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ فارسی ادب پر غالب کی نظر کتنی وسیع تھی اور کہاں تک اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، نیز یہ کہ کلاسیکی شعرا سے وہ کس قسم کی واقفیت رکھتے تھے، مختلف ادوار، مختلف طبقات اور مختلف علاقوں کی فارسی سے وہ کس حد تک باخبر تھے، قواعدِ زبان سے متعلق ان کی معلومات کس نہج کی تھیں۔ چھٹی فصل غالب اور فنون ادبیہ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ساتویں فصل منطق، فلسفہ، تصوف اور علمِ نجوم سے غالب کی واقفیت، بلکہ عدم واقفیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آٹھویں فصل غالب کی عربی دانی اور نویں فصل غالب کی ترکی زبان مہارت سے بحث کی گئی ہے۔ دسویں فصل نسبتاً مختصر ہے۔ اس اردو زبان سے متعلق غالب کی محققانہ واقفیت کا ذکر ہے۔ گیارہویں فصل ان کے اسلوبِ نگارش کی پیچیدگی کو اجاگر کیا ہے اور بارہویں فصل غالب کے قول و فعل تضاد کی نشاندہی کی گئی ہے۔

قاضی صاحب نے مرزا غالب پر کس نوع کے اعتراضات کئے ہیں اس کا اندازہ اس عبارت سے ہو جاتا ہے جو انھوں نے لہ کی تمہید کے طور پر تحریر کی ہے۔ سب معلوم

Marfat.com

ہوتا ہے کہ ذیل اس کے کلیدی حصے پیش کر دیے جائیں تاکہ آئندہ صفحات پیش کیے جانے والے حث کے سیاق و سباق کا کام دے سکیں۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں :

غالب نے اپنی ایک فخریہ رباعی(۱) اپنے کلیاتِ نظمِ فارسی کی نسبت کہا ہے کہ اگر شاعری مذہب ہوتی تو یہ اس کی ایزدی کتاب ہوتا۔ قاطع برہان کے بارے جس پر ایک محقق کی حیثیت سے ان کی شہرت کا مدار ہے، انھوں نے اتنی بڑی بات تو نہیں کہی لیکن یہ دعویٰ ضرور کیا ہے کہ اس کا پایۂ تحقیق اتنا بلند ہے کہ اس سے بڑھ کر متصور نہیں (معلّٰی ص ۴۰۸) خود اس کتاب انھوں نے بہ بانگِ دُہل اس کا اعلان کیا ہے کہ ہندوستان کے فارسی دانوں میرے سوا کوئی مستند نہیں۔ اس دعویٰ انا و لا غیری کے وجوہ خود ان کے الفاظ یہ ہیں :

خود ہندوستان زا بودن و ہندوستان زایانِ دگر را ہم در فرہنگ و ہم در نظم مسلم نداشتن و خود علم پندارِ زباندانی افراشتن چہ معنی دارد ؟...... من می گویم کہ نیاے من از ماوراء النہر بود و پدر م درد پیکر پذیرفت و من در آگرہ منشور ہستی یافتم حاشا کہ خود را از اہل زبان گیرم۔ زبان دانی من بغرۂ سہ فروزۂ خدا آفرید و سہ گوہر ازل آورد است : نخست سلامتِ طبع کہ غلط را نمی پذیرد و جز براستی آرام نمی گیرد۔ دوم سبتِ آں طبع غلط پسند جز براستی پیوند با پارسی زباں۔ سہ دیگر احراز دولت دیدار تہسار ہرمزد (و) و افران کمال و دانش اندوختن از وے تا دو سال سپس گذشتن بر باستانی نامہا و نشاط و ورزیدن از اں شور انگیز شور امہا" (ص ۱۳۱)۔

اقتباس بالا غالب اپنا شمار اہل زبان کرنے سے صریحاً انکار کرتے ہیں لیکن ذیل کے الفاظ بھی خود ان کے قلم سے نکلے ہیں :

"بندہ ہندی مولد و پارسی زباں ہے (عود ص ۱۸۶) مرتا ہوں مجھے سمجھاتے ہو کہ صد جا در کلام اہل زبان خواہند یافت"۔ مگر بانی کلام اہل زبان نہیں"۔

غالب نے اپنے ایک خط وہ 'تفاوت' دکھایا ہے جو ان اور اہل زبان ہے مگر انھوں اس موقع پر معاصر ایرانیوں کو اس طرح نظر انداز کیا ہے کہ گویا ان کا وجود ہی نہیں۔ اہل

---

(۱) وہ رباعی یہ ہے۔

گر ذوق سخن بہ دہر آئیں بودی
دیوان مرا شہرتِ پرویں بودی
غالب اگر ایں فن سخن دیں بودی
آں دین را ایزدی کتاب ایں بودی

Marfat.com

پارس سے صریحاً ان کی مراد ایرانی بزرگانِ سلف ہیں جن کی نظم و نثر کا سکہ ہند میں بیٹھا ہوا تھا۔
غالبؔ یہ کہتے ہیں کہ میں اپنا شمار اہل زبان میں نہیں کرتا تو اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میری مادری زبان فارسی نہیں اور جب یہ فرماتے ہیں کہ میں پارسی زبان ہوں تو ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ فارسی سے اپنی طبعی مناسبت اور تتبعِ کلام اساتذہ کی بدولت وہ کسی ایرانی سے کم نہیں۔
کلیات کے بارے میں جو رباعی ہے تعلّی شاعرانہ سمجھ کر نا قابل اعتنا قرار دی جا سکتی ہے لیکن نثر میں اپنے متعلق غالبؔ نے جو دعوے کیے ہیں۔ اسی صورت میں نظر انداز کیے جا سکتے ہیں جب غالبؔ مرفوع القلم تصور کیے جائیں۔ مقالہ ہٰذا کی علت غائی یہ دکھانا ہے کہ غالبؔ کے دعاوی حقیقت سے کس قدر مطابقت رکھتے ہیں"۔
مرزا غالبؔ نے محمد حسین تبریزی کی فرہنگ 'برہانِ قاطع' پر بہت سے اعتراضات کیے تھے اور ان کو کتابی شکل دے کر قاطع برہان کے نام سے شائع کرا لیا تھا۔ اس پر بڑی معرکہ آرائی ہوئی۔ لوگوں کو غالبؔ کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی جس کے نتیجے میں جواب اور جواب الجواب لکھے گئے اور 'قاطع القاطع' اور محرقِ قاطع وغیرہ کتبِ لغات وجود میں آئیں۔ غالبؔ کی حیات میں ایک طویل عرصے تک موافقت اور مخالفت کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ بالآخر اس پوری بحث نے انتہائی تکلیف دہ صورت اختیار کر لی اور جانبین کو درِ عدالت تک کو دستک دینی پڑی۔ اس کے بعد وقتی طور پر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ لیکن اس کے کم و بیش ایک سو سال بعد قاضی عبدالودود نے اسے پھر چھیڑا اور غالبؔ نے جو اعتراضات مؤلف برہان قاطع پر کیے ہیں ان کا جائزہ 'غالبؔ بحیثیت محقق' میں لیا اور جتنی سخت زبان مرزا غالبؔ نے محمد حسین تبریزی کے لیے استعمال کی تھی، اس سے بھی زیادہ سخت لہجے میں غالبؔ کے اعتراضات کی تردید کی۔ قاضی صاحب نے طویل مضمون میں غالبؔ کی فرہنگ نویسی سے دلچسپی اور 'برہانِ قاطع' پر انھوں نے جو اعتراضات کیے ہیں ان کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس کی تلخیص ان الفاظ میں پیش کی جا سکتی ہے:
(۱) غالبؔ کے نزدیک فرہنگوں میں مشہور الفاظ کا شمول مناسب نہیں، مگر عہدِ حاضر کو غالبؔ سے اتفاق نہیں۔ مرزا محمد قزوینی غالبؔ کے ہم نواؤں کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ان کے نزدیک مشہور ہے، وہی تمام لوگوں کے

Marfat.com

نزدیک بھی مشہور ہو گا اور جو کچھ ان کے شہر میں عام ہے بعینہٖ وہی دوسرے مقامات پر بھی عام ہو گا۔ اسی طرح جو کچھ ان کے عہد میں معروف اور رائج ہے وہی مستقبل میں بھی اسی طرح قبول عام کا حامل رہے گا۔

(۲) غالبؔ کی رائے ہے کہ وہ استعارے اور کنائے جو کسی شاعر نے استعمال کئے ہیں اور وہ مبتذل نہیں ہونے پائے ہیں، انھیں فرہنگوں میں شامل نہیں کیا جانا چاہے۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ اعتراض درست ہے مگر ہندوستان میں جو فرہنگیں لکھی گئی ہیں ان میں سے بیشتر کا مقصد درسی کتابوں کی تفہیم میں مدد پہنچانا تھا اسی لئے ان کی حیثیت کلاسیکی فارسی ادب کی تشریح کی تھی۔ چنانچہ فرہنگ قواس کی تدوین کی غرض و غایت شاہنامے کی دشواریوں کی حل کرنا تھی۔ فرہنگ شیر خانی، دیوان حافظ، کمال اسمٰعیل، قاسم انوار، سلمان ساؤجی، مسعود بک، خمسۂ نظامی، کلیات خسرو، شاہنامۂ فردوسی، گلستان و بوستان سعدی، سلسلۃ الذہب، وغیرہ متون کو سمجھنے کے مقصد سے تالیف کی گئیں۔ اسی طرح محمد لاد کی موید الفضلا بھی اصلاً شاہنامہ فردوسی، خمسۂ نظامی ستہ سنائی، خاقانیؔ، انوریؔ، ظہیرؔ فاریابی، عبہریؔ حافظؔ شیرازی، سلمان ساؤجی، سعدیؔ شیرازی اور امیر خسروؔ کے دیوانوں کی مشکلات کو حل کرنے میں مدد فراہم کرنے کی غرض سے تالیف کی گئی۔ اس سے بقول قاضی صاحب یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غالبؔ نے ہندوستانی فرہنگ نویسوں کے مقصد اور مطمحِ نظر کی تہہ تک پہنچنے کی سنجیدگی سے کوشش نہیں کی لہذا انھوں نے برہان قاطع پر جتنے اعتراضات کئے ہیں وہ سب غلط اور بے بنیاد ٹھہرتے ہیں۔

(۳) غالبؔ کا اعتراض ہے کہ برہان قاطع میں محمد حسین تبریزی نے سند نہیں دی۔ اس سلسلے میں قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ اس کی وضاحت مؤلف نے برہانِ قاطع کے دیباچہ میں کر دی ہے کہ سند دینے سے صرف اختصار کی خاطر احتراز کیا ہے۔ غالبؔ اس طرف توجہ کرنے سے قاصر رہے۔

(۴) برہان قاطع میں اصل متن کے بعد کتاب کے اختتام پر 'متفرقات' کے عنوان سے کچھ لغات درج ہیں غالبؔ کا کہنا ہے کہ ان لغات کو جداگانہ حیثیت سے لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ قاضی صاحب غالبؔ کے اس اعتراض کو درست مانتے ہیں۔

Marfat.com

(۵) غالبؔ کا کہنا ہے کہ تمام مصادر کے مشتقات کا ذکر غیر ضروری ہے۔ صرف مصدر کے معنی بتا دینا ہی کافی ہے قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ مرزا غالبؔ کا یہ اعتراض درست نہیں۔ان کا فرمانا ہے کہ یہ فرہنگ کا لازمہ نہیں، قواعد کی کتاب کا خاصہ ہے۔ کوئی جدید فرہنگ اس ڈھنگ سے مرتب نہیں ہوئی۔

(۶) غالبؔ کا کہنا ہے کہ ایک لغت کی جتنی بھی شکلیں ہیں، وہ سب ایک جگہ درج کی جانی چاہئیں۔ قاضی صاحب غالبؔ کی اس بات سے بھی اختلاف کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ عہد حاضر کی کسی فرہنگ کی ترتیب بھی ان اصول پر نہیں ہوئی۔

(۷) غالبؔ کا اعتراض ہے کہ بہت سے لغات محض تصحیف کی بدولت برہان میں داخل ہو گئے ہیں۔ یہ بالکل بجا ہے کہ مگر یہ اعتراض ایرانی فرہنگ نگاروں پر بھی عائد ہوتا ہے۔ برہان کو جس لغت کی جتنی شکلیں ملیں اس نے سب درج کر دیں اور یہ بتانے کی ضرورت نہ سمجھی کہ صحیح شکل کیا ہے۔ مگر غالبؔ نے ان الفاظ کی نشاندہی میں جن کی متعدد شکلیں برہان میں ملتی ہیں۔ ذہانت کا ثبوت پیش کیا ہے، لیکن اصل اور محرف صورتوں میں امتیاز کے لئے جس علم کی ضرورت اور جو فنی بصیرت درکار تھی، وہ نہ صاحبِ برہان میں تھا اور نہ غالبؔ میں۔ بہر حال غالبؔ پر یہ راز نہ کھلا کہ ان ساری تحریفات کی جڑیں دور تک گئی ہیں۔ انھوں نے یہ سمجھا کہ یہ سارا طوفان بد تمیزی صاحبِ برہان کا برپا کردہ ہے۔ وہی تصحیفات کا موجد ہے حالانکہ واقعہ ایسا نہیں ہے۔ غالبؔ نے تصحیفات کی نشاندہی تو کی لیکن اصل اور محرف صورتوں کے امتیاز میں صاحبِ برہان ہی کی طرح ناکام رہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ برہان قاطع اپنے عہد کی مقبول ترین فرہنگ تھی اور ادبی حلقوں میں اسے سند کا درجہ حاصل تھا۔ ممکن ہے کہ اس کا مقبول خاص و عام ہونا ہی مرزا غالبؔ کے لئے حسد کا باعث بنا ہو۔ اس میں وہ خوبیاں موجود ہیں جو اس عہد تک لکھی جانے والی کسی دوسری فرہنگ میں نہیں ملتیں۔ مثلاً یہ کہ اس میں جتنے الفاظ کا احاطہ کیا گیا ہے، کسی دوسری فرہنگ میں نہیں کیا گیا۔ اس طرح یہ اپنے عہد کی ضخیم ترین کتابِ لغت قرار پاتی ہے۔ اسی کے ساتھ اس میں الفاظ کے معنی ترتیب وار درج ہوئے ہیں اور جتنی تفصیل معنی کی اس

Marfat.com

میں ملتی ہے کسی اور فرہنگ میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ برہانِ قاطع میں اکثر الفاظ کا تلفظ بھی مل جاتا ہے جس کا کم فرہنگوں نے اہتمام کیا ہے۔ پھر اس میں الفاظ کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے۔ اس سے قبل کسی بھی فرہنگ میں یہ ترتیب اتنی محکم نہیں ملتی۔

لیکن ان تمام صفات کے باوجود برہان قاطع غلطیوں اور خامیوں سے منزہ و پاک نہیں۔ چنانچہ علمائے ادب نے ان کے سلسلے میں محمد حسین تبریزی کی گرفت بھی کی ہے۔ ان ناقدوں میں سب سے اہم سراج الدین علی خاں آرزو ہیں۔ آپ نے اپنی معرکۃ الآرا تالیف 'سراج اللغۃ' میں ان خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس طرح مرزا غالبؔ ہی واحد شخص نہیں جنھوں نے برہان قاطع کی غلطیوں کی گرفت کی۔ قاضی صاحب نے اپنے زیر بحث مقالہ 'غالبؔ بحیثیت محقق' میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے گویا مرزا غالبؔ ہی واحد شخص ہیں جنھوں نے برہانِ قاطع پر اعتراضات کئے ہیں اور بالتحقیق یہ بھی ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ غالبؔ کے تمام اعتراضات نامناسب اور غلط ہیں۔ قاضی صاحب کے اس رویہ کو اکثر علمائے ادب نے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ کچھ حضرات نے اپنی ناراضگی کا اظہار برملا کیا، کچھ نے صرف زیر لب، اور کچھ صرف ناک بھوں چڑھا کر رہ گئے۔ ان پر قاضی صاحب کی شخصیت اور قابلیت دونوں کا رعب غالب تھا۔ جن حضرات نے برملا تنقید کی، ان میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کا نام نامی اور اسم گرامی سر فہرست ہے۔ آپ نے "ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں" کے عنوان سے ایک طویل مضمون سپردِ قلم کیا جو سہ ماہی 'اردو ادب' علی گڑھ میں قسط وار شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے قاضی صاحب کے پورے مقالے کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور مرزا غالبؔ پر کیے گئے بیشتر اعتراضات کو غیر ضروری اور غلط ثابت کیا ہے۔ اس کی تمہید میں سبزواری صاحب تحریر فرماتے ہیں :

"قاضی صاحب نے اپنے مقالے میں غالبؔ کی لغوی، ادبی، فنی، تاریخی اور مذہبی معلومات کا جائزہ لیا ہے۔ اور ان کی کچھ غلطیاں دکھائی ہیں۔ قاضی صاحب کو اصرار ہے کہ غالبؔ نرے شاعر، انشا پرداز اور ادیب تھے۔ زبان دانی اور تحقیقِ لغات سے ان کو کیا نسبت۔ ان کے ہم عصر اور پیشرو سبھی ہندوستانی فارسی داں فارسی دانی میں ان سے بہ مراتب بہتر ہیں۔ انھوں نے قانون دانوں کا سا فیصلہ دیا ہے" ان کے

Marfat.com

معلومات اتنے قلیل، ان کے اغلاط اتنے مختلف النوع اور کثیر التعداد ہیں کہ بزمِ محققین کی صفِ نعال میں بھی ان کے لئے جگہ نکالنا مشکل ہے"۔ اس کی وجہ ان کے نزدیک تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی یعنی وہ شاعر تھے اور بہت شاذ و نادر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص شاعر اور محقق بھی ہو"۔ دوسرے ان کی باقاعدہ تعلیم زیادہ نہیں ہوئی۔ تیسرے "ان میں اعوجاجِ ذہن، ضعفِ حافظہ، خود پرستی، ناتواں بینی، بے پروائی، سہل انگاری اور ضد انتہائی درجہ کی ہے"۔ ساری بحث میں ایک بات کانٹے کی ہے۔ قاضی صاحب مانتے ہیں کہ غالبؔ شاعر تھے۔ انھیں یہ بھی تسلیم ہے کہ وہ ادیب اور انشا پرداز تھے بلکہ 'ادبی حیثیت سے ہندوستان کے مشہور فارسی داں عبدالرشید، آرزوؔ، وارستہ، بہارؔ، قتیلؔ اور صہبائیؔ میں سے کوئی بھی غالبؔ کا مقابل نہیں"۔ لیکن پھر بھی وہ نہ فارسی جانتے ہیں نہ اردو، نہ انھیں عربی آتی ہے نہ ترکی"۔ عروض سے بہت ہی محدود واقفیت رکھتے ہیں۔ فنِ قافیہ سے متعلق ان کی معلومات بہت ناقص ہیں۔ ان کی معلومات عامہ بھی بہت کم ہیں"۔ یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ جسے زبان نہیں آتی، جو فنِ عروض کی بہت محدود واقفیت رکھتا ہے، جس کی معلوماتِ عامہ بہت کم ہیں وہ بڑا شاعر اور ادیب کیسے ہوا۔ بہ ظاہر قاضی صاحب کی خفگی غالبؔ سے اس لئے ہے کہ اس نے شعر و ادب کے ایوان سے نکل کر تحقیق کے میدان میں قدم رکھا۔ قاضی صاحب کو اس کا اعتراف ہے کہ اس غریب نے "ایران قدیم اور زبان اردو معلّٰی سے محققانہ واقفیت کا نہ کبھی دعویٰ کیا اور نہ عربی جاننے کا اقرار ہی۔ بلکہ اس کے برعکس انھیں ایک طرف اگر "ترکی سے اپنی کامل ناواقفیت کا اقرار تھا"۔ تو دوسری طرف "زبان علمی ہند سے مطلق واقف نہ ہونے کا اعتراف بھی۔ کیا مزے کی بات ہے کہ غالبؔ ان تمام خاکسارانہ اعترافات کے باوجود 'خود پرست' اور نہ معلوم کیا کیا ہیں لیکن قاضی صاحب جو ہر شخص کو جاہل، بے خبر اور ناواقف بتاتے ہیں، محقق ہیں۔ غالب کو تو انھوں نے علم و فن اور زبان و ادب کے مسائل سے بے خبر بتایا ہی تھا، انجمن آرائے ناصری کے مصنف کو بھی انھوں نے نہ چھوڑا۔ اور تحقیق کے زور میں اس کے متعلق

Marfat.com

بھی لکھ مارا "فن قافیہ سے انجمن آرا کا مصنف بھی ناواقف معلوم ہوتا ہے۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں — تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں (۱)

اس کے بعد سبزواری صاحب نے مرزا غالب کی محققانہ حیثیت کو اجاگر کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ اعلیٰ تحقیقی ذوق رکھتے تھے اور اس سے انھیں خصوصی شغف تھا۔ ان کی تحقیق کا معیار بہت بلند تھا۔ وہ نہ خود پرست تھے، نہ خود بیں اور نہ کسی کے مقلد۔ ان کا اپنا ایک مخصوص انداز تھا اور اس طرز کے وہ خود ہی موجد تھے۔ لہٰذا ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ نرے شاعر اور انشا پرداز تھے اور تحقیق سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں سراسر غلط اور غالب کے ساتھ ناانصافی ہے۔ ڈاکٹر سبزواری کے الفاظ میں :

اس مقام پر یہ عرض کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ غالب، جیسا کہ قاضی صاحب کا خیال ہے خود بیں یا خود پرست نہ تھے، وہ صحیح معنی میں محقق تھے۔ تحقیق ان کو ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی۔ اس راہ میں وہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی مرعوب نہ ہوئے۔ شخصیت پرستی راہِ تحقیق میں سب سے بڑی چٹان ہے تقلید شخصیت پرستی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ وہ اہلِ علم کی قدر و منزلت نہیں کرتے یا ان کے رتبہ شناس نہیں۔ ان پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے فرہنگ نگاروں اور لغت نویسوں کے مستند ہونے سے انکار کیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ اپنے کو ان سے زیادہ مستند سمجھتے تھے یا ان کی تحقیر کرتے تھے۔ زبان اور اس کے محاورات کے باب میں دراصل اہلِ زبان کے سوا وہ کسی کو مستند ہی نہ جانتے تھے اور کسی نزاعی مسئلہ پر غیر زبان دان کے کسی استعمال کو سند ہی نہ مانتے تھے۔ اس کا ایک ثبوت تو وہ استفتا ہے جو انھوں نے اہل علم سے کیا تھا۔ اس میں ایک سوال یہ بھی تھا "لغتِ فارسی کی حقیقت اور حروف کی حرکت میں فردوسی اور خاقانی سچے ہیں یا ہندوستانی فرہنگ لکھنے والے"۔ مطلب یہ ہے کہ فردوسی اور خاقانی اہلِ زبان ہیں ان کے مقابلے میں ہندوستان کے کسی فرہنگ نگار کا قول سند نہیں۔ دوسرا ثبوت یہ ہے کہ غالب جب رامپور گئے تو وہاں ایک فارسی داں خلیفہ احمد علی نے عرفی کے دو شعروں پر زبان اور محاورے سے متعلق کچھ اعتراضات کئے۔ مرزا نے عرفی کی حمایت کی۔ اس سلسلے میں مرزا نے خلیفہ صاحب کو جو خط لکھا اس میں یہ بھی

(۱) اردو ادب علی گڑھ۔ جلد ۲۔ شمارہ ۳ (جنوری ۱۹۵۲ء۔ ص ۵۲۔ ۵۳

Marfat.com

تھا: گوش کا استعمال انداختن کے ساتھ اگر شعراء ہند کے کلام میں آیا ہو تو ہم اس کی سند اہل زبان کے کلام سے ڈھونڈ ھتے ہیں، جب وہ خود عرفی نے لکھا ہے تو ہم سند اور کہاں سے لائیں۔ قواعدِ زبانِ فارسی کا ماخذ تو ان حضرات کا کلام ہے۔ جب ہم ان ہی کے قول پر اعتراض کریں گے تو اس اعتراض کے واسطے قاعدہ کہاں سے لائیں گے...... عرفی کی زبان سے جو نکل جائے وہ سند ہے۔ ہمارے واسطے وہ قاعدہ محکم ہے، وہ مطاع ہے اور ہم اس کے مقلد اور مطیع ہیں"۔

اسی ضمن میں سبزواری صاحب نے لفظ تحقیق سے محققانہ بحث کی ہے اور اسی ذیل میں یہ ثابت کیا ہے کہ صحیح معنی میں محقق کسے کہتے ہیں۔ وہ قاضی صاحب کو محقق ماننے کے لئے کسی طرح تیار نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ صرف ناقل ہیں جب کہ مرزا غالب حقیقی معنی میں محقق تھے۔ یہاں وہ قاضی صاحب کے رویے کی ردِ عمل میں افراط و تفریط کا شکار ہو گئے ہیں۔ خود قاضی صاحب بھی ہمیشہ اس کا شکار رہے۔ پروفیسر سبزواری فرماتے ہیں:

"یہاں یہ بھی صاف ہو جانا چاہئے کہ محقق کسے کہتے ہیں اور تحقیق کس چیز کا نام ہے۔ تحقیق کے معنی ہیں حقیقت کو پانا اور محقق کہتے ہیں جو پائے حقیقت کو۔ طلب، جستجو اور تفحص تحقیق کے اسباب ہیں۔ یہ الفاظ قریب قریب ہم معنی ہیں۔ کسی بات کی تہہ تک ہم کھود کرید کر اور چھان بین ہی سے پہنچتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں لیکن چھان بین یا کھود کرید دریافت حقیقت کا ذریعہ ہے، خود حقیقت یا اصلیت تک ہماری رسائی نہیں ہو پاتی۔ اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ طلب و جستجو کے بغیر ہم بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔ یہ بالکل اسی طرح اور اتنی تیزی کے ساتھ ہوا۔ جیسے بادلوں سے بجلی کوندتی ہوئی ادھر سے ادھر نکل جائے اور آن کی آن میں آسمان کی ساری فضائیں روشن ہو جائیں۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو حاصل ہے اور جنھیں حاصل ہے وہ روشن طبع اور نابغہ ہیں۔ ان میں ایک خاص قسم کا ذوق اور ایک خاص طرح کا ملکہ ہوتا ہے۔ غالب ان ہی لوگوں میں تھے۔ وہ روشن طبع، ذہین اور صحیح ذوق کے مالک تھے۔ صحیح چیز کے پرکھنے کا ان میں ایک خاص جوہر تھا۔ تحقیق کے لئے بہت کم ان کو چھان بین کی ضرورت پڑتی تھی۔ زبان اور اس کے متعلق مسائل کے بارے میں ان کا ذوق ہی جو بڑا رچا ہوا اور پاکیزہ تھا، ان کا رہنما تھا۔ اردو تو ان کی اپنی زبان تھی، فارسی میں بھی وہ بالکل اہلِ زبان کا سا ذوق رکھتے تھے۔

Marfat.com

دوسرے لوگوں کی معمولی لغزشیں بھی ان کو کھٹک جاتی تھیں۔ غالب نے سلامتِ طبع اور استقامتِ ذہن کی اس کیفیت کو ایک خط میں نفس مطمئنّہ سے تعبیر کیا ہے"۔ اس کے بعد ڈاکٹر شوکت سبزواری نے قاضی صاحب کے ایک ایک اعتراض کا بالترتیب جواب دیا ہے اور ان میں سے بیشتر کو غیر ضروری، نامناسب اور غلط قرار دیا ہے۔ مثلاً غالب عربی نہیں جانتے تھے۔ اس کا اعتراف خود غالب نے بھی کیا ہے۔ اس کو بنیاد بنا کر قاضی صاحب نے غالب کے متعلق یہاں تک لکھ دیا کہ :"صرف و نحو کی ان اصطلاحوں کے صحیح مفاہیم بھی نہیں جانتے ہیں جس سے مبتدی تک آشنا ہیں"۔(۱)

اس پر سبزواری صاحب لکھتے ہیں :

"غالب عربی زبان کے محقق نہ تھے۔ انھوں نے خود لکھا ہے "اس زبان کے لفظ کا محقق نہیں ہوں۔ علماء سے پوچھنے کا محتاج اور سند کا طلب گار رہتا ہوں"۔ مگر جاہل محض انھیں نہیں کہا جاسکتا۔ ان کے متعلق یہ لکھنا کہ : صرف و نحو کی اصطلاحوں کے صحیح مفاہیم بھی نہیں جانتے جن سے مبتدی تک آشنا ہیں"۔ ان کے اوپر یہ الزام لگانا کہ "معمولی لفظوں کو بے محل استعمال کرتے ہیں"۔ اُن کے ساتھ سب سے بڑی نا منصفی ہے۔ قاضی صاحب ذرا دل میں انصاف فرمائیں ۔ وہ غالب کے یہ لکھنے پر کہ "برہان لفظ لولو بمعنی مروارید سے واقف نہیں۔ یہ کیسے آپے سے باہر ہوئے تھے۔ انھوں نے اسے برہان کی بالارادہ تحقیر قرار دیا تھا۔ اور اس کے جواب میں لکھا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ برہان لولو بمعنی مروارید سے واقف نہ ہو۔ "آب' کے تحت اس نے یہ الفاظ لکھے ہیں :و کنایہ از لولو و جواہر'۔ قاضی صاحب کے اس جواب کو معیار قرار دے کر ان کے اعتراضات کا جائزہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا"۔(۲)

من جملہ اور اعتراضوں کے قاضی صاحب کا غالب پر ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ انھوں نے ہر جگہ حرف کے بجائے لفظ کا استعمال کیا ہے۔ گویا حرف اور لفظ میں جو معنوی فرق ہے، غالب اس سے باخبر نہیں یا کم از کم غیر محتاط ضرور ہیں۔ ڈاکٹر سبزواری اس اعتراض کا جواب

---

(۱) اردو ادب علی گڑھ۔ جلد ۲۔ شمارہ ۳ (جنوری) ۱۹۵۲ء۔ ص ۵۳

(۲) اردو ادب علی گڑھ۔ جلد ۲۔ شمارہ ۳ (اپریل) ۱۹۵۲ء۔ ص ۲۷

Marfat.com

دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

سب سے پہلا اعتراض قاضی صاحب کا یہ ہے کہ غالبؔ نے حرف کی جگہ لفظ لکھا ہے۔ زعامتِ لفظِ سومین وچار مین ہر لغت، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حرف اور لفظ میں فرق نہیں کرتے۔ غالبؔ نے نظم ونثر فارسی واردو میں بے شمار مقامات پر لفظ و حرف استعمال کیا ہے اور دونوں میں فرق کیا ہے۔ قاضی صاحب اگر انصاف فرماتے اور مرزا غالبؔ کی بالارادہ "تحقیر" ان کے مدنظر نہ ہوتی تو وہ اس غریب پر یہ بہتانِ عظیم نہ باندھتے۔ غالب نے مرزا یوسف علی عزیزؔ کو ایک خط لکھا ہے اس میں وہ فرماتے ہیں:

"لام الف حرف منفردہ میں نہیں "ایک دوسرے خط میں جو ضیاء الدین خاں کے نام ہے۔ یہ جملہ ہے: بے شبہ وہ الفاظ پارسی ہوں گے"۔ ان میں سے پہلا خط ۱۸۵۶ کا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ برہانِ قاطع کا نزاع کھڑا نہیں ہوا تھا۔ ان خطوط کے عکس غالبؔ نمبر ـــ میں موجود ہیں۔ ان عبارتوں کے بعد بھی قاضی صاحب یہی فرمائیں گے کہ غالبؔ حرف کے معنی نہیں جانتے یا حرف ولفظ میں فرق نہیں کرتے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں لفظ بے محل استعمال ہوا ہے۔ یہ حرف کا مقام تھا۔ اس کے ماننے میں مجھے تامل نہیں۔ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ غالبؔ کے مذکورہ بالا جملے میں لفظ کے اصطلاحی معنی مراد لئے جائیں، اس کے اصلی اور لغوی معنی بھی تو ہیں، وہ مراد لئے جائیں۔ خود قاضی صاحب نے 'پارچہ جامہ' پر غالب کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے یہی لکھا ہے "پارچہ = پارہ + چہ ہے۔ پارچہ جامہ میں کوئی خرابی نہیں۔ پارچہ کا استعمال کپڑے کے لئے بعد کی بات ہے۔ یہ اس کا مانع نہیں کہ لفظ اپنے اصلی معنی میں مستعمل ہو"۔ ٹھیک اسی طور پر یوں کہیے کہ لفظ کے معنی ہیں 'بول جو منہ سے نکلے'۔ الف، با، تا وغیرہ حروف کو لفظ کہنے میں کوئی خرابی نہیں۔ لفظ کا استعمال کلمے کے لئے بعد کی بات ہے۔ یہ اس کا مانع نہیں کہ لفظ اپنے اصلی معنی میں مستعمل نہ ہو"۔(۱)

غالبؔ سے متعلق قاضی صاحب کا ایک اور اہم مقالہ وہ ہے جو ۷ ار فروری ۱۹۶۹ء کو نئی

ـــ غالب نمبر سے مراد علی گڑھ میگزین کا غالب نمبر (۴۹-۱۹۴۸) ہے۔

(۱) اردو ادب علی گڑھ۔ جلد ۲۔ ۳۲۔ شمارہ ۳ (جولائی) ۱۹۵۲ء۔ ص ۲۷-۲۸

Marfat.com

دہلی میں غالبؔ پر بین الاقوامی سیمنار میں خطبۂ افتتاحیہ کے طور پر پڑھا تھا۔بعد میں یہ مقالہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی مرتب کردہ 'بین الاقوامی غالبؔ سیمنار' کی روئداد میں شامل اشاعت ہوا۔ لیکن حسب معمول اس میں بھی کافی ردوبدل اور تصحیح واضافہ کیا۔اس طرح جو مقالہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی مرتب کردہ مذکورہ بالا روئداد و مجموعۂ مقالات میں شامل اشاعت ہوا، وہ اس خطبے سے کافی مختلف ہو گیا ہے جو انھوں نے سیمنار میں پیش کیا تھا۔ چنانچہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں :

"مقالہ ہذا کا موضوع منابع احوالِ غالبؔ' ہے۔ یہ وہ نہیں جو انٹر نیشنل سیمینار میں پڑھا گیا تھا، مگر دونوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں"۔

قاضی صاحب نے جیسا کہ اقتباسِ بالا سے بھی واضح ہوتا ہے غالبؔ کے سوانح کے مآخذ سے بحث کی ہے اور بالخصوص ان کی زندگی ان گوشوں کا ذکر کیا ہے جو اس وقت تک تحقیق طلب تھے اور جن کے بارے میں بہت ہی کم معلومات حاصل ہو سکی تھیں۔اس میں قاضی صاحب نے چند بہت ہی اہم نکات اٹھائے ہیں اور ان پر محققین، ناقدین اور سوانح نگاروں کو کام کرنے کی دعوت دی ہے۔آپ کو اس بات کا شکوہ ہے کہ سوانح نگار عام طور پر غیر جانبدارانہ رویہ اختیار نہیں کرتے۔وہ جادۂ اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں اور خالص مدح سرائی شروع کر دیتے ہیں اور کمزور پہلوؤں کو قلم انداز کر جاتے ہیں اس طرح بہت سی اہم باتیں جن کے بغیر شخصیت کی قدر و قیمت کا تعین نہیں کیا جا سکتا، نظر انداز ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات غیر ضروری باتیں لکھ دی جاتی ہیں جن کا مقصد صرف شخصیت کی اہمیت کو دوبالا کرنا ہوتا ہے۔ لیکن سنجیدہ قاری کے ذہن و فہم پر یہ باتیں معکوس اثر کرتی ہیں۔اس موقع پر قاضی صاحب نے فرانس کی مشہور ادبی شخصیت بودلیر BODILIER کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ اے خدا مجھے اس بات کی ہمت عطا کر کہ میں خود کو اسی طرح دیکھوں جس طرح کہ میں ہوں۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ایسے حضرات جو یہ چاہیں کہ ان کی اصل شکل ابھر کر سامنے آئے، اور بھی کم ہیں۔اسی طرح جن لوگوں نے اپنے سوانح خود قلم بند کیے ہیں، انھوں نے بھی کثرت سے وہی باتیں لکھی ہیں جن سے ان کے صرف اچھے پہلو ہی قاری کے سامنے آتے ہیں۔اور جو باتیں ان

Marfat.com

کے کردار کا دوسرا رخ ظاہر کرتی ہیں ان کو یکسر چھپا جاتے ہیں مرزا غالبؔ بھی ان ہی لوگوں میں ہیں۔ اور ان کے سوانح نگاروں نے بھی اسی روش کو اختیار کیا ہے۔ لہذا غالبؔ کے سوانح اور احوال کے جتنے بھی منابع اور مآخذ ہیں وہ سب کسی نہ کسی حیثیت سے ناقص اور نا مکمل ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سلسلے میں از سرِ نو تلاش و تحقیق کی جائے۔ غالبؔ نے اپنی شخصیت کو ابھارنے کی کیا کیا ترکیبیں استعمال کیں، ان کی وضاحت کرتے ہوئے قاضی صاحب فرماتے ہیں:

"غالبؔ نے اپنی میخواری کا بہانگِ دہل اعلان کیا ہے، اور اس کے اظہار میں انھیں باک نہیں کہ انھوں نے ایک ڈومنی کو مار رکھا تھا۔ کیا اس کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالبؔ ان نادر الوجود اشخاص میں سے ایک ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ دوسروں کو بھی وہ اپنی اصل شکل میں نظر آئیں؟ بودلیر کا ہم وطن روش فوکو ہوتا تو وہ یہ جواب دیتا کہ رند مشربی کا اقرار صرف اس لئے ہوتا کہ سادہ لوحوں کو یہ باور کرایا جائے کہ "غالبؔ کوئی کام چھپا کر نہیں کرتے تھے جو دل میں تھا وہی زبان پر تھا، جو خلوت میں کرتے تھے وہی جلوت میں کرتے تھے۔ پس اگر ان میں کوئی عیب تھا تو وہی تھا جس کو ہر کس و ناکس جانتا تھا، مخفی عیبوں سے وہ پاک تھے"۔

اس کے علاوہ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ ایک عام رواج یہ بھی ہو گیا ہے کہ سوانح نگار صاحب سوانح سے وہ صفات بھی منسوب کر دیتا ہے جن کا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کے لئے واقعات وضع کر لئے جاتے ہیں۔ اس کا مقصد صاحب سوانح کی شخصیت کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا اور اپنے معیار کے مطابق اس کے کردار کو پیش کرنا ہوتا ہے۔ قاضی صاحب کے الفاظ ہیں:

"مشاہیر کو ناموری کی جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اس کا ایک جزو یہ بھی ہے کہ ان کے متعلق حکایتیں اختراع کی جائیں۔ یہ ان کی زندگی میں بھی ہوتا ہے، اور ان کی موت کے بعد بھی۔ ہسکت پیرسن نے شا کے حالاتِ زندگی پر کتاب لکھنی چاہی تو بعض حکایات کے متعلق ان سے دریافت کیا کہ یہ کہاں تک صحیح ہیں۔ انھوں نے ان میں

Marfat.com

سے کئی کو بالکل بے بنیاد قرار دیا۔ کئی کی نسبت یہ کہا کہ ان کی اصل شکل کچھ اور ہے۔ معدودے چند حکایات کے متعلق انھوں نے کہا کہ صحیح ہیں۔ باقی میں حافظے سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا ہی تھا یا نہیں۔ غالبؔ کے بارے میں بھی بہت سی حکایتیں گڑھی گئیں اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ ایک فرید آبادی مقالہ نگار نے مدت ہوئی مرقع عالم ہر دوئی میں لکھنؤ کے مشاعرے اور مردہ دہلی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ بے شبہ اختراعی ہے......... غالبؔ کو اپنی ناموری کی قیمت اور طرح بھی ادا کرنی پڑی ہے۔ لوگ غالبؔ میں وہ خوبیاں پانے لگے ہیں جو انھیں خود عزیز ہیں۔ غالبؔ کے نزدیک ان کی کچھ اہمیت ہو یا نہ ہو۔ علیٰ ہذا، لوگ خواہ مخواہ غالبؔ کو اپنا ہم عقیدہ ثابت کرنا چاہتے ہیں"۔

اس کے بعد ذیل عنوانات قائم کر کے آپ نے غالبؔ کی غلط بیانیوں اور ان کے سلسلے میں کی گئی غلط بیانیوں کا بالتفصیل جائزہ لیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ تمام باتیں غالبؔ کی شخصیت کو معاصرین پر ترجیح دینے اور ان کی علمی و ادبی حیثیت کو مستحکم کرنے کی غرض سے کی گئی ہیں۔ مثلاً غالبؔ کی اپنے متعلق غلط بیانی کی مثال دیتے ہوئے قاضی صاحب لکھتے ہیں:

"کلکتہ گیا، نواب گورنر سے ملنے کی درخواست کی، دفتر دیکھا گیا، میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا، ملازمت ہوئی۔ سات پارچے اور جیغہ سرپیچ اور مالائے مروارید یہ تین رقم خلعت ملا۔ زاں بعد جب دلی میں دربار ہوا، مجھ کو بھی خلعت"۔ یہ ایک خط اسی ذکا میں ہے جو ہنگامۂ ۵۷ء کے بعد کا ہے۔ کلکتہ سے جو خطوط غالبؔ نے بھیجے، ان سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ گورنر جنرل کے ایک دربار میں شرکت کی۔ رسمی طور پر دوسرے شرکا کی طرح غالبؔ گورنر جنرل کے سامنے پیش بھی کیے گئے ہوں گے۔ اس کے علاوہ ملازمت کا ثبوت نہ ان خطوط سے ملتا ہے، نہ دفتر سرکاری سے۔ ملنا درکنار، یہ بھی ثابت نہیں کہ انھوں نے اس کی استدعا کی تھی۔ غالبؔ نے خلعت کی خواہش ظاہر کی تھی مگر کلکتے میں نہ ملا۔ بعد کو دہلی میں خلعت پایا"

اسی قبیل کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں:

Marfat.com

"غیاث الدین رامپوری مؤلفِ غیاث اللغات سے غالبؔ بہت بیزار تھے۔ ان کی توہین میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے اور غیاث اللغات کو وہ ایک نہایت لغو چیز سمجھتے ہیں۔ یہ اغلاط سے خالی نہیں۔ لیکن اسے کسی طرح ناقابلِ اعتنا نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ ایران حال کے محقق بزرگ قزوینی نے اسے فرہنگ نفیس کہا ہے اور یہ چند سال قبل ایران میں طبع ہوئی ہے۔ صاحب موید برہان نے ایک لفظ کی بحث میں لکھ دیا تھا کہ بظنِ غالبؔ اس کتاب نے غالبؔ کو گمراہ کیا ہوگا۔ غالبؔ بپھر پڑے، مؤلف اور اس کی کتاب پر لعنت بھیجنے کے بعد فرماتے ہیں؛ "رامپور میں وہاں کے صاحبزادگانِ عالی تبار اور رؤسائے نامدار، سے ملاقاتیں رہیں تو یہ معلوم ہوا کہ یہ شخص ایک گم نام مکتب دار ملا تھا جو نہ رئیس رامپور کا روشناس تھا نہ اکابرِ شہر کا آشنا"۔ اس س ے قطع نظر کہ علم کے لئے رئیس کی روشناسی اور اکابرِ شہر کی آشنائی ضروری نہیں، غیاث الدین کلب علی خاں اور ان کے والد یوسف علی خاں کے استاد تھے اور رامپور میں ان کی بڑی عزت تھی۔ یہ امیرؔ مینائی کی "انتخابِ یادگار" سے ثابت ہے۔ شاگردی کا اقرار خود کلب علی خاں کی طرف سے سمجھنا چاہئے۔ امیرؔ مینائی نے نہ صرف اس کتاب میں بلکہ ایک خط میں بھی لکھا ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ ہے اُن کے حکم کے مطابق ہے۔ غالبؔ اگر دو بار رامپور نہ گئے ہوتے اور غیاث الدین کے متعلق وہ بات کہتے جو اوپر منقول ہے تو کہا جاسکتا تھا کہ انھیں غلط اطلاع ملی، یہ بات حددرجہ خلافِ قیاس ہے کہ رامپور کے صاحبزادگان عالی تبار اور روسائے نامدار سے یہ معلوم ہو سکتا"۔

یہ تو وہ امور تھے جن میں غالبؔ نے خود اپنے متعلق غلط بیانی سے کام لیا ہے اور اپنے معاصرین پر غیر ضروری اور خلافِ واقعہ الزام تراشی اور بہتان طرازی سے کام لیا ہے جس کا واحد مقصد ان کی تحقیر کرنا ہے۔ اس کو ہم مقالے کا پہلا حصہ قرار دے سکتے ہیں۔ اس کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں قاضی صاحب نے "معاصر ادب اور کتب متعلق معاصرین" میں غالبؔ سے متعلق معلومات کا جائزہ لیا ہے۔ اس کی تمہید میں شعرائے اردو کے تذکروں پر تنقید ہے۔ یہ بات قاضی صاحب نے کئی جگہ لکھی ہے کہ یہ تذکرے ساقط الاعتبار ہیں۔ ان کے مؤلفین

Marfat.com

عموماً غیر محتاط ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔" انھیں حقیقت کی تلاش سے کہیں زیادہ لفاظی مد نظر تھی اور بعض تو محض داستان طرازی پر اتر آتے تھے"۔ اسی کے ساتھ ان تذکروں میں قاضی صاحب کے نزدیک ایک بڑا عیب یہ بھی پایا جاتا ہے کہ ان کے آغاز اور اختتام کے بارے میں جو اطلاعات خود ان کے مؤلف دیتے ہیں وہ ان اطلاعات سے مختلف ہوتی ہیں جو دوسرے شعرا اپنے قطعات تواریخ میں فراہم کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے بیشتر مندرجات کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ان کا زمانۂ تحریر کیا ہے۔ لہذا ان میں جو معلومات فراہم کی جاتی ہیں ان کے زمانۂ وقوع کا تعین اکثر ان تذکروں سے نہیں ہو سکتا۔ اس کام کے لئے دوسرے منابع سے مدد لینی پڑتی ہے۔ حتیٰ کہ معاصر کتابوں میں بھی غیر مستند باتیں لکھی رہتی ہیں جس کے سبب شخصیت ابھر کا سامنے نہیں آتی بلکہ اور 'مسخ' ہو جاتی ہے۔ اسی نوع کی ایک کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"ایک کتاب جو ایک معاصر نے ۱۹۰۴ء میں یا اس کے کچھ بعد لکھی 'لطائف غالب' ہے اس میں مصنف نے جس شخص کا جو لطیفہ پسند کیا ہے۔ غالبؔ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ گلستان سعدی کا پھوں سے متعلق ایک لطیفہ غالبؔ کا طبعزاد قرار دیا ہے"۔

اس کے بعد محمد حسین آزادؔ کی یادگار تالیف 'آبِ حیات' میں غالبؔ کے متعلق جو معلومات دی گئی ہیں، ان کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اور ان میں سے بیشتر کو غلط اور غیر مستند قرار دیا ہے۔ مثلاً یہ کہ غالبؔ ابتدا میں اسدؔ تخلص کرتے تھے پھر غالبؔ اختیار کیا۔ اس تبدیلی تخلص کا واقعہ محمد حسین آزاد نے اس طرح بیان کیا ہے:

"جھجر میں ایک فرومایہ شاعر اسدؔ تخلص کا گزرا ہے۔ اس کا مقطع۔

اسدؔ تم نے بنائی یہ غزل خوب ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

کسی نے پڑھا۔ سنتے ہی اس تخلص سے جی بیزار ہو گیا۔ ۱۲۴۵ھ میں غالبؔ تخلص رکھا"

اس پر قاضی صاحب محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جھجر میں اسدؔ تخلص کے کسی شاعر کا وجود ثابت نہیں۔ خود غالبؔ کے بعض خطوط میں

Marfat.com

اس پر مشعر ہیں کہ ؎

اسدؔ اس جفا پر بتوں سے وفا کی مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

جو تذکروں میں میر امانی اسدؔ کے نام سے ہے۔ غالبؔ کے سامنے کسی نے پڑھا تھا اور غالبؔ کو اس کی داد دی تھی۔ غالبؔ تخلص ۱۲۴۵ھ سے بہت قبل اختیار کیا تھا۔ اور اسدؔ تخلص سے اس کے بعد بھی کام لیتے رہے"۔

اسی طرح آزاد کا بیان ہے کہ :

"کلکتے میں کسی سے یہ معلوم کر کے غالبؔ کی مثنوی کا نام بادِ مخالف ہے، گلستان سعدی کا یہ فقرہ پڑھا : یکے از صلحار ابادِ مخالف در شکم پیچید، اور سب ہنس دیئے"۔

اس پر تنقید کرتے ہوئے قاضی صاحب فرماتے ہیں :

"آزاد نے یہ نہیں بتایا کہ یہ حکایت ان کے علم میں کس طرح آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مثنوی کا پہلا نام 'آشتی نامہ' تھا۔ حکایت واقعی ہوتی تو غالبؔ اس کا نام 'بادِ مخالف' نہ رکھتے"۔

آب حیات کے بعد قاضی صاحب نے 'یادگارِ غالبؔ' کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اور اس میں درج بعض روایات کو غلط ثابت کیا ہے۔ یادگارِ غالب کی اہمیت سے کون واقف نہیں۔ اپنی بعض کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود غالبؔ کے سوانح اور فن پر یہ پہلی مستقل کتاب ہے جسے آج بھی اپنے موضوع پر اولین مآخذ کی حیثیت حاصل ہے اور ایک شخص کے قلم سے نکلی ہے۔ جسے غالبؔ سے تلمذ کا شرف حاصل ہے اور جسے خلوت و جلوت میں غالبؔ کو برتنے اور قریب سے دیکھنے کا نادر موقع ملا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یادگارِ غالب کی بدولت غالبؔ کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور لوگوں کو ان سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ لیکن قاضی صاحب اس سے بھی کچھ زیادہ مطمئن نظر نہیں آتے۔ فرماتے ہیں :

کومریڈ دہلی کے ایک شذرے میں جو قریب یقین ہے کہ خود محمد علی ؎ کے قلم سے تھا، یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ یادگارِ غالبؔ (= یادگار) غالبؔ و حالیؔ دونوں میں سے کسی

؎ مشہور سیاسی رہنما مولانا محمد علی جوہر جو دہلی سے انگریزی اخبار COMRADE نکالا کرتے تھے۔ اردو میں 'ہمدرد' بھی آپ کا ہی تھا۔

Marfat.com

کے شایان نہیں۔ اس اجمال سے یہ واضح نہیں کہ یادگار سے نامطمئن ہونے کے وجوہ کیا تھے، ان کے متعلق قیاس آرائی لاحاصل ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یادگار عہدِ حاضر کے سیرت نگار سے جو مطالبہ کیا جا سکتا ہے، اسے کس حد تک پورا کرتی ہے۔ حالی کے نزدیک واقعات زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ خود ان کے الفاظ میں جو واقعات اس میں درج ہیں انھیں 'ضمنی اور استطرادی' سمجھنا چاہئے۔ حیات جاوید کے دیباچے میں حالی خود معترف ہیں کہ اس کتاب سے پیشتر اس فن کی جو کتابیں میرے قلم سے نکلی ہیں (مراد حیاتِ سعدی و یادگار سے ہے) ان میں جن اشخاص کے حالات زندگی مرقوم ہیں ان کے پھوڑے نہیں چھیڑے گئے۔ واقعات انیس کے مصنف نے میرا حافظہ دھوکا نہیں دیتا، تو لکھا ہے کہ حالی مقر تھے کہ بعض لطائف بمصلحت درجِ یادگار نہیں ہوئے"۔

اس کے بعد آپ نے بدلائل یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا حالی کی یہ یادگار تالیف بڑی حد تک ساقط الاعتبار ہے۔ مؤلف نے بالقصد بہت سی باتوں کو شامل نہیں کیا ہے اور بہت سے غیر ضروری باتوں کو بھرتی کر لیا ہے، نیز اکثر ایسی باتیں جو غلط طور پر غالب سے منسوب ہو گئی ہیں، ان کی اصلاح بھی نہیں کی ہے۔ قاضی صاحب کا یہ بھی اعتراض ہے کہ حالی نے غالب کے پیشتر اشعار کی قرأت بھی درست نہیں لکھی اور جوشِ عقیدت میں آکر اشعار کی تشریح میں اضافے بھی کئے ہیں جو یادگارِ غالب کو معیار سے فروتر اور ناقابلِ اعتبار بنا دیتے ہیں۔ اس کے بعد ایسے چالیس مقامات کی نشاندہی کی ہے جہاں حالی واضح طور پر ایک حقیقی اور غیر جانبدار سوانح نگار کے معیار پر پورے اترنے سے قاصر رہے ہیں:

"بہت سے امور جن کی تحقیق اب ناممکن یا بہت دشوار ہے، حالی کوشش کرتے تو ان کے متعلق حسبِ دلخواہ معلومات فراہم کر سکتے تھے ان کے زمانے میں جو تحریری مواد موجود تھا۔ اس میں سے بہت کچھ ضائع ہو گیا ہے۔ اس وقت بہت سے لوگ جو غالب اور ان کے خاندان سے واقفیت رکھتے ، زندہ تھے۔ مگر انھوں نے غالب کے حالات دریافت کرنے کے لئے انتخاب کیا تو صرف ۵ اشخاص کو جو کم و بیش انھیں کی عمر کے تھے اور جن میں سے کم از کم دو کو اختراع روایات سے مطلقاً احتراز

Marfat.com

نہ تھا، مجھے یقین ہے کہ حالی نے انھیں بھی سوالات نہ بھیجے ہوں گے، بس یہ لکھا ہوگا کہ جوآپ کے علم میں ہو بتائیے۔ صرف یہی نہیں کہ اس زمانے میں جو تحریری مواد تھا، اس سے بھی بہت کم کام لیا۔ انھوں نے حالات کی تحقیق کے لئے تصانیف غالب کا غائر مطالعہ بھی غیر ضروری متصور کیا، اور کتابوں سے بحث نہیں کی۔ حالی کی یادگار کے دیکھنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ردو قبول روایات کا کوئی معقول معیار ان کے پاس نہیں اور اس پر طرہ یہ کہ سہل انگار ہیں۔ نتائج صحیح نہیں نکالتے، اور حوالہ یا تو مطلقاً نہیں دیتے، یا دیتے ہیں تو اس کا صحیح طریقہ اختیار نہیں کرتے۔ انھوں نے بعض اوقات فارسی سے ترجمہ کرنے میں تصرف کیا ہے، شرح اشعار میں اپنی طرف سے بات بڑھائی ہے اور بعض اشعار کا متن غلط پیش کیا ہے"۔

لہذا ایسی صورت حال میں جب تذکرے اور سوانح غالب کی صحیح تصویر پیش کرنے سے قاصر ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اخبارات، رسائل اور سرکاری دفاتر میں محفوظ کاغذات وغیرہ جیسے غیر روایتی ماخذ کی چھان بین کی جائے اور ان کی مدد سے حیاتِ غالب کی گم شدہ کڑیاں تلاش کی جائیں اور پھر ان کی مدد سے غالب کی مکمل، غیر جانبدار اور مستند سوانح عمری ترتیب دی جائے۔

کافی طویل عرصے تک غالب کے استاد کا مسئلہ نزاعی بنا رہا۔ بہت دنوں تک لوگ عبدالصمد نام کے ایک شخص کو غالب کا استاد مانتے رہے۔ یہ ایرانی النسل تھے اور ان کا اصلی نام ہرمزد تھا۔ ان کا وطن یزد تھا اور وہاں کے امیر زادوں میں جلیل القدر شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے کم و بیش پچاس برس تک علمائے عرب و بغداد سے مختلف علوم کی تحصیل کی۔ زرتشتی مذہب ترک کر کے مشرف بہ اسلام ہوئے اور 'عبد الصمد' نام رکھا۔ اور بقول غالب ۱۲۲٦ھ میں بہ طریقِ سیاحت آگرہ پہنچے اور غالب کے گھر قیام کیا اور دو سال وہاں گزارے"۔

"پارسی نژاد فرزانۂ بود از تخمۂ ساسانیان............ و خود را عبدالصمد نامیدہ۔ بہ اکبر آباد دو سال بہ کلبۂ اخزانِ من آسودہ است"۔

ایک دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ غالب کے دہلی میں منتقل ہو جانے کے بعد وہ

Marfat.com

دہلی میں بھی غالب کے گھر مقیم رہے۔ اس پورے عرصہ میں غالب نے ان سے بھرپور استفادہ کیا۔

یادگار غالب میں مولانا حالی فرماتے ہیں :

"اس نے تمام فارسی زبان کے مقدم اصول اور گر اور پاسیوں کے مذہبی خیالات اور اسرار جن کو فارسی زبان کے سمجھنے میں بڑا دخل ہے اور پارسی و سنسکرت کا متحد الاصل ہونا اور اسی قسم کی اور ضروری باتیں مرزا کے دل میں بوجہ اولیٰ تہ نشیں کر دی تھیں"۔(۱)

لیکن اس کے علی الرغم غالب نے یہ بھی کہا ہے کہ "مجھ کو مبدءِ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چوں کہ مجھ کو لوگ بے استاد کہتے تھے۔ ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گڑھ لیا ہے"۔ اس طرح ہرمزدیا عبدالصمد کی شخصیت اختلافی بن گئی۔ اور غالب کی تضاد بیانی نے اس مسئلہ کو اور بھی الجھادیا۔ لیکن مولانا حالی کا اصرار ہے کہ :

"عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی سیکھی تھی ....اس کے فیضِ صحبت نے کم سے کم وہ ملکہ ضرور مرزا میں پیدا کر دیا تھا جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ اگر حاصل شعور خواندہ مدر است واگر حاصل نہ شود ہم خواندہ و ناخواندہ برابر"۔

آگے چل کر مولانا حالی فرماتے ہیں :

زیادہ تر ملا عبدالصمد کی تعلیم کے سبب فارسیت کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کی بول چال اور ان کی قوتِ متخیلہ پر چڑھ گیا تھا"۔

یہ اس کے باوجود ہے کہ غالب کی فرضی استاد والی بات بھی حالی نے یادگارِ غالب میں نقل کر دی ہے۔ لیکن انھوں نے غالب کے متضاد اقوال میں یہ کہہ کر مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے :

"جب یہ خیال جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اس کی صحبت میسر آئی اور کس قدر قلیل مدت اس کی صحبت میں گزری تو عبدالصمد اور اس کی تعلیم کا عدم وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اس لئے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ مجھ کو مبدءِ فیض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے"۔(۲)

---

(۱) یادگار غالب ص ۱۷

(۲) یادگار غالب ۔ کانپور، نامی پریس، ۱۸۹۷ ص ۱۸

Marfat.com

قاضی عبدالودود ملا عبدالصمد کے وجودِ خارجی کے قائل نہیں۔ وہ انھیں ایک فرضی شخصیت مانتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک تفصیلی مضمون "غالب کا ایک فرضی استاد" کے عنوان سے تحریر کیا جو علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر (۴۹۔۱۹۴۸) میں شائع ہوا۔ اس کے بعد یہ مضمون 'احوال غالب' مرتبہ مختار الدین احمد (مطبوعہ: ۱۹۵۳ء) میں 'ہرمزدثم عبدالصمد' کے عنوان سے شامل اشاعت ہوا۔ اس میں انھوں نے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مولانا حالی کے مذکورہ بیانات کا تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ جناب مالک رام کے نظریات کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

"یہ امور صرف ایک نتیجے کی طرف لے جاتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ عبدالصمد غالب کے بحر تخیل کی ایک موج سے زیادہ نہیں"۔

مضمون کے آخر میں قاضی صاحب کی حسب ذیل عبارت ان کے نظریے کو تقویت پہنچاتی ہے اور اسی کے ساتھ ان کے مخصوص طرز فکر کی غمازی بھی کرتی ہے:

عبدالصمد جو غالب کا زائیدہ طبع ہے بہت سی باتوں میں اپنے آفریدگار سے مشابہ ہے: غالب افراسیابی ہیں تو عبدالصمد دارابی۔ غالب دہلی کے رئیس زادے ہیں تو وہ یزد کا امیر زادہ۔ تصوف سے دونوں کو لگاؤ ہے اور توحیدِ وجودی کے دونوں قائل ہیں۔ معلمی کسی کا پیشہ نہیں۔ لیکن جوہر قابل ملے تو اس کی تربیت کے لئے دونوں آمادہ ہیں۔ منطق و فلسفہ اور علوم عربیہ میں عبدالصمد کا تبحر اسے غالب سے ممیز کرتا ہے۔ یہ وہ علوم ہیں جن سے اپنی ناواقفیت کا احساس غالب کو بہ شدت تھا۔ یہ کمی عبدالصمد میں پوری ہوئی۔ ایک بات میں غالب کو بھی عبدالصمد پر فوقیت ہے۔ عبدالصمد رازداں تو ہے مگر رازگوئی کا شوق نہیں رکھتا۔ غالب میں دونوں باتیں جمع ہیں۔ اسی لئے غالب نے ساسانِ ششم کا لقب اپنے لئے محفوظ رکھا۔ دستنبو کی آخری رباعی کا آخری مصرع ہے:

ساسان ششم کا بکار دانی مائیم

"عبدالصمد کے وجود خارجی کا تسلیم کرانا آسان نہ تھا۔ سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ ایرانِ قدیم سے متعلق غالب کی معلومات بہت قلیل تھی اور جو کچھ تھی وہ بھی بہت کچھ غلط۔ وہ کسی طرح ایک ایسی ہستی کے خالق نہیں ہو سکتے تھے جس کے

Marfat.com

معلومات ان سے وسیع تر اور صحیح تر ہوں ان اصحاب کے لئے جو قدیم ایرانی زبانوں اور زرتشتی مذہب سے کسی حد تک بھی باخبر ہیں، ایک ایسے زرتشتی عالم کے وجود کا قائل ہونا خویشن کی جگہ پشن کو صحیح سمجھتا اور چنیود کو مستحدث ماننا ممکن نہیں"۔(۱)

جہان غالب غالبیات کے سلسلے میں قاضی صاحب کا ایک عظیم کارنامہ جہانِ غالب کی تدوین ہے۔اس کی حیثیت دراصل غالب انسائیکلوپیڈیا (GHALIB ENCYCLOPEDIA) کی ہے۔ قاضی صاحب نے غالب کا بہت ہی گہرا مطالعہ کیا تھا۔انھوں نے ان کی شعری اور نثری تخلیقات کا ایک ایک لفظ پڑھا تھا بغور پڑھا تھا اور کئی کئی بار پڑھا تھا۔اس کا بیشتر حصہ انھیں ازبر ہو گیا تھا وہ تمام زندگی غالب کا مطالعہ کرتے رہے۔اسی کے ساتھ غالب سے متعلق جو کچھ لکھا گیا اس پر بھی انھوں نے تنقیدی نظر ڈالی۔ اور اس طرح وہ اپنے عہد کے عظیم ترین ماہر غالبیات بن گئے۔آپ نے غالب کی تمام تخلیقات کو جدید تحقیق اور متنی تنقید کے اصول کی روشنی میں از سر نو ترتیب دینے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ان کے پروگرام کے مطابق یہ کام دس ضخیم جلدوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچتا۔اس سلسلے کی پہلی کڑی 'قاطع برہان اور رسائل متعلقہ" کی شکل میں ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔اسی سلسلے کی ایک اور اہم کڑی، جہانِ غالب ہے جس میں غالب کی تحریروں میں جن شخصیات کے حوالے ملتے ہیں یا جن ادبی اور لسانی امور سے بحثیں ملتی ہیں ان سے متعلق تفصیلی حواشی لکھے جانے تھے۔اس سلسلے میں قاضی صاحب نے آٹھ قسطوں میں کام کیا اور رسائل میں شائع بھی کرایا۔لیکن کام مکمل نہ ہوا۔ان قسطوں کی اشاعتی تفصیل اس طرح ہے :

۱۔جہانِ غالب	معاصر پٹنہ	حصہ ۲	(جنوری)	۱۹۵۲ء
۲۔ "	"	حصہ ۴	(دسمبر)	۱۹۵۳ء
۳۔ "	"	حصہ ۷	"	۱۹۵۴ء
۴۔ "	"	حصہ ۹	(جنوری)	۱۹۵۶ء
۵۔ "	"	حصہ ۲۳		
۶۔	شاعر	بمبئی	"	۱۹۶۹ء
۷۔جہان غالب	مطالعہ	پٹنہ	(مئی۔جون)	۱۹۶۹ء

(۱)احوال غالب ص ۲۵۷۔۲۵۶

Marfat.com

۸۔جہانِ غالب   مطالعہ   پٹنہ   (مارچ۔اپریل) ۱۹۷۱ء

بعد میں غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے بھی غالب انسائیکلوپیڈیا تیار کرانے کا منصوبہ بنایا تو اس کی ترتیب و تہذیب کے لئے قاضی صاحب سے ہی درخواست کی۔ چنانچہ غالب نامہ، (۱۹۷۴) میں یہ اطلاع شائع ہوئی کہ :

"غالب انسٹی ٹیوٹ نے ایک منصوبہ غالب انسائیکلوپیڈیا کا تیار کیا ہے جس میں غالب کی تحریروں میں جن قابلِ ذکر تاریخی، لسانی ادبی اور تہذیبی امور کا ذکر ہوا ہے، ان پر یادداشتیں لکھی جائیں اور طریقہ کار وہی ہو جو دائرۃ المعارف کا ہوتا ہے یعنی متعلقہ اندراج کی اجمالی شرح، اس کے منابع کا ذکر اور اس پر معلومات و اطلاعات حاصل ہو چکی ہیں یا جو کام ہو چکا ہے ان کا تذکرہ ہو۔ چوں کہ غالب نے ہزاروں ایسے امور کا ذکر کیا ہے، اس سے واضح ہے کہ مجوزہ انسائیکلوپیڈیا اردو اور فارسی دونوں زبانوں کی دائرۃ المعارف ہوگی۔ یہ کام نامور محقق قاضی عبدالودود صاحب نے 'جہانِ غالب' کے نام سے شروع کیا تھا لیکن بعض وجوہ سے کام آگے نہ بڑھ سکا۔ ادارہ کی کوشش ہوگی کہ یہ مفید کام جو کئی جلدوں پر مشتمل ہوگا جلد سے جلد شائع ہو جائے"۔

لیکن انسٹی ٹیوٹ کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی، قاضی صاحب کام پورا نہ کر سکے البتہ وہ جتنا کام کر سکے وہ مذکورہ آٹھ قسطوں میں شائع ہوا۔ اس میں سے بطورِ نمونہ چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں :

ببر علی خاں=   دیوان کے نسخۂ حمیدیہ کی ایک غزل کا مقطع ہے ؎

مسیح کشتۂ الفت ببر علی خان ہے   کہ جو اسدؔ تپش نبض آرزو جانے

نسخۂ عرشی کے اشاریے میں 'ببر علی خاں حکیم' ہے۔ مکاتیب غالب کے ایک خط بنام کلب علی خاں نوشتۂ اگست ۱۸۶۵ء میں ہے :

معجون طلائی عنبری تقویتِ قلب میں مجوزہ ببر علی خان مغفور، ورقِ طلا، عرقِ کیوڑہ، قند، کثرت اجزا اس ترکیبِ خاص میں ناپسند، حاشیہ نوشتۂ جناب عرشی : اس قدر پتا چلتا ہے کہ یہ دہلی کے مشہور طبیب تھے۔ ان کے بیٹے کا ذکر کسی تذکرے میں بذیلِ شعرا دیکھا تھا اور اس وقت اس سے اندازہ کیا تھا کہ ببر علی خاں آخر بارہویں صدی کے اہل علم

Marfat.com

میں تھے"۔ چونکہ اس عبارت میں تذکرے کا نام ہے، نہ بیٹے کا نام و تخلص، اس کی مدد سے پڑھنے والا بطور خود ان کے زمانے کے متعلق کوئی رائے نہیں قائم کر سکتا۔ مجموعۂ دہلی میں غالب کے ایک خط بنام محمد علی خاں میں جو کلکتہ سے بھیجا گیا تھا، یہ الفاظ ہیں:

مرا در مدت العمر دو جا اتفاقِ نازش پدر خوانگی افتادہ است، یکی با میر ببر علی خاں مغفور و دیگر با حضور، ہر دو جا آثارِ عطوفت پدری باستیفا معائنہ کردم جنابِ مغفور نیز پس از روزی چند شیوۂ تحیر برگردانده در القاب سہیم اخوی مخدومی ببر وارث علی خاں ساختہ بودند'باغ دودر" کے ایک خط بنام تفتہ میں جو آگرہ گیا تھا۔ یہ ہے کہ "روشن گہر گرامی دودمان حکیم وارث علی خاں میرے حقیقی بھائی کی طرح ہیں، انھیں میرا سلام کہو ہزار سلام۔ ملاقات اور مراسلت نہ ہو، جب بھی دلی تعلق برقرار رہے گا۔ قریب بہ یقین ہے کہ یہ وہی وارث علی خاں ہیں جن کا ذکر مکتوب اسی محمد علی خاں میں ہے۔ یہ بھی قریب بہ یقین ہے کہ ببر علی خاں، بیٹے کی طرح حکیم ہوں، اور معجون انھیں کا مجوزہ ہو، مگر دہلی سے ان کا سروکار ثابت نہیں اور غالب سے ان کے تعلق کے پیشِ نظر، یہ نہیں کہنا چاہیے کہ اواخرِ مایۂ دو از دہم کے اہل علم میں تھے۔ ان کی عمر کا معتدبہ حصہ ماۃ ۱۳ میں بھی گزرا ہوگا"۔

۲۔ راجہ امداد علی خاں بہادر = خط بنام میکش نوشتۂ ۲۵ر صفر ۱۲۶۵ھ میں ہے:

تاریخ یمینی (مرتب کا قول ہے کہ خطی نسخہ میں یمینی نہیں، یمنی) عجالۃً بہر قیمت کہ دست بہم داد، خریدہ در مومیں جامہ پیچیدہ بعد ادائے محصول بہ شما فرستادہ ام۔ بے تکلف از جانبِ خود بخدمتِ راجہ امداد علی خاں بہادر پیشکش کنند و نام من نہ برند۔ راجہ مرا چہ داند کہ من کیستم بیہدہ از من بروی سپاس چیرا نہند، ممنونِ خودش سازند کہ نامور پیشما بلند نامیِ من است و بس"۔ ایک دوسرے خط بنام میکش میں ہے، یہ نوشتہ ۴ر فروری ۱۸۴۹ء ہے:

تاریخ یمینی بھیجی ہے اب تک رسید نہیں ملی"۔ (باغ دودر)

۳۔ مولوی امتیاز خاں = قاضی عبدالجلیل کے نام خط مورخہ ۲۰ر نومبر ۱۸۵۵ء میں ہے:

مولوی امتیاز خاں...... کا میرے ہاں آنا اور میرا اس وقت مکان پر موجود نہ ہونا، واللہ...... بڑا

Marfat.com

رنج ہوا۔ اگر...... ملیں تو میرا اسلام کہیے گا اور میرا ملال ان سے بیان کیجئے گا"۔ (عودِ ہندی)

۴۔ سید علی حسن خاں = مجموعۂ دہلی میں جس کے متعلق میرا مقالہ اردو کراچی کے غالب نمبر میں شائع ہوگا، دو خط سید افضل علی تحصیلدار پرگنہ بدوساو کالنجر ضلع باندہ کے بنام منشی سید علی حسن خاں ہیں، جن میں سے ایک نوشتۂ اگست ۱۸۳۹ء ہے، ایک لفافہ پر جو عبارت ہے وہ بھی اس میں منقول ہے: بسامی خدمت لطف (کذا) درجت مخدوم و معظم نیاز منداں، مصدرِ لطف و کرم جناب منشی سید علی حسن خاں صاحب۔ زاد مجد کم العالی، ذریعہ اخلاص افضل علی عفی عنہ"...... مجموعۂ مذکورہ کے بالکل آخر میں یہ انگریزی عبارت ہے:

"Writen (Sic) by Moonshee Ally Hassan of Mouza kanra." انگریزی عبارت نہ جانے کس کے قلم سے ہے، اس میں جو منشی علی حسن خاں ہیں وہی منشی سید علی حسن خاں معلوم ہوتے ہیں جن کے نام دو خطوں کا ذکر اوپر آیا ہے۔ دونوں ایک ہیں، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کاتب اور جامع ایک ہی شخص ہیں؟ قرینہ ایک ہی ہونے کا ہے"۔

۵۔ دیوانِ بیدل = خط بنام تفتہ مورخہ ۷ ار نومبر ۱۸۵۰ء میں ہے:

درہنگام تماشائے دیوان شما گفتہ ام کی میرزا بیدل چوں دیوان غزلیات ساز دادہ است، طرح آں ریختہ است کہ در ہر زمین دو غزل انشا کند، وآں ہر دو غزل را کہ در یک ردیف و قافیہ باشد، غزل دیگر از زمین دیگر در میان دادہ ہر صفحہ نقش زند و از بای بسم اللہ تا تای تمت ہم بدیں ہنجار رہ سپردہ است چہ خوش باشد کہ دیوان شما نیز ہمیں روش داشتہ باشد، گوئی ہماں شد کہ ماخور سند بودیم"۔ (باغ دودر)

Marfat.com

آوارہ گرد اشعار

اردو اور فارسی میں سیکڑوں، بلکہ ہزاروں اشعار، ایسے ہیں جن کے اصل خالق کا یا تو علم ہی نہیں ہے یا اگر کسی ذریعے سے علم ہو گیا ہے تو غلط طور پر منسوب ہو گئے ہیں اور یہ غلط انتساب اتنا مشہور ہو گیا ہے کہ لوگ اسے ہی اصل خالق ماننے لگے ہیں چنانچہ اصلیت کی تلاش و تحقیق کی طرف توجہ ہی مبذول نہیں ہوئی۔ یہ غلطی کئی اسباب سے واقع ہوئی ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ ابتدائی دور میں ہمارے کلاسیکی شعرا، خواہ وہ فارسی کے ہوں یا اردو کے، ان کے دواوین تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے مرتب نہیں ہوئے۔ اس لئے ایک شاعر کے اشعار دوسرے شاعر کے کھاتے میں چلے گئے۔ اس غلط طریق کی بہترین مثال محمد حسین آزاد کا مرتبہ دیوانِ ذوقؔ ہے اس میں مرتب نے بہت سے ایسے اشعار جو ذوقؔ کے نہیں تھے اور ان کو پسند تھے، دیوان ذوقؔ میں شامل کر دیے۔ اس کے علاوہ اردو اور فارسی شعرا کے تذکروں میں بھی اکثر اشعار غلط طور پر منسوب ملتے ہیں اس لئے کہ ان کے مؤلفین زیادہ تر معلومات محض اپنے حافظے کے سہارے فراہم کرتے تھے، اس لئے ان میں اغلاط کا در آنا ایک قدرتی بات تھی۔ زمانہ ماضی قریب تک طرحی مشاعروں کا رواج بہت زیادہ تھا۔ اس میں ایک ہی مصرعے پر لاتعداد شعرا گرہ لگاتے تھے اور اس میں جس کی گرہ زیادہ پسند کی جاتی وہ مشہور ہو جاتی اور وہ پورا شعر اسی سے منسوب ہو جاتا حالاں کہ اس میں صرف ایک ہی مصرع اس کا ہوتا۔

اسی طرح ایسے اشعار بھی لاتعداد ہیں جو غلط قرأت سے مشہور ہو گئے ہیں اس سے نہ صرف یہ کہ اصل متن مسخ ہو گیا ہے بلکہ مفاہیم میں بھی تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ کسی وجہ سے کوئی شعر مختلف طریقے پر مشہور ہو جاتا ہے پھر عوام اس کو اسی طرح قبول کر لیتے ہیں اور اصل متن جاننے کی فکر نہیں کرتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو حضرات شعر و شاعری کا زیادہ ستھرا ذوق رکھتے ہیں وہ اپنے ذوق کے مطابق اصل شعر میں تصرف کر لیتے ہیں اور پھر یہ شعر اسی تصرف شدہ شکل میں زبان زدِ خاص و عام ہو جاتا ہے۔ مولانا حالیؔ کے یادگارِ غالبؔ میں مرزا کے بہت سے اشعار خفیف سے تصرف کے ساتھ نقل کیے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو ان کے حافظے کی بدولت اصل سے مختلف ہوئے اور کچھ ان کے اعلیٰ ذوقِ شعری

Marfat.com

کے طفیل اپنی اصل شکل سے محروم ہو گئے۔ موجودہ نسل کے محققین نے ایسے تمام اشعار کی نشاندہی کی ہے جو یادگار غالب میں غلط درج ہوئے ہیں۔

بزرگوں میں جناب امتیاز علی خان عرشی مرحوم نے ۱۹۵۸ء میں دیوانِ غالب کو جدید تحقیق اور ترتیب متن کے اصول کے مطابق مرتب کر کے شائع کیا اس میں آپ نے اختلاف متن سے خصوصی طور پر بحث کی ہے اور صحیح متن متعین کیا ہے۔

قاضی عبدالودود نے ایسے بہت سے اشعار کی نشاندہی کی ہے جو غلط شعراء سے منسوب ہو گئے ہیں۔ آپ نے ان اشعار کے اصل خالق کا بنیادی مآخذ کی مدد سے پتا لگایا ہے۔ اسی کے ساتھ آپ نے متن کی صحت کی طرف بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ ان مباحث کو آپ نے آوارہ گرد اشعار کے عنوان سے معاصر، پٹنہ میں بالاقساط شائع کرایا۔ ذیل میں چند اشعار سے متعلق قاضی صاحب کی تحریروں سے اقتباس پیش کیے جاتے ہیں :

شبِ وصال میں جب روزِ غم کی بات چلی
خروشِ مرغِ سحر نے کہا کہ رات چلی

اس شعر کے سلسلے میں قاضی صاحب فرماتے ہیں :

تاریخ شعرائے بہار، مصنفہ رازؔ عظیم آبادی مرحوم میں ایک فصل ان شاعروں کی ہے جن کا ذکر دتاسی کی کتاب اور عشقیؔ کے تذکرے میں ہے۔ انھوں نے شعر زیرِ بحث ظاہرا بہ حوالہ تذکرۂ عشقیؔ شاہ کمال علی کمالؔ دیوروی کے نام لکھا ہے۔ لیکن اس تذکرے میں یہ شعر موجود نہیں۔ شعر شاہ کمال شاگردِ قائمؔ و جرأت کا ہے اور تذکرۂ ہندی (مصحفیؔ) میں صراحتہً ان کے نام مندرج ہے (ص ۱۸)"۔

سامعاں کا نہ فقط سننے سے دم رکتا ہے
سرگذشت اپنی جو لکھیے تو قلم رکتا ہے

اس کے سلسلے میں قاضی صاحب کی تحقیق ملاحظہ ہو :

یہ مطلع مرزا ابراہیم بیگ شررؔ کے نام مصحفیؔ، قاسمؔ اور شیفتہؔ کے تذکروں میں ہے۔ رازؔ مرحوم نے مرزا ابراہیم شررؔ شاگردِ تحقیقؔ عظیم آبادی کہ اس کا مصنف کا لکھا ہے۔ یہ بالکل

Marfat.com

بے بنیاد بات ہے۔ شرر عظیم آبادی شاگردِ تحقیق کا نہایت مجمل ذکر شاد کی نوائے وطن میں ہے، لیکن قدیم تر کتابیں اس سے خالی ہیں۔ خدا جانے رآز مرحوم کو اس شرر کا نام کہاں سے ملا۔ شاد نے تو تخلص دیا ہے"۔

شیخ نے مسجد بنا مسمار بت خانہ کیا
تب تو ایک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

مذکورہ بالا شعر کی تاریخ بیان کرتے ہوئے قاضی صاحب لکھتے ہیں:

چکبست اپنی مرتبہ گلزار نسیم کے دیباچے میں لکھتے ہیں: ایک دن مشاعرے میں ......ناسخ نے...... کہا کہ پنڈت صاحب (یعنی نسیم) ایک مصرع کہا ہے، دوسرا مصرع نہیں سوجھتا...... انھوں نے جواب دیا: فرمائیں۔ ناسخ نے یہ مصرع پڑھا: شیخ نے مسجد بنا مسمار بت خانہ کیا۔ ان کی زبان سے مصرع نکلنے کی دیر تھی کہ یہاں دوسرا مصرع تیار تھا: تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا...... حاضرین جلسہ پھڑک اٹھے...... ناسخ نے شاعری کی آڑ میں مذہبی چوٹ کی تھی۔ لیکن نسیم نے ٹھنڈا کر دیا۔ (ص ۲۵)۔ مگر وہ شعر جس کا ایک مصرع بقول چکبست ناسخ کا اور دوسرا نسیم کا ہے، دراصل میر اعلیٰ علی کا ہے اور تذکرۂ میر حسن میں ہے، جو اس وقت وجود میں آیا ہے جس وقت ناسخ بہت کم عمر تھے اور نسیم کو اس دنیا میں آنے میں بہت دیر تھی۔ الفاظ کے خفیف فرق کے ساتھ میر اعلیٰ علی کا مطلع یہ ہے:

توڑ مت زاہد نے کیوں مسجد یہ بت خانہ کیا
تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

لطف یہ ہے کہ نسیم کے استاد بھائی رند کے یہاں یہ مطلع لفظوں کے ناقابلِ اعتنا اختلاف کے ساتھ ملتا ہے۔

ٹوٹے بت مسجد بنی، مسمار بت خانہ ہوا
جب تو اک صورت بھی تھی، اب صاف ویرانہ ہوا

اس میں شک نہیں کہ مطلع میر اعلیٰ علی کا ہے۔ رند نے یا تو سرقہ کیا ہے یا انھیں توارد ہوا ہے۔ ناسخ کی، شاعری کی آڑ میں، مذہبی چوٹ اور ان کے مصرع کے لئے نسیم کا مصرع بہم پہنچانا

Marfat.com

،افسانۂ محض ہے۔ میرا یہ مدعا نہیں کہ چکبست اس داستان کے واضع ہیں مگر غلو بری چیز ہے۔ کئی روایتیں جو کسی طرح قابل قبول نہیں، اس کی بدولت دیباچے میں مندرج ہو گئی ہیں۔

زلف کو کہنا پریشان ، عقل کی دداری ہے یہ
ہر گرہ میں اس کی دل ہے گانٹھ کی پوری ہے یہ

اس شعر کے اصل خالق کے سلسلے میں تحقیقی بحث کرتے ہوئے قاضی صاحب فرماتے ہیں :

"قائم و حسن کے تذکروں میں ایک مجہول الاسم شاعر نادر کی طرف منسوب ہے۔ لیکن قدرت اللہ شوق کے تذکرے میں آبرو اور مخزن الفوائد نکت میں مظہر کے نام ہے۔ قاسم کو اصرار ہے کہ یہ شعر شاہ پنچھا کا ہے اور انھوں نے اس کی تردید کی ہے کہ یہ گنا بیگم یا کسی اور شاعر کا ہے : نسبت کردن ایں شعر بہ گنا بیگم یا شاعر دیگر از عقل و قلت تفحص است......ایں ہیچمداں ......در بیاضے قدیم محررۂ سنون سابقہ از تولد گنا بیگم......برائے العین مشاہدہ نمودہ" (مجموعۂ نغز۔ جلد اص ۱۱۲)۔

شاہ پنچھا کا ترجمہ تذکرۂ حسن سے پہلے کسی تذکرے میں نہیں ملتا۔ رہی گنا بیگم، تو اس کی شادی عماد الملک سے اس کے باپ علی قلی خاں کی وفات ۱۱۶۹ھ یا ۱۱۷۰ھ (بہ اختلاف روایات) کے کچھ بعد ہوئی ہے۔ اس سے اس کے زمانے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ (عالمگیر ثانی کے عہد کی تاریخ نام مصنف نا معلوم، کتب خانۂ شرقیہ)۔ تذکرۂ قائم کی قدامت کا لحاظ کرتے ہوئے میں اس شعر کو نادر کی ملک سمجھتا ہوں"۔

پوچھی جو گھڑی مجھ سے بہ راہِ عادت | تو وصل کو ساعت کی نہیں کچھ حاجت
ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت | ساعت کا بہانہ نہیں خوش ہر ساعت

مندرجہ بالا رباعی کے بارے میں قاضی صاحب فرماتے ہیں :

"صفیر بلگرامی جلوۂ خضر جلد ا میں اس رباعی کی نسبت لکھتے ہیں : ایک رباعی اکبر کے خط مین جو بہ نام جہانگیر لکھا تھا، ترجمۂ تزک جہانگیری میں نظر آئی ہے۔ اگر یہ اکبر کی کہی ہوئی ہے تو بے شک اردو یہی ہے...... جہاں گیر نے ابو الفضل کو مروا ڈالا۔ اکبر کو بہت صدمہ ہوا۔ بعد چندے جب باپ بیٹے میں لوگوں نے صلح کرا دی اور اکبر نے بلوایا تو

Marfat.com

جہاں گیر نے لکھوا بھیجا کہ نجومیوں سے کوئی ساعتِ سعید دکھوا کر بھیجیے تاکہ میں قدم بوسی کے لئے حاضر ہوں۔ اس پر اکبر نے خط لکھا اور یہ رباعی لکھی۔ صیفؔر کو یقین کامل ہے کہ یہ رباعی اکبر کی ہی ہے۔ لیکن خیالؔ عظیم آبادی جن کا مآخذ جلوۂ خضر کے سوا اور کچھ نہیں، قطعیت کے ساتھ اس رباعی کو اکبر کی طرف منسوب کردیتے ہیں "جہاں گیر...... شاہی طلبی پر حاضری کیلئے نیک ساعت کی تلاش کرتا ہے اور اپنا عندیہ عرض کر بھیجتا ہے۔ بادشاہ اس عرضی پر یہ رباعی دستخط کرتا ہے"۔ (مغل اور اردو ص ۸)۔ تزک جہاگیری فارسی میں ہے اور اس کے آغاز میں دیباچہ اور کچھ حالات محمد ہادی کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ سید احمد علی نے کیا ہے۔ فارسی اشعار کے بارے میں مترجم کی روش یہ ہے کہ یا تو انھیں حذف کر دیتے ہیں (مثلاً یہ شعر جو تزک مرتبہ سید احمد خاں کے ص ۵ پر ہے: محتاج بود ملک بہ پیرایہ چنیں الخ) یا بجنسہ نقل کر دیتے ہیں (مثلاً اشعار قصیدۂ ثنائی ص ۴ ترجمہ) اور یہ شعر جو خسرو کی عرضی میں ہے: (گر بر تن من زباں شود ہر موئے الخص ۹ ترجمہ و ص ۱۲ تزک) یا اردو میں ترجمہ کر دیتے ہیں (مثلاً از ادب دوراست رفتن بے طلب در بزم شاہ؛ ورنہ پائے شوق را مانع در و دیوار نیست (تزک ص ۹) کا ترجمہ اس طرح کیا ہے: ادب سے دور ہے بے حکم جانا بزم شاہی میں؛ ورنہ پائے شوق کو مانع نہیں دیوار در (کذا: ص ۲۱) رباعی زیر بحث فارسی سے اردو میں منتقل ہوئی ہے اور فارسی رباعی بھی اکبر کی نہیں، جعفر بیگ آصف خاں کی ہے جیسا کہ محمد ہادی نے صراحتہً لکھا ہے: ایں رباعی کہ از واردات طبع اوراک وصال را چہ حاجت ساعت از وصل کند کسب سعادت ساعت چہ کنی بہانہ ساعت ساعت" (تزک ص ۱۱۔۱۰) مترجم نے آصف خاں کے بارے میں جو عبارت تھی اس کا ترجمہ نہیں کیا تھا اور اس کی یہ بے اصولی صیفؔر کی غلط فہمی کا باعث ہوئی۔ صیفؔر کو چاہیے تھا کہ مترجم کی روش کو پیش نظر رکھتے، رباعی کی زبان پر غور کرتے اور فارسی تزک کی طرف رجوع کرتے جو جلوۂ خضر کی اشاعت سے پہلے معرضِ انطباع میں آچکی تھی"۔

Marfat.com

آخر گل اپنی صرف درِ میکدہ ہوئی
پہنچے وہاں ہی خاک جہاں کا خمیر ہو

اس کے سلسلے میں قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

گلشنِ بے خار میں بہ نام جہاں دار شاہ، جہاں دار لیکن آزاد نے اپنے مرتبہ دیوان ذوق میں اسے شامل کیا ہے۔ گلشن بیخار پہلی اور دوسری بار آزاد کے والد کے مطبع میں چھپا تھا۔ اور طبع ثانی میں اہلِ مطبع نے ذوق کے بہت سے اشعار اپنی جانب سے بڑھا دیے تھے اگر یہ شعر ذوق کا ہوتا تو آزاد کے والد مصنف کی توجہ اس معاملے کی طرف ضرور مبذول کراتے اور شیفتہ اپنی غلطی کی اصلاح کر دیتے دیوان ذوق کی اشاعت اول میں بھی یہ شعر نہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ویران، ظہیر اور انور کے نزدیک ذوق کا نہ تھا گلشن بیخار میں ایک شعر کا جہاندار کے نام ہونا ان لوگوں کو ضرور معلوم ہوگا۔ ذوق کو اس کا مصنف قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں"۔

قاضی صاحب نے زیرِ بحث شعر کے نہ صرف اصل خالق کا پتہ لگایا بلکہ انھوں نے اس کے صحیح متن کی نشاندہی بھی کی۔ یہ شعر عام طور پر اس طرح مشہور ہے:

آخر گلِ اپنی صرف در میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

قاضی صاحب نے بتایا کہ اس کا صحیح متن اس طرح ہے:

آخر گل اپنی صرف در میکدہ ہوئی
پہنچے وہاں ہی خاک جہاں کا خمیر ہو

ہمارے عیش کی مجلس برہ کی آگ جالا ہے — نہ گلشن ہے، نہ موہن ہے، نہ مطرب ہے، نہ پالا ہے
ہمیں ہیں عشق کے جوگی، ہمارے شوق مستی میں — نہ پشنگ ہے، نہ پوتھی ہے، نہ سمرن ہے نہ مالا ہے
گھپانے کو رقیبوں کے خدنگ آہ بن میرے — نہ نیزہ ہے، نہ بلم ہے، نہ برچھی ہے نہ بھالا ہے
ترے رخ زلف خط انکھیاں کی خوبی کیا چمن اندر — نہ سنبل ہے، نہ ریحاں ہے، نہ نرگس ہے، نہ لالہ ہے
یقیں کی بیقراری اور فغاں سے آج آسودہ — نہ دریا ہے، نہ باراں ہے، نہ ندی ہے، نہ نالہ ہے

اس دلچسپ غزل کو مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے مرتبہ "دیوان یقین" میں شامل کیا

Marfat.com

ہے۔ اس طرح یہ انعام اللہ یقیںؔ کی ہی مشہور ہو گئی ہے۔ لیکن قاضی صاحب اسے یقین کی غزل تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ لیکن اصل شاعر کا پتہ لگانے سے قاصر ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں :

”مرزا فرحت اللہ بیگ نے یہ غزل دیوان یقیںؔ کے صرف ایک نسخہ میں جو انھیں بسملؔ صاحب سے ملا تھا، دیکھی تھی لیکن اس سے پہلے کسی بیاض میں جو مقدمۂ دیوان یقیںؔ کی تحریر کے وقت ان کے سامنے نہ تھی انھوں نے کسی اور شاعر کے نام دیکھی تھی، انھیں یقین ہے کہ غزل یقیںؔ کی نہیں اس لئے کہ یہ ان کا روزمرہ نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مصرع اوّل یوں ہے : یقین ہے بیقراری سے فغاںؔ کی آج آسودہ، اور غزل فغاں کی ہے۔ لیکن یہ روزمرہ فغاں کا بھی نہیں اور نہ دیوان فغاںؔ کے کسی نسخے میں ہے۔ یقیںؔ اور فغاںؔ ان دونوں میں سے کسی کی طرف اسے منسوب کرنا صحیح نہیں۔ خدا جانے اس کا مصنف کون ہے“۔

دل جلوں کا ہے یہ دود آہ دامن گیر لب | کیا دھواں دھار اس مسی سے اس کی ہے تحریر لب
عذر کر آزاد تا ہو عفو یہ تقصیر لب | لب ہلانا روبرو قاسمؔ کے ہے ترک ادب

یہ غزل جس کا مطلع اور مقطع اوپر نقل کیا گیا دس اشعار پر مشتمل ہے اور قاضی صاحب نے یہ پوری غزل درج کی ہے اور اس کے متعلق حسب ذیل بحث کی ہے :

”گلدستۂ نشاط مطبوعہ کلکتہ (تالیف ۱۲۵۲ھ) میں یہ غزل غلام علی خاں آزاد کے نام سے ہے۔ قاسمؔ سے مراد ابوالقاسم خاں مقیم کلکتہ ہیں جن کی ایک غزل اور اس غزل کے بعد ہے۔ 'لب' والی غزل سے پہلے شہرتؔ مقیم کلکتہ اور قاسمؔ کی غزل کے بعد طپاںؔ مقیم کلکتہ کی غزل ہے۔ یہ امور اس پر دلالت کرتے ہیں کہ غزل زیر بحث کے مصنف کا بھی کلکتہ سے سروکار رہا ہوگا۔ سراپا سخن ص ۱۳۸ میں بھی اس غزل کا مطلع غلام علی خاں آزاد کے نام سے ہے لیکن صاحب خم خانۂ جاوید (جلد ۱ ص ۷۲) نے مقطع میں تصرف کر کے قاسم کو قایم بنادیا ہے اور پوری غزل میر غلام علی آزاد بلگرامی کی طرف منسوب کی ہے۔ انھوں نے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ آزاد بلگرامی اردو میں قایم چاند

Marfat.com

پوری کے شاگرد تھے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ اردو میں شعر کہتے تھے یا نہیں، ان کے تلمیذِ قائم ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ گلدستۂ نشاط صاحبِ خمخانۂ جاوید کے ماخذوں میں ہے (دیباچہ جلد ۱) اور نظر بظاہر یہ غزل انھوں نے اسی کتاب سے لی ہے۔ بلگرامی، آزاد کے نام کے پہلے میر یا سید لکھا جاتا ہے اور اس کے بعد خاں نہیں آتا چنانچہ گلدستہ میں جوان کے فارسی اشعار میں ان کے ساتھ ان کا نام اسی طرح مرقوم ہے۔ دتاسی اور نساخ بھی سریرام کی طرح اس غزل کو آزاد بلگرامی کی ملک قرار دیتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کا مصنف کوئی اور شاعر ہے جس کا ذکر تذکروں میں نہیں ملتا۔ واضح رہے کہ گلدستۂ نشاط بطور بیاض ہے۔ اس میں شعرا کے تراجم نہیں"۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حسین غزل کے تمام اشعار ذیل میں پیش کر دیے جائیں:

کیا دھواں دھار اس مسی سے اس کی ہے تحریر لب / دل جلوں کا ہے یہ دودِ آہ دامن گیر لب
جس کی ٹھوکر سے مسیحائی ہو اس کے لب کو میں / گر لب عیسیٰ سے دوں تشبیہ ہے تقصیر لب
دانۂ خال لب اس نے دام میں باتوں کے آہ / دل دکھا کر مرغ دل میرا کیا تسخیر لب
تیری تحریر مسی نے قتل اک عالم کیا / ہے بجا اس کو میاں کہیے اگر شمشیر لب
باد کی تحریر سے ہلتے جو دیکھا برگ گل / پھر گئی اس مت بنے کی آنکھوں میں تصویر لب
کیا مسی پر رنگ پاں ہے زلف مشکیں کی قسم / یہ کسی سودائی کا ہے خون گریباں گیر لب
اس بت پُر فن کی میٹھی باتوں کے افسوں سے ہیں / وحش و طیر و انس و جن مور و ملخ تسخیر لب
خضر و عیسیٰ نے سنی تاثیر لب جب سے تری / مرگ کے مشتاق ہیں تا دیکھیں وہ تاثیر لب
اس کی باتوں سے کلیجا چھن کے چھلنی ہو گیا / آہ یہ باتیں نہیں ہیں بل کہ ہیں تیسیر لب

لب ہلانا روبہ رو قاسم کے ہے ترک ادب
عذر کر آزاد تا ہو عفو یہ تقصیر لب

Marfat.com

کتابیات

کتب

احوالِ غالب	مرتبہ مختار الدین احمد	علی گڑھ انجمن ترقی اردو	۱۹۵۳ء
اشتر و سوزن	از قاضی عبدالودود	پٹنہ، ادارہ تحقیقات اردو	۱۹۶۳ء
بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا	از اختر اورینوی	پٹنہ	۱۹۵۷ء
بین الاقوامی غالب سمینار	مرتبہ یوسف حسین خاں	نئی دہلی	۱۹۶۹ء
پنجاب میں اردو	از محمود شیرانی	لکھنؤ، مکتبہ کلیان	۱۹۶۰ء
تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔ حصہ ۵	از احمد اللہ ندوی	کراچی	۱۹۶۹ء
حیاتِ جاوید	از الطاف حسین حالی	نئی دہلی، ترقی اردو بورڈ	۱۹۷۹ء
عیارِ غالب	مرتبہ مالک رام	دلی، علمی مجلس	۱۹۶۹ء
عیارستان	از قاضی عبدالودود	پٹنہ، ادارۂ تحقیقات اردو	۱۹۵۷ء
غالب پر چند مقالے	از نذیر احمد	نئی دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ	۱۹۹۱ء
قاضی عبدالودود تحقیقی و تنقیدی جائزے	مرتبہ نذیر احمد	نئی دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ	۱۹۹۱ء
مقالات شیرانی۔ حصہ ۱	محمود شیرانی	لاہور، مجلس ترقی ادب	۱۹۷۰ء
مولوی عبدالحق: ادبی اور لسانی خدمات	مرتبہ خلیق انجم	نئی دہلی، انجمن ترقی اردو	۱۹۹۹۱ء
نقدِ غالب	مرتبہ مختار الدین احمد	علی گڑھ، انجمن ترقی اردو	
نذر عرشی	مرتبہ مالک رام	نئی دہلی، مجلس نذر عرشی	۱۹۶۵ء
یادگارِ غالب	از الطاف حسین حالی	لکھنؤ، اردو اکادمی	۱۹۸۶ء

Marfat.com

رسائل

آج کل	نئی دہلی	اکتوبر	۱۹۸۵ء
آج کل	نئی دہلی (اردو تحقیق نمبر)		
اردو ادب	علی گڑھ	جولائی	۱۹۵۲ء
اورنگ	پٹنہ	جلد ۴	شمارہ ۱۵_۱۶
جرنل خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ		شمارہ ۱، ۲، ۳	۱۹۷۷ء
"	"	شمارہ ۲۴، ۲۵	۱۹۸۳ء
غالب نامہ	نئی دہلی (قاضی عبدالودود نمبر)		۱۹۸۷ء
مجلہ علوم اسلامیہ	علی گڑھ	دسمبر	۱۹۶۰ء
معارف	اعظم گڑھ	نومبر	۱۹۶۹ء
معاصر	پٹنہ	(قاضی عبدالودود نمبر)	۱۹۷۶ء
معاصر	پٹنہ (مکمل فائل)		
معیار	پٹنہ (مکمل فائل)		
معیار و تحقیق	پٹنہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ شمارہ ۱		۱۹۸۹ء
نقوش	لاہور	(سالنامہ)	۱۹۵۷ء
نیادور	لکھنؤ	مارچ	۱۹۶۲ء
ہماری زبان	علی گڑھ	یکم ستمبر	۱۹۶۵ء

Marfat.com

Marfat.com

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کی مطبوعات ایک نظر میں

ادب و تنقید	
تاریخِ ادبِ اُردو (آغاز سے اٹھارہویں صدی تک) (تین جلدوں پر مشتمل)	جمیل جالبی
مثنوی کدم راؤ، پدم راؤ	جمیل جالبی
ارسطو سے ایلیٹ تک	جمیل جالبی
نئی تنقید	جمیل جالبی
ادب، کلچر اور مسائل	جمیل جالبی
محمد تقی میر	جمیل جالبی
ایلیٹ کے مضامین	جمیل جالبی
معاصرِ ادب	جمیل جالبی
ادبی تحقیق	جمیل جالبی
میرا جی ایک مطالعہ	جمیل جالبی
تنقید و تجربہ	جمیل جالبی
قومی ڈکشنری (انگلش-اُردو)	جمیل جالبی
بوطیقا (تصنیف ارسطو) ترجمہ	جمیل جالبی
ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ	گوہر نوشاہی
شاہ عالم ثانی آفتاب احوال و ادبی خدمات	ڈاکٹر خاور جمیل
گوپی چند نارنگ- حیات و خدمات	ڈاکٹر سیدہ حامد علی
اُسلوبیاتِ میر	گوپی چند نارنگ
اقبال کا فن	گوپی چند نارنگ
ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات	گوپی چند نارنگ
انیس شناسی	گوپی چند نارنگ
سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ	گوپی چند نارنگ
ادبی تنقید اور اسلوبیات	گوپی چند نارنگ
امیر خسرو کا ہندوی کلام	گوپی چند نارنگ

اُردو کی ظریفانہ شاعری اور اسکے نمائندے	فرمان فتحپوری
اُردو نثر کا فنی ارتقاء	فرمان فتحپوری
اُردو شاعری کا فنی ارتقاء	فرمان فتحپوری
اقبال سب کے لئے	فرمان فتحپوری
تاریخِ ادبیاتِ عالم (چار جلدیں)	وہاب [redacted]رفی
قطب مشتری اور اسکا تنقیدی جائزہ	وہاب اشرفی
معنی کی تلاش	وہاب اشرفی
آگہی کا منظر نامہ	وہاب اشرفی
راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری	وہاب اشرفی
کاشف الحقائق	وہاب اشرفی
شاد عظیم آبادی اور اُن کی نثر نگاری	وہاب اشرفی
حرف حرف آشنا	وہاب اشرفی
اُردو فکشن اور تیسری آنکھ	وہاب اشرفی
تفہیم البلاغت	وہاب اشرفی
ہندوستانی محاورے	محمد حسن
ہندوستانی شاعری	محمد حسن
ہندی ادب کی تاریخ	محمد حسن
ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر	قمر رئیس
تعبیر و تحلیل	قمر رئیس
اصولِ تحقیق و ترتیبِ متن	تنویر احمد علوی
ابتدائی کلامِ اقبال	گیان چند جین
کھوج	گیان چند جین
پرکھ اور پہچان	گیان چند جین
قاضی عبدالودود بحیثیت مرتبِ متن	گیان چند جین
اوپندر ناتھ اشک	گیان چند جین

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,VAKIL STREET,KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-6

PH:-3216162,3214465,3211540, FAX: 011-3265278

ISBN-81-87667-06-0

Marfat.com